ماہنامہ
کرن
جولائی 2013
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ
رمضان المبارک کی

انٹرویو

ناول

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جولائی 2013

جلد 36 شمارہ 4

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

جولائی کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
رمضان المبارک کے مبارک مہینے کی آمد آمد ہے۔ یہ مہینہ خواہشات کی قربانی، اطاعت و عبادت کا مہینہ ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ لوگوں سے غم خواری کا مہینہ ہے۔
اس ماہِ مبارک میں اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم، لطف و عنایات کی بارش ہوتی ہے۔ اس مبارک مہینے میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی مبارک مہینے میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ اور اس مہینے کا انعام عید الفطر ہے۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس مبارک مہینے کی ساعتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہماری عبادات کو قبول فرمائے (آمین)
اگست کا شمارہ حسب روایت عید نمبر ہوگا۔ قارئین اور مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ عید نمبر میں شاملِ اشاعت ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- اداکارہ "یمنیٰ زیدی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "میری بھی سنیے" میں صبا قمر کی باتیں،
- "آواز کی دنیا" سے ریڈیو اور ٹی وی اور آرجے "شکیل الدین" سے گفتگو،
- "مقابل ہے آئینہ"، "یمنیٰ" در صالحہ،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول تکمیل کے مراحل میں،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول دلچسپ موڑ پر،
- "میرے ہمنوا کو خبر کرو" فاخرہ گل کا طویل مکمل ناول،
- "طاقتِ پرواز" سحر ساجد کا مکمل ناول،
- "تیرے ساتھ جو گزری" شازیہ جمال نیر کا مکمل ناول،
- "وہ اک پری ہے"، ریحانہ امجد بخاری کا ناولٹ،
- دیا شیرازی، انیلا کرن علی، میمونہ صدف، نسیم سحر اور بشریٰ سیال، ام حسن اور شہناز صدیق کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

رمضان کی ایمان پرور ساعتوں کو عبادت کے کیف و سرور میں گزارنے سے متعلق معلوماتی کرن کتاب "رمضان المبارک کی خیر و برکتیں" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیشِ خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

شام شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

آرزو دیتا ہے دل کو، موت کی، وقتِ دعا
میری ساری خواہشوں کا یہ صلہ دیتا ہے تو

حد سے بڑھ کر سبز ہو جاتا ہے جب رنگِ زمیں
خاک میں اس نقشِ رنگیں کو ملا دیتا ہے تو

تیز کرتا ہے سفر میں موجِ غم کی یورشیں
بجھتے جاتے شعلۂ دل کو ہوا دیتا ہے تو۔

دیر تک رکھتا ہے تو ارض و سما کو منتظر
پھر انہی ویرانیوں میں گل کھلا دیتا ہے تو

ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی
گھپ اندھیرے جنگلوں میں راستہ دیتا ہے تو

اے منیر اس بات کے افلاک پر ہونا ترا
اک حقیقت کو فسانہ سا بنا دیتا ہے تو

منیر نیازی

اے عشقِ نبیؐ میرے دل میں بھی سما جانا
مجھ کو بھی محمدؐ کا دیوانہ بنا دینا

جو رنگ کہ جامیؔ پر رومیؔ پر چڑھایا تھا
اس رنگ کی کچھ رنگت مجھ پر بھی چڑھا جانا

قدرت کی نگاہیں بھی جس چہرے کو تکتی تھیں
اس چہرہ انور کا دیدار کرا جانا

جس خواب میں ہو جائے دیدارِ نبیؐ حاصل
اے عشق کبھی مجھ کو نیند ایسی سلا جانا

دیدارِ محمدؐ کی حسرت تو رہے باقی
جز اس کے ہر اک حسرت اس دل سے مٹا جانا

دنیا سے ریاضؔ ہو جب عقبیٰ کی طرف جانا
داغِ غمِ احمدؐ سے سینے کو سجا جانا

ریاض الدین سہروردی

یمنیٰ زیدی سے مُلاقات

شاہین رشید

آج کل جس رفتار سے ڈرامے بن رہے ہیں اس حساب سے نیا ٹیلنٹ سامنے نہیں آرہا اور جو ٹیلنٹ سامنے آرہا ہے ان میں بھی چند ایک ہی ایسے ہوتے ہیں جو واقعی ٹیلنٹڈ ہوتے ہیں۔ آج کل تین ڈرامے "میری ولاری' الوبرائے فروخت" اور "دل مچلے کی حویلی" ناظرین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور تینوں میں ایک چہرہ بہت نمایاں ہے کیونکہ اس کا مرکزی کردار ہے اور اس نئے چہرے کا نام یمنیٰ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یمنیٰ میں بہت صلاحیت ہے اداکاری کی یہی وجہ ہے کہ ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز انہیں اچھے رول میں بک کر رہے ہیں یمنیٰ نا صرف اچھی پرفارمر ہیں بلکہ بہت باصلاحیت بھی ہیں ان سے کی گئی گفتگو نذر قارئین ہے۔

★ "کیا حال ہیں جی ..... اور ماشاء اللہ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں اور جو تین سیریل آپ کے آن ایئر ہیں ان میں سب سے اچھا رول کس سیریل کا لگ رہا ہے؟"

✳ "میرا تینوں سیریلز میں بہت مختلف رول ہے اور کردار کے حساب سے مجھے "میری ولاری" میں اپنا رول سب سے اچھا لگا۔ لیکن سچ بتاؤں آپ کو کہ جب میں نے اسکرپٹ پڑھا تو مجھے اسٹوری زیادہ پسند نہیں آئی لیکن یہ ڈائریکٹر کا کمال ہے کہ انہوں نے مجھے بڑے اچھے انداز میں سمجھایا کہ کردار اچھا ہے اور جب تم پرفارم کرو گی تو تمہیں خود بھی اچھا لگے گا اور ناظرین بھی پسند کریں گے ۔۔۔ تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے اگر کرنا ہی ہے تو پھر میں اپنے طور پر بھی اس کا ایک کریکٹر بناؤں گی۔ پھر واقعی مجھے کرنے میں بہت مزا آیا میرا ٹائٹل رول ہے اور پھر ہیروئنوں والا ٹچ نہیں ہے اس لیے بھی مجھے "میری ولاری" کا رول بہت اچھا لگا۔ اس طرح "الوبرائے فروخت نہیں" ایک بہت ہی آرٹسٹک سیریل ہے "آمنہ مفتی" کی تحریر ہے اور مشکل تحریر ہے اور پھر اس میں تمام ہی سینئر آرٹسٹ ہیں وہ آرٹسٹ جنہیں ہم اسکرین پہ دیکھا کرتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے تو ان کے ساتھ کام کرنا میری خوش قسمتی تھی۔ یہ رول میرے لیے بڑا چیلنجنگ تھا اور سب نے نہ صرف مجھے سپورٹ کیا بلکہ سب نے شاباشیاں بھی بہت دی ہیں اور آپ سب پڑھنے والوں سے میری درخواست ہے کہ اسے آپ ضرور دیکھیں کیونکہ اس میں میرے کردار کے بہت سے شیڈز ہیں اور لوگوں کو بہت مزا آئے گا اس سیریل اور میرے کردار کو دیکھ کر۔"

★ "عام لائف میں کیسی ہیں ڈراموں کے کسی کردار کی طرح یا اپنی ہی ایک لائف ہے؟"

✳ "عام لائف میں ڈراموں سے بہت مختلف ہوں بہت پر اعتماد' بہت جولی ہوں اور سب کو بہت ہنساتی ہوں۔ خاص طور پر گھر والوں کو اور میری وجہ سے ہی گھر میں ہر وقت رونق لگی رہتی ہے۔ میری دو بڑی بہنیں اور ایک بھائی ہے جو کہ مجھ سے چھوٹا ہے بھائی سے بہت دوستی ہے اور نارمل لائف میں ایک میچور انسان ہوں۔ گھر کی محفل ہو یا دوستوں کی محفل میرے بغیر نامکمل ہوتی ہیں لیکن یہ بھی آپ کو بتادوں کہ بہت میچور ہوں اور پروفیشنلی سنجیدہ بھی ہوں۔"

★ "انڈر پروڈکشن کیا کیا پروجیکٹ ہیں؟"

✳ "انڈر پروڈکشن دو ہیں اور کہانی ڈسکلوز نہیں کروں گی کیونکہ چارم ختم ہو جائے گا ایک پروجیکٹ "مومنہ" ۔۔۔ کے ساتھ ہے فاروق رند کی ڈائریکشن ہے اور دو بہنوں کی کہانی ہے اور بہت اچھی کہانی ہے۔"

★ "دو بہنوں کی کہانیاں اب کچھ زیادہ نہیں آنے لگیں؟"

✳ "واقعی! قسم سے بہت زیادہ ہو گئی ہیں' بلکہ اب تو یہ ہی کہانی چل رہی ہے۔ اور میں تو بڑے عاجزانہ

طریقے سے سب کو کہوں گی لکھنے والوں کو اور بنانے والوں کو سوچنا چاہیے کہ بہنوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جو چل جاتا ہے' ہٹ ہو جاتا ہے سب اسی پہ شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک نگیٹو کردار ایک پوزیٹو اور کچی بات ہے کہ سب بور بھی ہو جاتے ہیں اور ناظرین کی توجہ بھی ایسی سیریلز کو نہیں ملتی۔ شکر ہے کہ مجھے ابھی تک جتنے بھی سیریلز ملے ہیں سب ہی مختلف ہیں "دل محلے کی حویلی" میں بھی میرا کردار بہت مختلف ہے۔"

★ "اور ایک سیریل "خوشی ایک روگ" بھی آپ کا بہت پسند کیا گیا تھا؟"

* "جی جی.... بہت ہی اچھا ڈراما تھا اسے محسن مرزا نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ اور یہ وہ واحد ڈراما ہے جو میری پہچان بنا' میں کہیں بھی چلی جاؤں لوگ مجھے میرے کردار "خوشی" سے ہی پہچانتے ہیں اور جو انکل ٹائپ کے لوگ ہیں وہ تو خاص طور پر آکر مجھے پیار کرتے ہیں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہارا چہرہ نہیں بھول سکتے۔ اس میں مشہود علوی میرے والد بنے تھے اور میں ان کی لے پالک بیٹی بنی تھی.... سچ میں مجھے مشہود بھائی کے ساتھ کام کر کے بہت اچھا لگا۔"

★ "پہلا سیریل کون سا تھا آپ کا؟"

* "میرا پہلا سیریل تھکن تھا۔ صبا قمر کی بہن بنی تھی اور میرا اس میں نگیٹو رول تھا اور اس رول میں مجھے پذیرائی بھی بہت ملی تو مجھے ایسا لگا کہ اب مجھے اس قسم کے رول ملنا شروع ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور مجھے ہر دفعہ مختلف رول ہی ملے۔ "تھکن" کے ڈائریکٹر امین اقبال تھے آج سے کوئی پانچ سال پہلے میں نے ان کے ساتھ ایک سیریل کیا تھا جس میں میرا کافی چھوٹا سا رول تھا اور اس کے ایک سین میں اداکاری کا مارجن ذرا زیادہ تھا۔ اس کے بعد میں سب کچھ بھول بھال کر اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ میرا انیچلر شروع ہو گیا پھر پانچ سال کے بعد بھی "امین اقبال" نے ہی مجھے اپروچ کیا وہ اس وقت اے اینڈ بی کے ساتھ کام کر رہے تھے اور "تھکن" کے لیے انہوں نے مجھے کال کی تو میں اقبال صاحب کی بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں ڈرامے میں پرفارم کر سکتی ہوں۔"

★ "اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی اور اداکاری کا سلسلہ آگے کیسے بڑھا؟"

* "میری آمد اس طرح ہوئی کہ میری بڑی بہن "این سی اے" میں پڑھتی تھیں (نیشنل کالج آف آرٹ) اور اس کالج میں میڈیا کے اکثر لوگ وزٹ کے لیے آتے رہتے ہیں تو بڑی بہن کے کسی کولیگ نے بتایا کہ لاہور میں ایک ڈراما بن رہا ہے۔ جو اے ٹی وی سے پانچ چھ سال پہلے آن ایئر ہوا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر کو نئے چہرے کی ضرورت ہے تو چونکہ میں اس میں تھوڑا سا کام کر چکی تھی تو اس لیے انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہ سیریل تھکن تھا۔ "تھکن" میں میرا کام دیکھ کر کراچی سے مجھے محسن مرزا نے کال کی اور مجھے ٹائٹل رول دیا "خوشی ایک روگ" میں جو کہ بہت ہٹ گیا۔"

★ "لوگوں کی ہمدردیاں بہت ملی ہوں گی اس سیریل میں تو؟"

* "ارے بہت زیادہ.... لوگوں کو بہت پیار بھی آتا تھا ہمدردی اور ترس بھی آتا تھا۔ پھر ایک اور سیریل "تیری راہ میں رل گئی" کیا' یہ بھی احسن اقبال کا ہی ڈائریکٹ کیا ہوا تھا اس کا ٹائٹل سونگ بہت ہٹ گیا تھا اور میں چونکہ پڑھائی بھی کرتی ہوں تو میں نے کبھی مستقل بنیادوں پر کام نہیں کیا بس جب ٹائم ملا اور جب اچھی آفر آئی تو کر لیتی ہوں۔"

★ "پڑھائی کے ساتھ ساتھ کام بھی جاری رہا تو گھر والوں نے کہا کہ بیٹا جی پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لو پھر شوق پورا کر لینا؟"

* "گھر والوں نے تعاون کیا کیونکہ ڈراموں میں آنے کے بعد میں زیادہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگی اور پڑھائی میں بھی زیادہ اچھی ہو گئی میری پوزیشن بھی آنا شروع ہو گئی۔ ٹیچرز بھی بہت خوش رہنے لگے گھر میں میری امی نے مجھے بہت سپورٹ کیا اور میرے والد جو کہ غصے کے بہت تیز ہیں انہوں نے بھی زیادہ غصہ نہیں کیا اور یہ میرے لیے بڑی بات تھی۔ اس طرح میری چچی مجھے بہت سپورٹ کرتی ہیں۔ میری دادی اللہ بخشے ان کو وہ بہت خوش ہوتی تھیں لیکن میری نانی کے بارے میں بتاؤں کہ جب میرا پہلا سیریل آن ایئر ہوا تو انہوں نے امی کو اتنا ڈانٹا کہ کیا بتاؤں انہیں بہت سمجھایا کہ اب ماحول بدل گیا ہے اب سب پڑھے لکھے لوگ ہیں اس فیلڈ میں تو وہ سمجھ گئیں بات کو اور اب میں کراچی سیریل کرنے آتی ہوں تو نانی کے پاس ہی رہتی ہوں اور اب وہ سب سے زیادہ خوش ہوتی ہیں میرے کام سے۔"

★ "کیا پڑھ رہی ہیں اور کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

* "جی میرا نام یمنی زیدی ہے اور پیار کے بہت سے نام ہیں۔ میں تین جولائی 1989ء میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرے والد زمیندار ہیں اور والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ ہماری تربیت میں امی کا بہت ہاتھ ہے کیونکہ والد گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے ہیں میرا تعلق بھی گاؤں سے ہے ہمارا گھر' زمینیں گاؤں "عارف والا" میں ہیں پڑھائی کے لیے ہم لاہور شفٹ ہوئے اور بہترین پڑھائی چل رہی ہے ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہے میرا نمبر تیسرا ہے میری بڑی بہن کو بھی کافی آفرز آئی تھیں اداکاری اور کمرشلز کے لیے مگر انہیں اجازت ہی نہیں ملی۔ جبکہ دونوں بہنیں بڑی ہیں وہ بہت ہی زیادہ پیاری ہیں مگر شاید اداکاری کا ٹیلنٹ اللہ نے مجھ میں ڈال دیا ہے اور ویسے بھی چونکہ میں چھوٹی ہوں اور چھوٹوں کو اہمیت بھی زیادہ دی جاتی ہے تو بس میں لکی ہوں کہ مجھے اجازت مل گئی اور ہم اردو اسپیکنگ ہیں چونکہ شروع سے ہی پنجاب میں رہے تو ہماری اردو اس طرح کی نہیں ہے جس طرح خالص

اردو بولنے والوں کی ہوتی ہے اور جہاں تک میری تعلیم کی بات ہے تو میں ماسٹرز کر رہی ہوں کالج آف ہوم اکنامکس انٹیریئر ڈیزائننگ میں اور شادی کے لیے ان شاء اللہ اگلے سال تک کا پلان ہے باقی جو اللہ کو منظور ہوا۔"

★ "شوبز کو کیسا پایا؟"

✳ "مجھے تو بہت اچھا لگا اور فی الحال تو مجھے اس میں کوئی برائی بھی نظر نہیں آئی اور مجھے ابھی ایک ہی سال ہوا ہے اور میں نے کافی پروجیکٹس کر لیے ہیں اور

اگر آپ کسی کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے ہو تو ہر کوئی آپ کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتا ہے۔ اگر آپ چھوٹے ہیں تو چھوٹے ہی بن کے رہیں اور سینئرز کو عزت دیں کیونکہ یہ ان کا حق ہے میرا بہت اچھا ٹائم گزرتا ہے سیٹ پہ بھی اور جن لوگوں سے میرے تعلقات ہیں ان کے ساتھ بھی۔"

★ "گھر میں چھوٹی ہیں اس کا کبھی نقصان ہوا آپ کو؟"

✳ "نہیں ایسا کچھ خاص تو نہیں اور ویسے بھی ہم سب فیملی اورینٹڈ ہیں اور ہم اپنے معاملات ایک دوسرے سے ہی شیئر کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے اور نقصان آپ اس طرح کا کہہ سکتی ہیں کہ میں کافی شرارتی قسم کی لڑکی ہوں تو بس اکثر میرے خلاف شکایتیں لگا دی جاتی ہیں کہ چونکہ فلاں چیز نہیں مل رہی تو یقیناً" یمنیٰ کی ہی شرارت ہوگی تب میں تھوڑا ناراض ہوتی ہوں کہ بھئی چھوٹے ہونے کا یہی نقصان ہے کہ ہر چیز کا الزام تم لوگ مجھ پر ہی لگا دیتے ہو۔"

★ "صبح کالج کے لیے نکلتی ہیں اور پھر شوٹ کے لیے اپنے اردگرد کا جائزہ تو لیتی ہی ہوں گی کیا کچھ محسوس کرتی ہیں؟"

✳ "جی بالکل لیتی ہوں جائزہ.... اور ایک بات تو بہت زیادہ نوٹ کرتی ہوں کہ ہمارے ملک میں بجلی کا بہت زیادہ بحران ہے لیکن آپ نے خود بھی اگر غور کیا ہو تو صبح کے وقت اسٹریٹ لائٹس جل رہی ہوتی ہیں اور اکثر اوقات تو جب میں واپس آ رہی ہوتی ہوں دوپہر کے وقت تب بھی جل رہی ہوتی ہیں جبکہ صبح فجر کے وقت روشنی ہو جاتی ہے اس کے بعد ہمیں روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی تو پھر کیوں نہیں صبح کے وقت لائٹیں بند کر دی جاتیں۔"

★ "اپنے کام میں ہنکچوئل ہیں؟"

✳ "جی بہت زیادہ اپنے کام کے معاملے میں بھی اور وقت کے معاملے میں بھی اور کوئی دیر کر دے یا مجھے کسی کا انتظار کرنا پڑے تو پھر مجھے بہت غصہ آتا ہے کہ بھئی جب میں وقت کی پابندی کرتی ہوں تو دوسرے کیوں نہیں کرتے.... اور سچ بات بتاؤں کہ جب مجھے غصہ آتا ہے اور میں لفظوں میں اظہار نہ کر سکوں تو پھر مجھے رونا آ جاتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میری یہ بات اچھی ہے کیونکہ بولنے میں بدتمیزی کا عنصر بھی آ جاتا ہے اور انسان بہت سے الفاظ غلط بھی بول جاتا ہے۔"

★ "آپ کے نام کا مطلب Lucky اور Bless ہے۔ کچھ اثر ہے آپ کی شخصیت پر؟"

✳ "جی بہت اثر ہے اس کا میری شخصیت پر گزشتہ دنوں ایک لکی ڈرا میں میرا انعام بھی نکلا تو اپنے آپ کو بہت لکی سمجھتی ہوں کہ اگر میں کسی چیز کی خواہش کروں تو اتفاقاً" وہ مجھے کچھ دن بعد مل جاتی ہے اور بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی گہرا کنکشن ہے میرا۔ اب دیکھیں کہ دل کے کسی کونے میں خواہش تھی کہ میں اس فیلڈ میں آؤں اللہ نے اس خواہش کو بھی پورا کیا شہرت بھی دی اور ماشاء اللہ پیسہ بھی دیا۔"

★ "کام پہ تعریف تو ہوتی ہی ہوگی دل خوش بھی ہوتا ہوگا تنقید پہ کیا کیفیت ہوتی ہے؟"

✳ "جی تعریف تو ماشاء اللہ بہت ہوتی ہے اور واقعی دل بہت خوش ہوتا ہے اور تنقید کا برا نہیں مناتی بلکہ بہت سوچتی ہوں کہ کہاں غلطی کی کیوں کی اور اس کو کیسے سدھارا جا سکتا ہے۔ جب میرے سینئرز تعریف کرتے ہیں تو تسلی ہوتی ہے کہ کچھ نہ کچھ اچھا کیا ہوگا۔"

★ "اداکاری مشکل لگتی ہے؟"

✳ "اداکاری میں بہت محنت ہے لیکن چونکہ میں اپنی خوشی اور شوق کی وجہ سے کام کرتی ہوں تو مجھے مشکل نہیں لگتی.... میں اللہ تعالیٰ کی بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایک ایسا پروفیشن دے دیا کہ جس کا مجھے

شوق تھا اور جب مجھے اپنی محنت کا معاوضہ ملتا ہے تو پھر تو بہت ہی اچھا لگتا ہے اور یہ ایسی فیلڈ ہے جس میں بہتری کی بہت گنجائش ہے۔"

★ "ڈرامے کے کرداروں کو اپنے اوپر طاری کرتی ہیں یا جب سیٹ پر گئیں موڈ بنالیا؟"

✳ "میں تو ہر ڈرامے کے کردار کو بہت گہرائی سے لیتی ہوں اور اپنے اوپر طاری کر کے پرفارم کرتی ہوں اور میرے گھر والے منع کرتے ہیں کہ تم اتنے intense کردار مت کیا کرو کیونکہ میرا موڈ اس کے حساب سے بہت زیادہ change ہو جاتا ہے اور میں تو اسکرپٹ پڑھتے پڑھتے اسی میں گم ہو جاتی ہوں اور اگر آپ کردار کو دل سے کریں تو وہ آپ کی لائف کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔"

★ "گھر داری سے لگاؤ ہے یا ساری توجہ اداکاری کی طرف ہی ہے؟"

✳ "ایسا نہ کہیں ..... میں تو اداکاری کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کر رہی ہوں اور گھر داری سے بھی مجھے بہت لگاؤ ہے۔ کوکنگ کا بہت شوق ہے کیونکہ ہوم اکنامکس کالج میں پڑھتی ہوں "آلو گوبھی" اور "آلو بیگن" مجھے اچھا لگتا ہے اور پکانا بھی آتا ہے اور بریانی بھی اچھی پکا لیتی ہوں۔ لیکن سبزی کا اپنا الگ ہی مزا ہوتا ہے اگرچہ مجھے میٹھا کھانے کا اتنا شوق نہیں ہے لیکن پھر بھی میٹھا اچھا بنا لیتی ہوں۔"

★ "سین کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اس کو اپنے اوپر طاری کر لیتی ہیں تو جیسے رونا' مرنا' مار کھانا حقیقی ہوتے ہیں یا کیمرہ ٹرک ہوتے ہیں؟"

✳ "نہیں نہیں ..... میں تو سب کچھ حقیقی کرواتی ہوں۔ جیسے "تھکن" میں میں نے سچ مچ مار کھائی وہ میرا پہلا ڈراما تھا اور سب کہتے تھے کہ یمنی تمہیں چوٹ تو نہیں آئی تو میں کہتی تھی کہ آپ مجھے ماریں تاکہ میرا اچھا ری ایکشن آئے اور مرنے کا سین تو ابھی تک نہیں کیا رونے کے سین حقیقت میں کیے ہیں۔"

★ "کبھی احساس ہوتا ہے کہ اب آپ سیلیبرٹی ہو گئی ہیں۔ ایک خاص لائف گزار رہی ہیں؟"

✳ "نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ایسا احساس کبھی نہیں ہوا۔ اچھا ضرور لگتا ہے کہ لوگ ہمیں دیکھتے ہیں پسند کرتے ہیں۔ ہم سے ملنے کی خواہش کرتے ہیں ورنہ تو میں ایک عام انسان ہوں۔ لوگ جب مجھ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کتنی سادہ مزاج ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ آپ ایک آرٹسٹ ہیں۔ تو میں کہتی ہوں کہ جو عروج اور جو عزت اللہ دے اس پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے نہ کہ غرور۔ کیونکہ وقت اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب آپ کی لائف میں چینج آجائے۔"

★ "ہوں..... گڈ..... اور کیا مشاغل ہیں؟"

✳ "ہاں ..... مجھے یہ بتانا تو یاد ہی نہیں رہا کہ میں شاعری بھی کرتی ہوں۔ ڈرائینگ وغیرہ بھی کرتی ہوں لکھنے کا بھی شوق ہے اور شاعری میرے اپنے لیے ہوتی ہے۔ بہت کم لوگوں سے شیئر کرتی ہوں۔ بس جب آمد ہوتی ہے تو ڈائری میں لکھ لیتی ہوں میری امی بھی نظمیں اور ناولز وغیرہ لکھتی ہیں ان کا نام شبانہ ناہید زیدی ہے اور انہی سے یہ خصوصیت مجھ میں منتقل ہوئی ہے۔"

★ "زندگی میں چینج کب آیا؟"

✳ "جب اس فیلڈ میں آئی تو میری لائف کافی چینج ہوئی۔ میچورٹی بھی آئی حالانکہ مجھے اپنا بچپنا زیادہ اچھا لگتا تھا اور ابھی بھی میں نے اس کو خدا حافظ نہیں کہا ہے۔ مگر عمر کے حساب سے میچورٹی آئی ہے اور جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں وہ لوگ جو نارمل رویہ رکھتے تھے اب ان کے رویے زیادہ اچھے ہو گئے ہیں۔"

★ "ایسا تو ہوتا ہے..... پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

✳ "میں بہت محب وطن ہوں۔ پاکستان کے حالات کے لیے فکر مند رہتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ حالات جلدی اچھے ہو جائیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یمنی زیدی سے اجازت چاہی۔

✡ ✡

میری بھی سنیے

صبا قمر

شاہین رشید

1 میرا نام؟

☆ صبا قمر۔

2 نک نیم؟

☆ بینا۔

3 میری تاریخ پیدائش/ جائے پیدائش؟

☆ 15 اپریل 1984ء/ حیدر آباد۔

4 تعلیمی ڈگریاں؟

☆ ایک ہی ہے جی "بی سی ایس" کی۔

5 بہن بھائی' میرا نمبر؟

☆ دو بہنیں' چار بھائی اور میں پانچویں نمبر پر ہوں۔

6 ٹی وی پہ متعارف کرایا؟

☆ روحی خان نے اور میں ان کی شکر گزار ہوں ورنہ شاید آج آپ کو انٹرویو نہ دے رہی ہوتی۔

7 پہلا ڈراما/ وجہ شہرت؟

☆ "میں اور تو" اور "ہم سب امید سے ہیں"۔ میرے کمرشلز اور کافی سارے ڈرامے' شہرت کا کریڈٹ کسی ایک کو نہیں۔

8 جب پہلی کمائی ہاتھ میں آئی؟

☆ بس مت پوچھیں کیا کیفیت تھی۔ 10 ہزار ملے تھے اور یہ میرے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ اب تو اللہ کا

بڑا کرم ہے مجھ پر۔
9 میرے ڈراموں کی تعداد؟
☆ اب تو ڈھیروں ڈھیر ہو گئی ہے ماشاءاللہ۔
10 مجھے شکایت ہے؟
☆ ڈائریکٹرز پروڈیوسرز سے کہ وہ مجھے ہمیشہ رونے دھونے والے کردار دے دیتے ہیں جبکہ میں ہر طرح کے کردار کرکے ورسٹائل فنکارہ بننا چاہتی ہوں۔
11 محبت کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے؟
☆ محبت ہو جاتی ہے اور جو کی جاتی ہے وہ محبت نہیں ہوتی۔
12 آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں؟
☆ اللہ نے کتنا حسین بنایا ہے مجھے، پتا نہیں بڑھاپے میں بھی اتنی حسین لگوں گی کہ نہیں پھر اپنی شکل بگاڑ بگاڑ کر دیکھتی ہوں کہ بڑھاپے میں اگر ایسی ہو گئی تو کیسے لگوں گی اور یوں ہو گئی تو کیسی لگوں گی۔
13 مجھے جن کی مسکراہٹ متاثر کرتی ہے؟
☆ وہ ہیں مادھوری ڈکشٹ اور مدھو بالا..... سچ بہت حسین مسکراہٹ ہے ان دونوں کی۔
14 انڈین گلوکار جن کی آواز دل میں اترتی ہے؟
☆ کشور کمار..... دیوانی ہوں ان کی آواز کی جب فارغ ہوتی ہوں انہی کے گانے سنتی ہوں۔
15 ایک شخص جس نے میری زندگی بدلی؟
☆ ہے ایک شخص اس نے میرے ساتھ اتنا برا سلوک کیا کہ میں اپنی زندگی کو اچھا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس لیے اب میں اسے برا نہیں کہتی۔
16 کھانا کہاں کھانے میں مزا آتا ہے؟
☆ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر اکیلے میں۔
17 پین ہاتھ میں آجائے تو بے ساختہ کیا لکھتی ہوں؟
☆ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
18 موڈ خراب ہو تو؟
☆ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی ہوں یا پھر لونگ ڈرائیو پر نکل جاتی ہوں۔
19 مجھے تلاش ہے؟
☆ سکون کی..... جو کہ نہیں ملتا..... شاید اپنے اندر ہی سکون نہیں ہے۔
20 برے لگتے ہیں وہ لوگ؟
☆ جو میرے منہ پر میری تعریف کرتے ہیں اور میری غیر موجودگی میں میری برائیاں کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں مجھے معلوم نہیں ہو گا مگر ایسا نہیں ہے۔
21 صبح اٹھ کر پہلا کام؟
☆ رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے زندگی کا ایک دن اور عطا کر دیا ہے۔
22 ایک نصیحت جو سب کو کرنا چاہتی ہوں؟
☆ کبھی ناشکری نہ کیا کریں۔ شکر میں بہت برکت ہے۔
23 اور جو نصیحت مجھے بری لگتی ہے؟
☆ ایسی جس میں میرا کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ نقصان ہو رہا ہو۔
24 چوبیس گھنٹوں میں میرا پسندیدہ وقت؟
☆ رات کا..... تنہائی اچھی لگتی ہے۔
25 مجھے غصہ آتا ہے اس سوال پر کہ؟
☆ آپ شوبز میں کام کیوں کرتی ہیں۔ بھئی میری مرضی..... اللہ نے ٹیلنٹ دیا ہے تو کیوں نہ کام میں لاؤں..... جن کو میں بری لگتی ہوں وہ نہ دیکھا کریں۔
26 کس قسم کا میوزک پسند ہے مجھے؟
☆ رومانٹک قسم کا۔
27 پسندیدہ ناشتا؟
☆ جوس کا ایک گلاس دو فرائی انڈے اور دو سلائس ناشتا اچھا ہو تو دن بھی اچھا گزرتا ہے۔
28 پسندیدہ کھانا؟
☆ چائنیز..... چائنیز کو دیکھ کر بھوک جاگ اٹھتی ہے۔
29 شوبز میں کیا بات بری لگتی ہے؟
☆ لوگ ایک دوسرے کی کاٹ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں سب کو اپنی قسمت کا ہی ملتا ہے۔
30 مجھے ایسا لائف پارٹنر چاہیے جو؟

☆ جو میری عزت کرے، مجھے خوش رکھ سکے، میری ضروریات زندگی کو پورا کر سکے اور مجھ سے سچی محبت کرے۔
31 میری کامیابی کی بنیادی وجہ؟
☆ کبھی نخرہ نہیں دکھایا۔ ہمیشہ وقت کی پابندی کی، وقت ضائع نہیں کرتی میں بچپن سے پنکچوئل ہوں۔ وقت ضائع کرنے والے مجھے بہت برے لگتے ہیں۔
32 میں تبدیل ہوئی؟
☆ شوبز میں آنے کے بعد پہلے میں غصے کی بہت تیز ہوتی تھی۔ ہر بات منہ پر بول دیتی تھی۔ پھر دیکھا کہ یہ تو انسان کی شخصیت کے نگیٹو پوائنٹ ہیں تو اپنے غصے کو تھوڑا کم کیا۔ اب حوصلہ اور صبر و شکر آگیا ہے۔
33 ڈراموں میں اپنا ایک روپ جو بہت پسند ہے؟
☆ دلہن کا روپ (قہقہہ) جب دلہن بنتی ہوں اور

آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے پھر سوچتی ہوں کہ پتا نہیں اصلی زندگی میں دلہن بنوں گی تو کیسی لگوں گی۔
34 شادی ضروری ہے یا گزارا ہو سکتا ہے؟
☆ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ شادی ضروری ہے۔ اپنا گھر، اپنی فیملی، اپنے بچے، سکون، آرام ایک لڑکی کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو۔
35 ایک اچھا کام جو کرنا چاہتی ہوں؟
☆ میں ان یتیم بچوں کے لیے ایک فلاحی ادارہ بنانا چاہتی ہوں جو اپنے والد کی وفات کے بعد مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔
36 حکومت مل جائے تو پہلا کام کیا کریں گی؟
☆ کثرت اولاد سے منع کروں گی اور یہ پابندی لگاؤں گی کہ جب تک آپ کے پاس بچوں کی پرورش کے لیے پیسہ نہ ہو آپ بچہ پیدا مت کریں۔
37 مرنے سے ڈرتی تھی؟
☆ پہلے اب نہیں..... پہلے سوچتی تھی کہ اپنی فیملی کے لیے کچھ کیے بغیر مر گئی تو..... شکر ہے کہ میں نے کچھ نہ کچھ فرض ادا کر لیا ہے۔
38 ماں کے لیے بہترین گفٹ؟
☆ ماں کے تو اتنے احسانات ہوتے ہیں کہ ساری عمر بھی لگے رہیں تو نہیں اتار سکتے۔ میں نے بھی اپنی ماں کو ایک چھوٹا سا گفٹ دیا ہے جو اس کی محبتوں اور خدمت کا نعم البدل تو نہیں لیکن میں نے فرض سمجھ کر

کیا ہے۔ کچھ سال پہلے ماں کے نام پر ایک گھر گفٹ کیا ہے۔

39 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

☆ اپنے معاملے میں بہت کنجوس ہوں پھر بھی گلاسز خریدے قیمتی والے۔

40 اپنی شخصیت میں سب سے اچھی چیز کیا لگتی ہے؟

☆ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایک مکمل انسان

بنایا ہے۔ مگر میری آنکھیں تو بہت ہی خوب صورت بنائی ہیں اور مجھے اپنی آنکھیں بہت پسند ہیں۔

41 اپنے آپ کو فریش کب محسوس کرتی ہوں؟

☆ شام کے وقت اور گھر آکر۔

42 گہری نیند سوتی ہوں یا؟

☆ تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو فوراً "نیند آجاتی ہے اور گہری نیند سو جاتی ہوں ورنہ نیند کو بلانے کے لیے کروٹیں بدلتی ہوں کہ آجاؤ۔۔۔ ویسے ایسا کم ہوتا ہے کیونکہ آج کل کام بہت ہے۔

43 میری کس بات کی تعریف دوسرے بھی کرتے ہیں؟

☆ میری ایمانداری کی' میرے ٹیلنٹ کی میرے ہنکجوئل ہونے کی۔

44 موبائل سروس بند ہو تو؟

☆ تو سکون ملتا ہے اس کے آنے سے سکون نہیں رہا۔

45 شہرت مسئلہ بنتی ہے؟

☆ کبھی کبھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ اللہ نے شہرت نصیب کی۔

46 شہرت کو زوال آگیا تو؟

☆ پھر بھی شکر کروں گی' یقیناً "میرے لیے کوئی بہتری ہوگی۔

47 کوئی گہری نیند سے بیدار کردے تو؟

☆ ہائے۔۔۔ بہت غصہ آتا ہے اٹھانے والے سے طنزاً "پوچھتی ہوں۔ "بیٹا کیا بات ہے کیوں اٹھایا ہے؟"

48 ملک میں تبدیلی آئی ہے؟

☆ بالکل آئی ہے اور آئے گی' مجھے عمران خان بہت پسند ہے۔

49 گفٹ میں کیا چیزیں لینا پسند ہیں مجھے؟

☆ یہ اچھا سوال کیا سب کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ مجھے پرفیوم بہت پسند ہے اور کینڈل (موم بتی) بہت پسند ہیں۔

50 کیا چیزیں میرے بیگ میں ہمیشہ رہتی ہیں؟

☆ پرفیوم' چھوٹا والٹ جس میں پیسے ہوتے ہیں اور بل۔

51 کس شخص کے اقوال بہت پسند ہیں؟

☆ حضرت علیؓ کے اور یاد بھی کافی ہیں۔

52 جس دن چھٹی ہوتی ہے؟

☆ سارے ادھورے کام مکمل کرتی ہوں اور اپنی نیند بھی پوری کرتی ہوں۔

53 دعائیں قبول ہوتی ہیں؟

☆ بالکل ہوتی ہیں اور میری ماں کی دعاؤں سے میری قسمت بدلی اور مجھے کامیابیاں نصیب ہوئیں۔

54 کس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے؟

☆ اپنے والد مرحوم کی۔

55 میرے لیے جان کون قربان کر سکتا ہے؟

☆ میرے خیال سے کوئی بھی نہیں سوائے ماں کے۔

56 کس کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں؟

☆ اپنی ماں کے لیے۔۔۔ میری خواہش ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں ان کے قدموں میں ڈھیر کردوں۔

57 اپنی کس عادت سے چھٹکارا چاہتی ہوں؟

☆ میں دوسروں پر جلدی بھروسہ کرلیتی ہوں اور پھر نقصان اٹھاتی ہوں۔

58 میں شوقین ہوں؟

☆ کھانے پینے کی' کبھی ایسا اتفاق ہو کہ گھر والوں کی کسی بات سے ناراض ہو کر کھانا پینا چھوڑ دیا تو پھر گھر سے باہر جا کر کھالیتی ہوں کیونکہ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔

59 کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟

☆ دماغ خراب ہو جاتا ہے میرا پھر نہیں چھوڑتی' سنا دیتی ہوں ٹھیک ٹھاک۔

60 تنہائی کی بہترین ساتھی؟

☆ مطالعہ مجھے بہت پسند ہے۔ ممتاز مفتی اور رضیہ بٹ کی بہت بڑی فین ہوں۔ عمیرہ احمد بہت پسند ہیں اور انگریزی ناولز پڑھنا بھی اچھا لگتا ہے۔

☆☆

آواز کی دنیا سے

شکیل الدین

شاہین رشید

دنیا چاہے کتنی بھی ترقی کر جائے ریڈیو کی اہمیت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا یہ ہمیشہ سے تنہائی کا ساتھی رہا ہے اور آج بھی ہے۔ دنیا جہاں کی معلومات کا ذخیرہ بھی اسی میں ہے اور روح کی غذا بھی اسی میں ہے۔ دلکش آوازوں سے سجی ریڈیو ایف ایم کی دنیا بھی اب بہت وسیع ہو گئی ہے اب ٹی وی چینلز کی طرح ریڈیو کے بھی کسی ایک چینل پہ انحصار نہیں کرنا پڑتا بلکہ آپ اپنی پسند کا چینل لگا کر انجوائے کر سکتے ہیں۔

ریڈیو پاکستان کے توسط سے اس وقت ایف ایم 101 اور ایف 93 کام کر رہے ہیں۔ ایف ایم 101 کے تو کافی آر جے سے آپ کی ملاقات کروا چکے ہیں آج ایف ایم 93 کے آر جے 'پروڈیوسر وڈائریکٹر اور نیوز رپورٹر اور انٹرویور شکیل الدین سے آپ کی ملاقات کروائیں گے۔

★ "کیا حال ہیں جی۔۔۔ اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

* "جی حال ٹھیک ہیں۔۔۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے اور شادی کے بعد تو زندگی اور بھی حسین ہو گئی ہے۔"

★ "اچھا۔۔۔ تو پہلے نہیں تھی کیا؟"

* "پہلے بھی اچھی تھی لیکن شادی کے بعد آپ کو اپنے ساتھ کسی اور کے ہونے کا بھی احساس ہوتا ہے کہ کوئی آپ کی ذمہ داری ہے۔ کوئی گھر میں آپ کا انتظار کر رہا ہو گا آپ کو کسی کے لیے کچھ کرنا ہے تو یہ ذمہ داری بہت اچھی لگتی ہے مجھے۔"

★ "لڑکے تو اپنی بیچلر لائف کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ جی آزادی ہوتی ہے۔ اپنی مرضی سے سارے کام کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ؟"

* "بے شک اس زندگی کا بھی اپنا ایک مزا ہے۔ لیکن مجھے تو شادی کے بعد والی زندگی بہت اچھی لگی اور میں اپنی اس زندگی کو بہت انجوائے کر رہا ہوں۔"

★ "گڈ۔۔۔ ریڈیو سے وابستگی کیسے ہوئی؟ لیکن اس سے پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے۔"

* "ہم اردو اسپیکنگ ہیں اور میرے والدین کا تعلق دہلی کے ضلع بلند شہر سے ہے وہاں ہمارا ننھیال اور ددھیال تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب سب مائیگریٹ کر کے پاکستان آ گئے تو ہمارے کچھ رشتے دار لاہور شفٹ ہو گئے اور کچھ کراچی میں اور والد لاہور میں اور والدہ کراچی میں شفٹ ہو گئے۔ قسمت نے ان دونوں کو ملایا تو شادی کے بعد والد صاحب بھی کراچی آ گئے والدہ اور والد آپس میں کزن ہیں۔

میں کراچی میں پیدا ہوا 3 ستمبر کو اور اس علاقے میں جہاں سے بڑے بڑے نامور لوگوں کا تعلق رہا یعنی جیکب لائنز کا ایریا بہت مشہور ہے کراچی کے گورنمنٹ اسکول سے پرائمری اور سیکنڈری اسکول کی تعلیم حاصل کی اور پھر اسلامیہ کالج سے مزید تعلیم کا سلسلہ شروع کیا امی ہاؤس وائف رہیں ہمیشہ اور والد ریلوے میں تھے اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا بزنس اخباروں کا بھی تھا۔ اب یہ تمام تر ذمہ داری میرے پاس ہے۔ جاب بھی کرتا ہوں گھر کو بھی سپورٹ کر رہا ہوں والد صاحب کے بزنس کو بھی آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس کے علاوہ "فیض" کے نام سے میرا اپنا کام ہے۔ جس میں ملٹی میڈیا، ساؤنڈ سسٹم اور میڈیا سے منسلک جو کام ہوتے ہیں وہ میں کرتا ہوں اور ہم چار بہن بھائی ہیں بڑی بہن اور ایک چھوٹی بہن میں اور چھوٹا بھائی ہے۔"

★ "ریڈیو کا انتخاب کب کیا اور ریڈیو ہی کیوں؟"

* "ریڈیو پہ آنا محض اتفاقاً" ہی تھا۔ میرے ماموں جو کہ اب میرے سسر بھی ہیں انہوں نے مجھے ریڈیو پہ متعارف کرایا۔۔۔۔ میری جاب ادبی سیکشن میں تھی اور میرا کام آؤٹ ڈور ہونے والے پروگرامز کے پوائنٹ نوٹ کر کے لانا تھا۔ کنٹریکٹ کی بنیاد پر مجھے جاب ملی بولنے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا' مائیک سے دوستی نہیں تھی۔ البتہ سب کو جب مائیک کے سامنے بولتے ہوئے دیکھتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ میں بھی بولوں پھر ہوا یہ کہ وقت بدلا' لوگ بدلے کچھ پرانے لوگ گئے تو نئے لوگوں کو آگے آنے کا چانس ملا اور آؤٹ ڈور رہ کر میں نے بے شمار پروگراموں کی کوریج کی جس سے مجھ میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی پھر جو کام مجھے سونپا گیا وہ نیشنل براڈ کاسٹنگ سروس کا تھا اور نیشنل براڈ کاسٹنگ

سروس کے پروگرام ملک کے تمام بڑے شہروں سے براڈکاسٹ کیے جاتے تھے اور جاتے ہیں۔ تو کراچی کی نیشنل براڈکاسٹ سروس میرے سپرد تھی۔ کراچی میں کوئی بھی ایمرجنسی ہوجاتی تھی یا کوئی بھی واقعہ ہوجاتا تو اس واقعہ سے منسلک لوگوں کو فوری طور پر ٹیلی فون پہ یا موبائل پہ آن ایئر لیا کرتے تھے۔ تو گزشتہ 5 سال سے میں یہ کام کررہا ہوں اور ان پانچ سالوں میں میں نے بے تحاشا لائیو پروگرام کیے ہیں۔"

★ "یہ بتائیں کہ فیلڈ میں جاکر پروگرام کرنا یا بولنا زیادہ آسان ہے یا اسٹوڈیو میں بیٹھ کر بولنا زیادہ آسان ہے؟"

* "میں سمجھتا ہوں کہ فیلڈ میں جاکر بولنا زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اسٹوڈیو میں تو آپ کے پاس لکھا ہوا ہوتا ہے اور پھر ریکارڈ بھی ہوجاتا ہے تو کوئی غلطی ہو تو ایڈیٹنگ بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن لائیو بولتے وقت آپ کو ہربات کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ ریڈیو کی پالیسی اور حکومت کی پالیسی کو مد نظر رکھ کر بیان کرنی ہوتی ہے کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو' کسی کے خلاف بھی کوئی بات نہ ہو اور ایک جامع رپورٹ آپ کو پورے پاکستان کے لوگوں تک پہنچانی ہوتی ہے۔"

★ "ڈیوٹی ٹائمز کیا ہوتے تھے؟ اور آج کل مزید کون کون سے پروگرام آپ کررہے ہیں؟"

* "ہماری ٹرانسمیشن صبح سات بجے سے رات بارہ بجے تک ہوتی تھی اس دوران کچھ بھی کراچی میں ہوتا تھا تو مجھے ہی لائن پہ آکر ساری صورت حال بتانی ہوتی تھی ۔۔۔ اور آج کل میرے پاس پرائم ٹائم ہے جس میں دوپہر دو بجے سے تین بجے تک پروگرام ہوتا ہے۔ اس میں ہم کسی بھی شخصیت کو بلاکر اس کا انٹرویو کرتے ہیں۔ یہ پروگرام روزانہ ہوتا ہے اگر اتفاق سے کوئی آر جے نہیں آتا تو پھر میں ہی اس پروگرام کو کرتا ہوں تو پرائم ٹائم اور نیشنل براڈکاسٹ پروگرام سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور بولنے کا شوق بھی پورا ہوا۔"

★ "پرائم ٹائم میں مشہور شخصیت کے انٹرویوز ہوتے ہیں اب تک کن شخصیات کے کرچکے ہیں اور کیا مشہور شخصیت تعاون کرتی ہیں؟"

* "میں بی بی سی کے علی رضا عابدی سینئر آرٹسٹ وردانہ بٹ فاطمہ ثریا بجیا ڈپٹی اسپیکر شہلا رضا اور بے شمار شخصیات کے ۔۔۔ انٹرویوز کرچکا ہوں خواہ شخصیات سیاست کے حوالے سے ہوں' شوبز کے حوالے سے ہوں' کھیل کے حوالے سے' سماجی خدمات کے حوالے سے ہوں۔ سیلانی ویلفیئر کے مولانا بشیر فاروقی کا انٹرویو کیا اور ان کے ادارے پر ایک ریسرچ ورک کا پروگرام کیا۔۔۔ اور جہاں تک ان کے تعاون کی بات ہے تو چونکہ ٹی وی کا دور ہے تو لوگ اس کی طرف زیادہ جاتے ہیں ریڈیو پہ صرف وہی لوگ آتے ہیں جو ریڈیو کی اہمیت کو سمجھتے ہیں بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو ہماری ایک کال پہ آجاتے ہیں انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ ریڈیو پاکستان ایک بڑا ادارہ ہے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہماری نئی جنریشن خاص طور پر ڈرامے کے حوالے سے جو لوگ ہیں وہ نخرے دکھاتے ہیں بلکہ پیسے کی ڈیمانڈ بھی کرتے ہیں۔ تو مجھے شکوہ ہے ان لوگوں سے کیونکہ ہم آپ کی شخصیت اور آپ کے کام کو ہی تو آگے بڑھا رہے ہوتے ہیں۔ ہمارا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم آپ کو ایک گھنٹہ دے رہے ہیں آپ بات کریں اور لوگوں تک اپنے کام اور اپنے خیالات کو آگے تک بڑھائیں اور یہ بات بھی میں نے نوٹ کی ہے کہ جتنے بھی ہمارے سینئر لوگ ہیں خواہ وہ کسی بھی فیلڈ کے ہوں وہ تنگ نہیں کرتے اور شہلا رضا تو ریڈیو کی اہمیت کو بہت مانتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ گاؤں دیہات کے لوگ ریڈیو کو بہت پسند کرتے ہیں اور بقول ان کے جب میں گاؤں دیہات میں جاتی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ میڈم ہم نے آپ کو ریڈیو پہ سنا تھا وہاں ٹی وی کا حوالہ نہیں دیتے۔"

★ "ریڈیو پہ کام کرنے والوں کی آمدنی بہتر ہوتی ہے؟"

* "جن لوگوں کو ریڈیو کے مائیک کے آگے بولنے کا شوق ہوتا ہے وہ پھر اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ انہیں کیا مل رہا ہے۔ جہاں تک میری سیلری کی بات ہے تو میں 1996ء سے ریڈیو سے وابستہ ہوں اور مجھے پہلا چیک 1730 روپے کا ملا تھا اور ہمیں اس دن کے پیسے ملا کرتے تھے جس دن ہماری بکنگ ہوا کرتی تھی تو پھر آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتا گیا اور اب اللہ کا کرم ہے یہاں میں ایک نام ضرور لینا چاہوں گا طاہرہ بھٹی صاحبہ کا جو کہ اگرچہ مجھ سے جونیئر ہیں لیکن انہوں نے میرا تعارف ذمہ دار لوگوں تک پہنچایا اور جس کی وجہ سے میرا ایک اچھا اماؤنٹ مقرر ہوا ۔۔۔ طاہرہ بھٹی میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ ان کے علاوہ بدر رضوان جو سینئر براڈکاسٹر ہیں ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

★ "کیا ریڈیو کے لوگوں کو ماس کمیونیکیشن کی تعلیم لینا ضروری ہوتی ہے؟"

* "ریڈیو کے لوگوں کو بھی جن میں رپورٹرز' پروڈیوسر ڈائریکٹرز کے لیے بھی ماسٹرز ہونا ضروری ہے میڈیا سے متعلق معلومات کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے لیکن ہمارے ادارے میں بعض لوگ ابھی بھی ایسے ہیں جو پڑھے لکھے تو ہیں مگر انہیں کام کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا وہ لوگوں کو دیکھتے بھی ہیں پھر بھی کاپی نہیں کر پاتے تعلیم کے ساتھ ساتھ شوق اور اپنے سینئرز سے کچھ سیکھنے کا عمل بہت ضروری ہوتا ہے اور میں نے دیکھ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔"

★ "اتنا کچھ ریڈیو کے لیے کیا ہے' تو کبھی دل نہیں چاہا کہ ٹی وی اسکرین پہ بھی نظر آئیں؟"

* "ایک پرائیویٹ نیوز چینل کی لیے میں نے کام کیا ہے۔ رفیع ناصر (مرحوم) مجھے لے کر آئے تھے ۔۔۔ لیکن ہمارے یہاں المیہ یہ ہے کہ ہمارے پرائیویٹ چینل والے اگر تنخواہیں دیتے بھی ہیں تو جس کو گھر چلانا ہو اور جس کی تنخواہ پر ہی گھر کا دارومدار ہو تو وہ کس طرح اتنا طویل انتظار کرسکتا ہے تو میں نے دو ماہ رفیع ناصر صاحب کے لیے بھرپور کام کیا روز شو کیے' مہنگائی پر پروگرام کیے اور بھی بہت کچھ کیا کام کرکے اچھا بھی لگا لیکن مزا سارا کرکرا تب ہوا جب پیسے ہی نہیں ملے اگر اچھا اماؤنٹ ملتا تو یقیناً" میں آج آپ کو ٹی وی اسکرین پہ بھی نظر آرہا ہوتا۔"

★ "ماشاء اللہ اتنا دن رات کام کرتے ہیں۔ تھکن بھی ہوجاتی ہوگی' صحت بھی متاثر ہوتی ہوگی' موڈ بھی خراب ہوتا ہوگا اور بیگم سے لڑائی بھی ہوتی ہوگی تو کیا ان باتوں کا اثر پروگراموں پر پڑتا ہے؟"

* "میری بیگم سے تو خیر کبھی لڑائی نہیں ہوتی اور نہ ہی گھر کی وجہ سے میرے پروگرام پر کسی قسم کا اثر پڑتا ہے ہاں کام کے حوالے سے کوئی بات سننے کو مل جائے تب موڈ آف ہوجاتا ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے دنوں میں عوامی مسائل کا پروگرام "آپ کی آواز" کررہا تھا یہ ڈیلی پروگرام تھا اس میں ہم عوام کے مسائل لیتے بھی تھے اور اسی وقت ان کا حل بھی بتاتے تھے' متعلقہ اداروں کو لائیو لائن پہ لے کر' اچھا خاصا محنت طلب پروگرام کیا اور نہایت ذمہ داری کا بھی تو جب اتنی محنت

کے بعد بھی کوئی سینئر میں سے سناتا تھا کہ تم نے یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا تب میرا موڈ خراب ہو جاتا تھا تو پھر بڑی بے دلی کے ساتھ میں وہ پروگرام کرتا تھا۔"

★ "انسان میڈیا میں ہو تو دل چاہتا ہے کہ لوگ اسے پہچانیں اسے بتائیں کہ آپ کیسے پرفارم کر رہے ہیں۔ آواز کی دنیا کے لوگ مشہور ہونے کے باوجود عام لوگوں میں نہیں پہچانے جاتے تو دل چاہتا ہے؟"

* "بالکل دل چاہتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ لوگ ہمیں بالکل نہیں جانتے لوگ ہماری آواز سن کر ہمیں پہچان جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بہاولپور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر جاوید اقبال صاحب کی پوسٹنگ کراچی میں ہو گئی اور جب انہوں نے چارج سنبھالا تو میں ان سے ملنے گیا اور اپنا تعارف کرایا کہ سر میں شکیل الدین ہوں تو وہ ایک دم چونکے اور بے ساختہ خوش ہوتے ہوئے بولے اچھا آپ ہیں شکیل الدین میں نے تو آپ کو بہت سنا ہے۔ انہوں نے بڑا اچھا رسپانس دیا تو میرا منوں خون بڑھ گیا تو جب اس طرح کے رسپانس ملتے ہیں اور عام پبلک میں بھی لوگ آواز کے ذریعے پہچان لیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

★ "لڑکیوں کے فون بھی آتے ہوں گے کہ آپ کی آواز بہت اچھی ہے، مجھے آپ سے ملنا ہے وغیرہ وغیرہ؟"

* قہقہہ "کالز تو آتی ہیں مگر ایسا کوئی اہم واقعہ یا کال ایسی نہیں کہ یاد رکھی جا سکے۔ کام کے لحاظ سے کالز آتی ہیں اور ایسی کالز اگر آئیں تو میں اسے نظر انداز کر دوں گا کیونکہ میری مسز بہت اچھی ہے۔"

★ "آپ عام لائف میں کیسے ہیں؟"

* "عام طور پر ہنستا مسکراتا ہی رہتا ہوں۔ مسز کو کبھی کبھار نخرے دکھا دیتا ہوں اور اپنی والدہ کو نخرے دکھا دیتا ہوں کہ یہ نہیں کھاتا یہ نہیں کرتا یا کوئی کام اپنی مرضی کا نہ ہو تو تھوڑا مزاج گرم ہو جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر میرا رویہ بڑا نارمل رہتا ہے اور میں احساس بھی نہیں ہونے دیتا کہ مجھے کس کی کوئی بات بری لگی ہے۔"

★ "اور کیا مشاغل ہیں فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

* "بڑی مشکل سے فارغ وقت ملتا ہے تو جب کبھی قسمت سے مل جائے تو پھر فیس بک پہ دوستوں سے ہیلو ہائے اور تھوڑی سی گپ شپ ہو جاتی ہے۔ فیس بک پہ میرے پاس بہت اچھی اچھی اور علمی شخصیات ایڈ ہیں ان سے بات چیت ہو جاتی ہے پھر اردو ٹو انگریزی ڈکشنری کے ذریعے اپنی Vocabulary میں اضافہ کرتا ہوں۔ کھیلوں میں مجھے ہاکی دیکھنے کی حد تک پسند ہے۔ بچپن میں کرکٹ کھیلتا تھا مگر پھر ذمہ داریوں میں ایسا الجھا کہ کرکٹ چھوٹتی پڑی۔ اب تو صرف اتنا لگاؤ ہے کہ پاکستان جیتا یا ہارا۔۔۔ لیکن چونکہ ہمارے لائیو پروگرام ہوتے ہیں تو پھر ہر چیز کے لیے اپ ڈیٹ رہنا پڑتا ہے۔ تو کھیلوں کا چونکہ لوگوں کو شوق ہے تو پھر اس کی طرف توجہ دینی پڑتی ہے۔"

★ "اس انٹرویو کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے آپ؟"

* "میں جناب یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے گھر میں ایک عرصے سے خواتین، شعاع اور کرن ڈائجسٹ آتے ہیں اور میں بڑے عرصے سے انٹرویوز بھی پڑھتا تھا اور مجھے یہ بات بہت اچھی لگ رہی ہے کہ میں جن کو اتنے عرصے سے پڑھ رہا تھا آج میری ان سے بات ہو رہی ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شکیل الدین سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆ ☆

دُرِ صالحہ

ادارہ

★ "آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

* "دُر صالحہ۔ گھر والے پیار سے گڑیا بلاتے ہیں۔"

★ "کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟"

* "آئینے سے تو کچھ نہیں کہتی لیکن اللہ کا شکر ضرور ادا کرتی ہوں کہ اس نے بہت سوں سے اچھا بنایا ہے۔"

★ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

* "میرے بچے حمزہ، عمر، رومان، ایمان۔"

★ "اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

* "جب میری امی کی اچانک وفات ہوئی وہ لمحے میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔"

★ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

* "میرے لیے محبت بہت اہم ہے۔ محبت مجھے آکسیجن کی طرح لگتی ہے اور میرا اسٹار Pieces ہے اور اس اسٹار کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک محبت بھی ہے Pieces بنے ہی محبت کے لیے ہیں۔"

★ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

* "اس نئے سال میں نے سوچا ہے کہ نماز کی باقاعدگی کرنی ہے اور قرآن پاک روز پڑھنا ہے اور ایک منصوبہ M.Phill کرنا ہے۔"

★ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا؟"

* "میری بیٹی کی پیدائش، تین بیٹوں کے بعد (ماشاء اللہ)۔"

★ "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

* "یقین۔"

★ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

* "میں بہت حساس ہوں۔ میرے لیے محبت بہت ضروری ہے۔ اپنی فیملی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہوں۔"

★ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

* "امی کی وفات کے بعد میں اس بات سے بہت ڈرتی ہوں کہ میرا کوئی بہت اپنا مجھ سے بچھڑ کر دور نہ چلا جائے۔"

★ "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"

* "میرے میاں اور میرے بچے۔"

★ "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

* "اپنی فیملی کے ساتھ باہر گھومنے چلی جاتی ہوں۔"

★ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

* "آج کے مہنگائی کے دور میں دولت کی بہت اہمیت ہے لیکن یہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور اگر آپ کے پاس ہے تو اللہ کا شکر ادا کیا کریں اور نہیں ہے تو اللہ سے دعا مانگا کریں کہ وہ اس نعمت سے نوازے۔"

★ "گھر آپ کی نظر میں؟"

* "عورت کی محفوظ پناہ گاہ۔ میرا گھر میری جنت بھی ہے۔"

★ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کردیتی ہیں؟"

* "اکثر بھول جاتی ہوں اور اسی کوشش میں رہتی ہوں کہ تعلقات بحال رہیں۔ لیکن بعض اوقات اس طرح کی صورت حال ہو جاتی ہے کہ اگلے اس بات کو بھولنے ہی نہیں دیتے پھر آپ ہی بتائیں کہ کیا کیا جائے۔"

★ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟"

* "ابھی تک کوئی بہت بڑی کامیابی ملی نہیں ہے۔ ویسے شادی سے پہلے ماں کی دعاؤں کو اور شادی کے بعد میاں کو۔"

★ "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

* "کامیابی، اللہ کا شکر ادا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور اللہ پر یقین اور پختہ ہوتا ہے۔"

★ "سائنس نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کردیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

* "آج کے اس مشینی دور میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بہت ایکٹیو ہیں۔ اس لیے ہر چیز کو پازیٹیو لینا چاہیے۔ ہر دور کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔"

★ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

* "خواہش یہ ہوتی ہے کہ روز K.F.C کا زنگر کھانے کو ملتا رہے اور یہ کہ جب میں اکیلی چائے پی رہی ہوتی ہوں تو دل کرتا ہے کہ کوئی دوسرا بھی ہو جو میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پیے اکیلے چائے پینے میں مزا نہیں آتا۔"

★ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

* "برسات یا بارش دور دور سے ہی اچھی لگتی ہے کیونکہ آج کل گھروں میں کارپٹ بچھے ہونے کی وجہ سے یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں گیلے نہ ہو جائیں یا پاؤں سے کیچڑ وغیرہ نہ لگ جائے۔ اس لیے بچوں کو منع کرتے ہوئے گزرتی ہے۔"

★ "آپ جو ہیں، وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

* "پھر بھی اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ہی ہوتی۔"

★ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں، جب؟"

* "مجھے اس وقت بہت اچھا لگتا ہے۔ جب میرے شوہر میری بات کو غور اور توجہ سے سنتے ہیں۔ کیونکہ بچوں کو سلانے کے بعد ہی بات کرنے کا ٹائم ملتا ہے تو میرا دل کرتا ہے کہ سارے دن کی باتیں ان سے کروں مگر وہ Laptop کھولے بیٹھے ہوتے ہیں اور ہوں، ہاں میں جواب دیتے ہیں۔"

★ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

* "مسکراہٹ۔"

★ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

* "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بہت کچھ دیا ہے۔"

★ "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

* "خوبی یہ ہے کہ مجھے دوسروں کا خیال رکھنا اچھا لگتا ہے اور خامی یہ ہے کہ میں اپنا خیال نہیں رکھتی اور بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔"

★ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کردیتا ہے؟"

* "اسکول لائف کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو یاد کرنے پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ ہم کتنے بے وقوف تھے۔"

★ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟"

* "میں کسی سے مقابلہ نہیں کرتی۔"

★ "متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟"

* "قرآن پاک، جو بھی اچھا لکھے، شاہ رخ کی موویز۔"

★ "آپ کا غرور؟"

* "میں کسی بھی بات پر غرور نہیں کرتی۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں اللہ کو برا نہ لگ جائے۔"

★ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کردیتی ہو؟"

* "شکست تو مقابلہ کرنے پر ہوتی ہے میں کسی سے مقابلہ کرتی ہی نہیں۔ لیکن ایک بات اداس کرتی ہے کہ میری امی اس دنیا سے بہت جلدی چلی گئیں مجھے ان کی ابھی بھی بہت ضرورت تھی۔ اب میرے لیے بے غرض اور سچے دل سے دعا کرنے والا کوئی نہیں رہا۔"

★ "کوئی شخصیت، یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

* "دنیا میں بہت سے کامیاب لوگ ہیں۔ کس کس سے حسد کیا جائے۔ اس لیے میں حسد نہیں کرتی بلکہ یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہمیں بھی اس کی طرح کامیاب بنائے۔ حسد کبھی نہیں کرنا چاہیے بلکہ دعا کرنی چاہیے۔"

★ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

* "شادی سے پہلے تو بہت اہمیت تھی۔ شادی کے بعد اور خاص طور پر بچوں کے بعد تو تقریباً اہمیت ختم ہی ہو گئی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مطالعہ ذہن کو وسیع کرتا ہے اور شعور دیتا ہے۔"

★ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے، جو آپ اپنے علم تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"

* "زندگی اللہ کی دی ہوئی بہت خوب صورت نعمت ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی میں ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ ساری کی ساری فلاسفی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔"

★ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

* "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہر وہ شخص جو میرے لیے دعا کرے میری پسندیدہ شخصیت ہو جاتا ہے۔"

★ "ہمارا پیارا پاکستان سارا کا سارا خوب صورت ہے۔ آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

* "میرے لیے ہر وہ جگہ اچھی ہوتی ہے جہاں میرے میاں میرے ساتھ ہوں۔ میرے میاں کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ تو میں بھی تقریباً ہر جگہ ان کے ساتھ جاتی ہوں تو ہر جگہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

☼ ☼

نبیلہ عزیز

درد دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل' آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

تینتیسویں قسط

کیونکہ یہ لفظ اور یہ خیال اس کے دماغ پہ کسی چابک کی طرح پڑا تھا اور وہ جیسے بلبلا کے رہ گیا تھا۔
نجانے کیوں اسے اس لمحے بڑا عجیب سا لگا تھا اور بڑی تکلیف بھی ہوئی تھی۔
شاید اپنے آپ پہ۔ یا شاید علیزے کی ذات پہ۔۔۔۔
لیکن جو بھی تھا یہ ان کی زندگی کا ایک بہت ہی عجیب ترین موڑ تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے بے بس و بے اختیار کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ان کی اتنی "نفرت اور نہیں نہیں" کے باوجود بھی ہو ہی چکا تھا اس لیے اب کچھ کہنے اور کرنے کے لیے تو تھا ہی نہیں۔
بس اب تو وہ دونوں تھے۔ اور ان کی اجنبیت تھی۔
اور اب جو بھی کرنا تھا اسی اجنبیت کی دیوار کے آر پار رہ کر ہی کرنا تھا۔ ورنہ اور تو کوئی حل ہی نہیں تھا زندگی کو سہل کرنے کے لیے۔۔۔۔
شاید اسی لیے دونوں کو شعور آگیا تھا کہ اب زندگی کرنے کی طرز کیا ہوگی؟ اور طریقہ کیا ہوگا؟ دکھ کی بھٹی میں دونوں ہی جلے تھے اس لیے صبر بھی دونوں کو ہی آچکا تھا' دونوں ہی صابر ہو چکے تھے اور آج اس لمحے سے دونوں پہ ہی ادراک ہو چکا تھا کہ اب زندگی "یہی" ہے اور اسے ہی قبول کرنا ہے۔
چاہے دل مانے۔ چاہے نہ مانے۔۔۔!
"ڈرائیور۔۔۔! چائے۔" اس نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا تھا۔
"ہوں۔۔۔! رکھ دو۔" وہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے آگے بڑھ کے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور خود پلٹ گئی تھی۔
"تھینک یو۔۔۔!" دل آور کی نظریں ٹیبل پہ رکھے چائے کے کپ پہ تھیں اور شکریہ علیزے کا ادا کر رہا تھا۔ علیزے نے ٹھٹک کر گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا وہ بڑی خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا اور علیزے اسے اک نظر دیکھ کر صوفے پہ جا بیٹھی تھی کیونکہ اب اس میں اتنی ہمت اور اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے دوبارہ جاکر بیڈ پہ بیٹھ جاتی۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی اس بیڈ سے بڑی مشکل سے اٹھی تھی اب دوبارہ جا کر بیٹھنا تو ممکن ہی نہیں تھا۔
"سو جاؤ۔!" اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے گمبھیر اور بوجھل سے لہجے میں کہا تھا۔
"نیند نہیں آرہی۔" علیزے نے اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے انتہائی آہستگی سے جواب دیا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی۔۔۔؟" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"نرم بستر پہ سونے کی عادت نہیں رہی۔" علیزے کے جواب پہ وہ ٹھہر سا گیا تھا اور پھر گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ بڑے لاپروا اور لاتعلق سے انداز میں گردن جھکائے بیٹھی اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔
"عادت تو تمہیں میرے ساتھ رہنے کی بھی نہیں ہے؟ پھر کیا کروگی۔۔۔؟" دل آور کا لہجہ عجیب بے تاثر سا ہو رہا تھا اور اب کی بار اس کے اس لہجے اور سوال پہ علیزے نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تو دونوں نے ہی نظریں جھکالی تھیں۔
"میری عادتوں کو تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ مجھے فرش پہ سونے کی عادت ہو سکتی ہے تو پھر۔۔۔" علیزے نے یونہی اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اسے جواب سے نوازا تھا' لیکن اس ادھورے جواب کا مفہوم دل آور بہت گہرائی سے اور بہت آسانی سے سمجھ چکا تھا۔
"ہوں۔۔۔! تو پھر میرے ساتھ رہنے کی عادت بھی ہو سکتی ہے یعنی اس فرش میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں

ہے؟" دل آور نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں خود کو جیسے کچھ باور کروایا تھا اور پھر خاموشی سے دوبارہ چائے کا کپ اٹھا کر چائے پینے لگا تھا۔
علیزے کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے۔ جو اس نے زندگی میں پہلی بار بنائی تھی اور وہ بھی صرف اس کے لیے بنائی تھی اور علیزے اسے چائے پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ اپنے دھیان میں چائے پی رہا تھا۔
رات بہت حد تک بیت چکی تھی اور وہ دونوں ہنوز اپنی اپنی جگہ پہ اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے جاگ رہے تھے' وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور وہ صوفے پہ بیٹھی ہوئی تھی اور یونہی بیٹھے بیٹھے دونوں کی پہلی رات گزر گئی تھی۔ دکھ' درد اور ذلیلوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی رات۔۔۔ یعنی ان دونوں کی سہاگ رات۔۔۔!!!

☼ ☼ ☼

دکھ کی رات ڈھل چکی تھی اور ذلیلوں کا دن شروع ہو چکا تھا اور ان ہی ذلیلوں کے سہارے وہ بھی اپنے آپ کو ذرا سا سنبھال لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علیزے فجر کی نماز پڑھ رہی تھی جب دل آور راکنگ چیئر سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا تھا۔
باہر کی تازہ ہوا اس کے بوجھل اعصاب کو کپکپا کے رکھ گئی تھی' بالکل اسی طرح جس طرح دعا مانگتے ہوئے علیزے کے ہاتھ کپکپا رہے تھے' اسے شاید کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ دعا میں اللہ سے اگر کچھ مانگے تو کیا مانگے؟ کیونکہ اپنے لیے تو کچھ مانگنے کے لیے تھا ہی نہیں۔۔۔ تو پھر کس کے لیے مانگے۔۔۔؟ اور اسی مانگنے اور نہ مانگنے کی کشمکش میں بیٹھی علیزے کے دعا کی خاطر پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر دل آور کے دل میں دعا کی طلب بے دار ہوئی تھی۔ اک بلا ارادہ اور بے ساختہ سی طلب!
"علیزے۔۔۔! میں نے تمہیں بے سکون کیا ہے' دکھ دیا ہے' تمہیں' دل دکھایا ہے تمہارا' تنہا کر دیا ہے تمہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ اب خود تنہا ہو گیا ہوں' خود بے سکون ہو گیا ہوں' اب اپنا دل دکھ سے بھر گیا ہے' اب مجھے دعا کی ضرورت ہے اور یہ دعا تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا صرف تم کر سکتی ہو۔ پلیز علیزے! میرے لیے دعا کرو۔ دعا کرو اللہ مجھے سکون دے اور صبر عطا کرے اتنا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو جاؤں۔" وہ علیزے سے التجائیہ سے انداز میں کہتا وہاں سے ہٹ کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔
علیزے اپنے خالی اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہ گئی تھی اس میں اتنا حوصلہ اور اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ اس شخص کے لیے دعا کرتی جو اس کے خاندان کو اور اس کے دل کو برباد کرنے کا باعث بنا تھا جس نے اسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا جو اس کی ذات کو دو کوڑی کا کر کے رکھ چکا تھا۔
آخر وہ اس کے لیے دعا کرتی بھی تو کیسے۔۔۔؟
یہ ممکن ہی کب تھا بھلا۔۔۔؟
وہ اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتی ہوئی اپنے ہونٹوں کو سیتے ہوئے جائے نماز سمیٹ کر اٹھ گئی تھی اور بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں پہ بند ھ باندھتی ہوئی اسی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی جہاں وہ کھڑا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج بھی اسی جائے نماز پہ بیٹھی تھی جس پہ اس کے دل آور شاہ نے سجدہ کیا تھا' نماز ادا کی تھی اور دعا مانگی تھی۔
البتہ اس نے تو پتا نہیں کون سی دعا مانگی تھی اور کس کے لیے مانگی تھی؟
مگر زری کی تمام دعائیں تو بس اسی کے لیے ہوتی تھیں۔

حرف اول سے لے کر حرف آخر تک صرف اس کا نام ہوتا تھا۔
اس کے دل سے نکلنے والا لفظ لفظ جیسے دل آور شاہ کی ہی امانت تھا۔
کسی اور کا تو گزر بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کی دعاؤں میں شریک ہو جاتا۔
صرف وہی وہ تھا... کل بھی... آج بھی... آئندہ بھی... اور اس وقت بھی...! اور وہ تھی کہ اس کے لیے دعائیں مانگے جا رہی تھی کیونکہ کل وہ سب اس کا جو حال دیکھ چکے تھے اسے واقعی دعاؤں کی ہی ضرورت تھی دل سے اٹھنے والی بے لوث اور شدت آمیز دعائیں، جو اس کے لیے صرف اور صرف زری ہی کر سکتی تھی۔ زری کے سوا کوئی اور ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"انوشہ...! انوشہ...! کہاں ہو بھئی؟ ممی کہاں ہیں؟"
دانیال انیکسی میں داخل ہوتے ہی عائشہ آفندی کے بیڈ روم کی طرف جاتا تھا اس وقت بھی یہی ہوا تھا وہ سیدھا ان کے بیڈ روم میں ہی گیا تھا، لیکن انہیں وہاں نہ پا کر اس نے انوشہ کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔
"جی بھائی! کیا بات ہے؟ خیریت؟" انوشہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب دانیال کی آواز پہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے باہر نکل آئی تھی۔
"بات کیا ہو گی بھلا؟ تم سب ہی غائب ہو، ممی کہاں ہیں؟ وہ بھی نظر نہیں آ رہیں؟" دانیال عائشہ آفندی کی طبیعت کی وجہ سے ہر وقت ہی تشویش زدہ سا رہتا تھا اسے ان ہی کی طرف سے پریشانی گھیرے رکھتی تھی۔
"ہم نے کہاں غائب ہونا ہے بھلا؟ زین شاید جودت اور حماد کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ میں یہاں اسٹڈی میں بزی ہوں اور مما کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہوا ہے اور رہی بات آپ کی تو آپ اپنے آپ سے خود ہی پوچھ کر بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں تھے؟" انوشہ نے بھی اسے اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا جبکہ دانیال اس کے جواب پہ ذرا سا ٹھٹکا تھا۔
"ممی کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہے؟ مگر کیوں؟" اس نے مزید تشویش سے پوچھا تھا۔
"یہ تو مجھے نہیں پتا البتہ یہ ضرور پتا ہے کہ آج کی میٹنگ، بہت خاص میٹنگ ہے، سبھی حکمران وہیں جمع ہیں۔" انوشہ نے اسے مزید اطلاع دی تھی اور دانیال کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔
"خاص میٹنگ؟ ہوں... سمجھ گیا...'' اس نے فوراً" قدم واپس موڑ لیے تھے اس کا ارادہ اب وہیں جانے کا تھا۔
"کیا سمجھ گئے ہیں؟ کچھ مجھے بھی سمجھا دیں؟" انوشہ پیچھے سے مچل کے بولی تھی۔
"چل جائے گا پتا۔ صبر رکھو۔" اس نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔
"مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔
"وہیں جہاں سبھی حکمران جمع ہیں۔" دانیال بڑے سکون سے کہتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تھا اس کے قدموں میں روانی آ گئی تھی وہ جلد از جلد میٹنگ میں پہنچنا چاہ رہا تھا اور اسی عجلت میں وہ کوریڈور مڑتی ہوئی حرمت سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔
"اللہ خیر! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" حرمت نے خفگی سے کہتے ہوئے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔
"سوری! میں نے دھیان نہیں دیا۔" دانیال خود بھی خجل ہو گیا تھا۔
"تو دھیان کہاں ہے آپ کا؟" اس نے بے ساختہ سوال داغ دیا تھا اور دانیال نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا وہ چہرے سے ہی خفت زدہ سی لگ رہی تھی۔
"دھیان بھی بس یہیں کہیں تھا۔" دانیال نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"دھیان کو بس یہیں کہیں نہیں ہونا چاہیے، صرف ایک ہی جگہ پہ ہونا چاہیے۔ ورنہ یہیں کہیں دھیان رکھنے والے ٹھوکر کھا لیتے ہیں۔" حرمت نے اسے جیسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اک سائیڈ سے کترا کے گزر گئی تھی۔ جبکہ دانیال وہیں کھڑا اس کی بات کا مفہوم سمجھتا رہ گیا تھا۔
"کیا بات ہے دانیال بھائی؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں آپ؟" جویریہ لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں جا رہی تھی جب دانیال کو کوریڈور کے کونے پہ کھڑے دیکھ کر رک گئی تھی۔
"ہوں! کچھ نہیں بس ایسے ہی رک گیا تھا۔" وہ چونک کر سر جھٹکتا ہوا ڈیڈ کے بیڈ روم کی طرف آ گیا تھا حالانکہ اس کے دل میں کھدبد ضرور ہو رہی تھی کہ حرمت آخر ایسی بات کیوں کہہ گئی ہے؟ ورنہ وہ تو کبھی کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔
"عائشہ! تم کیوں چپ ہو گئی ہو تم بھی تو کچھ کہو نا؟ تمہاری کیا رائے ہے؟"
ثروت بیگم کی آواز پہ دانیال دروازے پہ دستک دیتے دیتے رک گیا تھا ثروت بیگم عائشہ آفندی سے مخاطب تھیں۔
"آپ نے بات ہی چپ کروانے والی کر دی ہے، کچھ کہنے کے لیے کیا ہے اب؟ فیصلہ تو آپ لوگ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اب اس میں ہماری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے بھلا۔" عائشہ آفندی کا دھیما اور بجھا بجھا سا لہجہ بتا رہا تھا۔ انہیں کچھ اچھا نہیں لگا۔ اب کیا اچھا نہیں لگا یہ تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔
"کیوں؟ تمہاری رائے کیوں اہمیت نہیں رکھتی؟ تمہیں کچھ بھی کہنے کا پورا پورا حق ہے تم کہہ سکتی ہو۔ ہم سب سن رہے ہیں اور کوشش کریں گے کہ تمہاری رائے کا احترام کریں۔" اسرار آفندی نے وقار آفندی کی جگہ بولنے کا حق ادا کیا تھا اور باہر کھڑے دانیال کو بے چینی نے آ گھیرا تھا کہ اب اس کی ماں نجانے کیا کہنے والی ہیں کہ سب کو انتظار ہو گیا ہے؟
"نہیں بھائی صاحب! میں اپنی رائے زبردستی کسی پہ مسلط نہیں کرنا چاہتی سب کی اپنی اپنی اولاد ہے اور اپنا اپنا اختیار، ہر کوئی اپنی مرضی ہی کرنا چاہتا ہے آپ لوگوں نے اپنی اولاد کے بارے میں سوچا ہے تو کچھ بہتر ہی سوچا ہو گا۔" عائشہ آفندی کافی آہستگی سے بول رہی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے سن پا رہا تھا۔
"ارے نہیں عائشہ! کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ ہماری اور تمہاری اولاد میں کوئی فرق ہے کیا؟ ہماری اولادیں ہم لوگوں میں بٹی ہوئی تو نہیں ہیں؟ یہاں سب کچھ ایک ہی تو ہے؟" اسرار آفندی نے بڑی اپنائیت اور بڑے خلوص سے اپنی بہن کو مان بخشنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی نہ رکھ لیں بلکہ دل میں جو بھی ہے وہ صاف کہہ دیں۔
"نہیں بھائی صاحب! یہاں سب کچھ ایک ہی تو نہیں ہے نا؟ اولادوں میں فرق تو آپ کے اس فیصلے سے ہی آ گیا ہے کہ آپ نے اپنے بچوں کے بارے میں سوچ لیا ہے، لیکن ہمارے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں سوچا۔ آپ کو آذر اور احمد وغیرہ کی زندگی کا فیصلہ یاد ہے، لیکن دانیال اور زین وغیرہ کی زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا ان کے لیے بھی کچھ سوچا ہے آپ نے؟ کیا ان کے لیے بھی کوئی فیصلہ کیا ہے آپ نے؟ یا پھر لاوارث سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔" عائشہ آفندی پہلے ہی زہرہ بتول شاہ کے غم میں جلی ہوئی بیٹھی تھیں اور اوپر سے اپنے دونوں بھائیوں کے اس نئے فیصلے نے انہیں اور بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا اور دانیال زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کو اتنے سخت لہجے میں بات کرتے سن کر حیران رہ گیا تھا بلکہ حیران تو وہ سبھی رہ گئے تھے کہ آخر عائشہ کو ہوا کیا ہے؟

"عائشہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ سب کیا کہہ رہی ہو تم؟" اسرار آفندی اور اظہار آفندی دونوں ہی تڑپ گئے تھے۔ کیونکہ ان کی بہن نے آج تک ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ کومل آپ کو آذر کے لیے پسند آ گئی ہے اور حرمت احمد کے لیے مناسب لگ رہی ہے تو پھر دانیال کے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟ اس کے لیے کسے پسند کیا گیا ہے آخر؟ بتائیے مجھے دانیال کدھر گیا بھلا؟"

عائشہ آفندی دکھ کے مارے بپھر جانے کو تھیں اور دانیال کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے، حرمت اور احمد کے نام پہ اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اسے اچھا خاصا دھچکا سا لگا تھا۔

تو گویا حرمت کے لہجے کی تلخی کی اصل وجہ یہی تھی اور اسی لیے وہ قدرے اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی تھی۔

"دانیال کے لیے؟" وہ سب عائشہ آفندی کی بات پہ جیسے ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"ہاں! دانیال کے لیے۔" انہوں نے بڑے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"دانیال کے لیے بھی ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ وہ بھی ہمارا ہی بیٹا ہے اس کی شادی بھی اسی گھر میں ہوگی تم فکر کیوں کرتی ہو بھلا؟" انہوں نے عائشہ آفندی کو تسلی دینی چاہی تھی۔

"کیوں فکر نہ کروں؟ میں ماں ہوں اس کی۔ اس کے دل کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے بھلا؟ آپ کا کوئی فیصلہ میرے بیٹے کے دل پہ گراں گزرے میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟" عائشہ آفندی آج چپ ہونے والی نہیں تھیں۔ جبکہ دانیال کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی ماں اپنے بھائیوں سے اس طرح لڑ جھگڑ کر اس کی پسند یا اس کا حق حاصل کرے۔ بلکہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنی پسند اور اپنے دل میں پنپنے والی محبت سے ہی دستبردار ہو جاتا۔

"تو بتاؤ نا عائشہ؟ ایسا کیا ہے، جو اس طرح تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا؟" وہ لوگ اصرار کر کر کے تھک گئے تھے اور اس سے پہلے کہ عائشہ آفندی بھی تھک ہار کے زبان سے کچھ کہہ دیتیں۔ دانیال یک دم دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا اور وہ سب اس کے اس طرح اچانک اندر چلے آنے پہ حیران رہ گئے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے سب کو ہی سلام کیا تھا۔ البتہ آسیہ آفندی کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی اس کی نظر ٹھٹک گئی تھی۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا اور اپنے اس بھیگے ہوئے چہرے کو چھپانے کی کوشش میں وہ ذرا سا سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔

"وعلیکم السلام! تم یہاں؟" عائشہ آفندی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔ کیونکہ دانیال کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

"جی ہاں! آپ کے لیے ہی آیا ہوں۔ آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے نا۔ اگر میڈیسن وقت پر نہ لیں تو کتنا مسئلہ ہو جاتا ہے پھر؟ اس لیے آپ ابھی اٹھیں اور میرے ساتھ چل کر میڈیسن لیں ابھی۔" دانیال نے بڑے اچھے اور نارمل طریقے سے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں صوفے سے اٹھا لیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا ابھی بیٹھنے دو اسے، کچھ ضروری بات کرنی ہے اس سے۔" اظہار آفندی نے روکا تھا۔

"نہیں ماموں ان کی صحت سے زیادہ ضروری بات تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور ویسے بھی آپ سب ہیں نا۔ آپ بات کر لیں، بس انہیں فی الحال آرام کرنے دیں۔" دانیال پہلی بار کسی بڑے کے سامنے اپنی من مانی کرتا ہوا ماں کو ساتھ لیے ڈیڈ اور آپی کو اک نظر دیکھ کر وہاں سے نکل آیا تھا اور عائشہ آفندی اسے روکتی رہ گئی تھیں مگر اس نے واپس انیکسی میں آ کر ہی دم لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"صاحب! باہر کچھ مہمان آئے ہیں۔" زلفی اسے اطلاع دینے کے لیے اندر بھاگا آیا تھا۔

"کون مہمان ہیں؟" دل آور نے اپنے پاس بیٹھے عبداللہ اور نبیل وغیرہ سے توجہ ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ آئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کی تعزیت کے لیے۔" اب کی بار زلفی نے پورا نام لے کر ان کی آمد کی وجہ بتائی تھی۔ جبکہ وہاں بیٹھے سبھی افراد چونک گئے تھے کیونکہ اس نے ان لوگوں کا نام لیا تھا جن کی انہیں امید ہی نہیں تھی۔

"صاحب، کیا کروں؟ انہیں اندر لے آؤں یا پھر۔" زلفی نے اسے خاموش دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"نہیں، نہیں ایسا نہیں کرنا، تم انہیں اندر لے کر آؤ۔" دل آور نے کافی تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے ان لوگوں کو اندر لانے کا اشارہ دیا تھا اور زلفی تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے پلٹ کر واپس چلا گیا تھا۔

"گل۔۔۔!" عبداللہ نے گل کو آواز دی تھی۔

"جی صاحب جی؟" گل ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئی تھی۔

"زری اور نگارش بی بی سے کہو اس طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ مہمان آئے ہیں، اس لیے فی الحال اندر ہی رہیں۔" عبداللہ نے گل سے کہہ کر زری اور نگارش کو اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ تاکہ ان دونوں کا ان سے سامنا نہ ہو اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔

"جی! ابھی کہہ دیتی ہوں۔" گل فوراً پیغام لے کر پلٹ گئی تھی اور اتنے میں وہ لوگ بھی اندر آ گئے تھے۔

"السلام علیکم!" ملک اسد اللہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی بلند اور دبنگ قسم کی آواز میں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" دل آور لاکھ شکستہ حال سہی، لیکن اب بھی دشمن کے سامنے ڈٹ جانے کی پوری پوری طاقت رکھتا تھا۔ اسی لیے اتنی شکستگی اور بے دلی کے باوجود انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آخر وہ اس کی ماں کے اظہار تعزیت کے لیے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔

"کیسے ہیں دل آور صاحب؟ کیا حال ہیں آپ کے؟" ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس سے حال چال دریافت کیا تھا۔ حالانکہ اس کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ کس قدر ڈھے چکا تھا یہ تو صاف نظر آ رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" دل آور نے بڑی مشکل، بڑے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کسی سے کچھ بھی کہنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

"بیٹھیے، تشریف رکھیے۔" نبیل نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لیے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہوں، شکریہ" وہ دونوں باپ، بیٹا ان سے مل کر صوفے پہ بیٹھ گئے تھے اور ان کے بیٹھنے کے بعد وہ تینوں بھی بیٹھ گئے تھے اور پھر ملک شرافت علی نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھا لیے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے سبھی افراد نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کی تھی اور آمین کہتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیر لیے تھے۔

"جس گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا کیا اس کے بارے میں کوئی پوچھ پڑتال نہیں کی آپ نے؟" ملک اسد اللہ دل آور سے مخاطب تھا جو چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"پوچھ پڑتال کیسی؟ یہ سب تقدیر تھی اور تقدیر میں جو کچھ ہو وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔" دل آور کا جواب بہت ٹھہرا ہوا اور بہت سپاٹ تھا۔ ملک اسد اللہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے کہ تقدیر کا لکھا ہو کر ہی رہتا ہے۔ لیکن اب کوئی ہمارے سامنے ہمارے کسی اپنے کو قتل کر کے چلا جائے تو کیا ہمیں تقدیر کا لکھا سمجھ کر چپ کر کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جانا چاہیے یا پھر اس کی کوئی پوچھ پڑتال

بھی کرنی چاہیے۔" ملک اسد اللہ نے عجیب طنزیہ سے لہجے میں سوال کیا تھا اور دل آور چند ثانیے کے لیے لب بھینچ کے رہ گیا تھا۔

"قتل' خودکشی اور رب کی رضا سے آئی موت میں بڑا فرق ہوتا ہے ملک صاحب۔ قتل اور خودکشی کی وجہ سے آنے والی موت پہ صبر نہیں آتا جبکہ رب کی رضا سے آنے والی موت پہ انسان کو خود بخود صبر آجاتا ہے جیسے مجھے صبر آگیا ہے۔ البتہ آپ اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور جان بوجھ کر میری ماں جی کو گاڑی سے ٹکرمار کر چلا گیا ہوگا تو ایسا بھی نہیں ہے۔ آخر اس ٹیکسی ڈرائیور کی میری ماں جی سے کیا دشمنی ہے۔ اس لیے مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں خوامخواہ پوچھ پڑتال کروں اور لوگوں کو سزائیں دوں۔ سزا دینے والی اور بخشنے والی تو اوپر والے کی ذات ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔" دل آور کا لہجہ بے حد بوجھل اور مضمحل سا ہو رہا تھا۔ جس پہ بے ساختہ اس کے برابر بیٹھے عبداللہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دبایا تھا اور دل آور اس کے ہاتھ کے اس دباؤ پہ سرہلا کے رہ گیا تھا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو' جو بھی ہوا ہے' ہمیں اس پہ بے حد افسوس ہے۔ ماں' باپ کا ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور جن کو ہوتا ہے' بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ۔ لیکن وہ اس خوش قسمتی کی قدر نہیں کرتے۔ بہرحال اللہ ماں' باپ کا سایہ سب پہ سلامت ہی رکھے تو اچھا ہے۔ ورنہ اولاد رل جاتی ہے۔" ملک شرافت علی نے بھی کچھ بولنے کا فرض نبھایا تھا۔ ورنہ وہ مسلسل چپ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ تو واقعی صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔" نبیل نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اتنے میں زلفی ان کے لیے چائے وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ جس کے دس' پندرہ منٹ بعد وہ دونوں باپ' بیٹا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اچھا دل آور صاحب! اجازت دیجیے اب' فی الحال اتنا ہی کافی ہے' آپ سے ملاقات کا ارادہ تو ہے' لیکن ذرا فرصت سے۔ کیونکہ اس وقت تو آپ کا اپنا غم بھی تازہ ہے اور وقت بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے باقی کا قصہ پھر کسی وقت پہ اٹھا رکھتے ہیں' اللہ حافظ۔" ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے مطلب کا اشارہ بھی دے دیا تھا اور پھر وہاں سے رخصت بھی ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے جانے کے بعد دل آور پھر تھک ہار کے شکستہ سا صوفے پہ بیٹھ گیا

☼ ☼ ☼
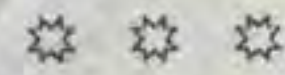
آج بتول شاہ کا سوئم تھا۔ اس لیے آج وہ سب ہی ذرا جلدی گھر سے آگئے تھے البتہ طبیعت کچھ خراب ہونے کی وجہ سے مدحیہ ذرا لیٹ پہنچی تھی۔ اسی لیے اس کے پہنچنے تک مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ابھی وہ باہر روڈ پہ گاڑی پارک کر کے گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ اس کی گاڑی کے قریب ہی عدیل نے بھی بائیک کو لا کر بریک لگا دیے تھے اور مدحیہ اس اچانک بریک لگنے پہ چونک گئی تھی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟" وہ بائیک کو لاک لگا کر بائیک سے اتر آیا تھا۔

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں میں' آپ سنائیں؟" مدحیہ نے کافی دھیمے سے لہجے میں پوچھا تھا اور عدیل اس کی طبیعت کی اداسی اور سستی اس کے لہجے سے ہی محسوس کر گیا تھا۔

"اللہ کا احسان ہے' سب ٹھیک ہے' البتہ آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" عدیل نے اسے سرتاپا گہری نظروں سے جانچا تھا اور اس کی نظروں کو بڑی تقویت ملی تھی۔ کیونکہ آج مدحیہ کسی الگ ہی روپ میں نظر آرہی تھی اور عدیل کو آج اس کے سامنے اپنا دل اور اپنی نظریں بے اختیار ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ مغربی طور و اطوار کی لڑکی اس وقت مشرقی حلیے میں نظر آرہی تھی۔ اس نے آج شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور گلے میں دوپٹا

بھی نظر آرہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آج پہلی بار اس لباس میں دیکھ کر عدیل کا دل مچل مچل گیا تھا۔ لیکن دل پہ دھیان کون دے؟ وہ تو کسی بھی وقت کہیں بھی مچل سکتا ہے۔

"بس ایسے ہی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔ رات سے سر میں بہت درد ہے۔" مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے کنپٹی کو سہلایا تھا۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔ آپ گھر پہ آرام کر لیتیں۔" عدیل کو پریشانی ہوئی تھی۔

"یہ آرام کرنے کا دن نہیں ہے نا۔ اس لیے آرام نہیں کر سکتی تھی۔ بتول شاہ میری پھوپھی یا میری خالہ نہیں تھیں۔ بلکہ میری ماں تھیں اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد آرام کیسے آتا ہے۔" مدحیہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"اوہ ایم سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا' میں تو محض آپ کی طبیعت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کے لیے کتنی اہم تھیں اور مائیں تو ہوتی ہی اہم ہیں۔ اسی لیے تو ان کے بچھڑنے پہ اتنا دکھ ہوتا ہے اور آپ کے اسی دکھ پہ تو ہم سب کو بھی دکھ ہو رہا ہے' بے حد افسوس بھی ہے مگر اب ہم سب ان کی مغفرت کی دعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں بھلا؟" عدیل نے بڑے اچھے طریقے سے اسے سمجھانے کی اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تھی' لیکن تب تک مدحیہ کے آنسو اس کے رخساروں تک بہہ آئے تھے اور عدیل بے چارا بے چین سا ہو گیا تھا۔

"پلیز! آپ اس طرح روئیں مت' رونے سے کوئی واپس نہیں آجاتا۔ بلکہ اس رونے سے بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے جنت الفردوس میں بلند درجات کی دعا کریں۔ جس سے انہیں بھی فائدہ ہو اور آپ کو بھی خوشی اور سکون حاصل ہو۔ یہ رونا دھونا چھوڑ دیں پلیز۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" عدیل اسے اب ذرا سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا اور مدحیہ بالآخر ٹشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سنبھل سی گئی تھی۔

"تھینک یو! میں فی الحال اندر چلتی ہوں۔ آپ بھائی وغیرہ سے مل لیں۔ مرد حضرات کے لیے انہوں نے شاید سامنے گراؤنڈ میں انتظام کیا ہوا ہے۔" مدحیہ لوگوں کی آمدورفت دیکھ کر عدیل کو گراؤنڈ کی طرف اشارہ کرتی خود آگے بڑھ گئی تھی۔

"مدحیہ' سنیے پلیز۔" عدیل نے اسے پیچھے سے پکارا تھا اور مدحیہ کے قدم روڈ کراس کرتے کرتے ٹھہر گئے تھے۔ اس نے آج اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ اسی لیے وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کے رہ گئی تھی۔

"پلیز اب روئیے گا مت ورنہ میرے دل کو پورا دن بے چینی ہوتی رہے گی۔" عدیل جیسے التجا کر رہا تھا اور مدحیہ اس کی اس التجا پہ اپنے دل کو دھڑکنے سے روک نہیں پائی تھی اور وہ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ آخر وہ دونوں تقریباً" روڈ کے بیچوں بیچ ہی کھڑے تھے اس لیے وہ بھی ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ہو چکی تھی اور بتول شاہ کے سوئم کا دن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سب لوگ' سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اب صرف عبداللہ اور نبیل کی فیملیز تھیں جو یہاں اس کے پاس موجود تھیں اور وہ ان لوگوں کے درمیان اکیلا اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تم خود سمجھ دار ہو تمہیں ہمارے سمجھانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں ایک ماں ہونے کے ناتے اتنی تسلی ضرور دوں گی کہ بے شک میں نے اپنی کوکھ سے صرف نبیل کو پیدا کیا ہے لیکن میری نظر میں تم میں اور نبیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم میرے لیے نبیل ہی ہو اس لیے کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا مت سمجھنا۔ نبیل اور مدحیہ تمہارے بہن' بھائی ہیں تو میں ماں ہوں تمہاری۔ تم ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں

کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ نہ آج' نہ کل' نہ پھر کبھی۔ ہاں تم اگر ماں سمجھ کر مجھ سے کچھ کہو گے تو مجھے خوشی ہو گی کہ تم نے مجھے پرایا نہیں سمجھا۔" دل آور کے قریب ہی بیٹھی فائزہ بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پہ دل آور محض سر ہلا کے رہ گیا تھا۔

زری اسے اس حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ اس کا دل' اس کا شاہ' دکھی تھا۔ اسے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو خود پہ بڑا ضبط کیے اس کا یہ حال اور اس کا یہ حلیہ برداشت کر رہی تھی ورنہ اس پہ کیا بیت رہی تھی' یہ تو صرف وہ جانتی تھی یا پھر اس کا خدا جانتا تھا۔ کیونکہ دل آور کے اس حال پہ' اس حلیے پہ اور اس دکھ پہ اس کا دل کس طرح کٹ رہا تھا' یہ صرف خدا ہی جان سکتا' ورنہ کسی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں تھی۔

"صاحب! آپ کے لیے فون ہے کسی کا۔" وہ سب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح زلفی پیغام لے کر حاضر ہوا تھا اور دل آور نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کس کا فون ہے؟"

"صاحب! شاید جسٹس احمد کریم نام بتایا ہے انہوں نے' انگلینڈ سے فون کیا ہے۔" زلفی نے نام یاد رکھنے کے لیے ذہن پہ پورا پورا زور ڈالا تھا اور کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے' میں آرہا ہوں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا تھا اور کرسی دھکیل کر آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا' جبکہ زلفی اس سے پہلے ہی واپس پلٹ گیا تھا کیونکہ فون ہولڈ پہ رکھا ہوا تھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں تب تک میں فون کال سن لوں۔"

"ارے نہیں یار! چائے کی ضرورت نہیں ہے تم فون کال سن لو' پھر بات کرتے ہیں۔" عبداللہ نے اسے منع کیا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے' ہمیں بھی اب واپس چلنا چاہیے۔ دل آور بھائی بھی خاصے تھکے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں نے جو بھی بات کرنی ہے کل کر لیجیے گا ابھی مناسب نہیں ہے۔" نگارش نے ان لوگوں کو مزید کوئی بھی بات کرنے سے روک دیا تھا اور عبداللہ' نبیل اور فائزہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ان کی رائے لینا چاہی ہو۔

"ہاں! کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی ہے۔ فی الحال اسے آرام کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" فائزہ بیگم نے بھی نگارش کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر تم لوگ بھی چلنے کی تیاری کرو۔" عبداللہ نے نگارش اور زری کو اشارہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے بیگ وغیرہ اندر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی اندر آگئی تھیں۔ نگارش اس سے آگے تھی۔ اس لیے وہ زری سے پہلے ہی آگے بڑھ کے لاؤنج میں داخل ہو گئی تھی۔

جبکہ نگارش کے پیچھے آنے والی زری کے قدم ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے بے ساختہ ہی وہیں کے وہیں رک گئے تھے۔ کیونکہ اندر سے فون پہ بات کرتے دل آور کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی اور اس کی آواز سن کر زری وہاں سے گزر جاتی۔ یہ بھی تو ایک ناممکن سی ہی بات تھی نا؟ اور دل آور جو انتہائی مختصر سی بات کر رہا تھا چند سیکنڈز بعد بات کو سمیٹتے ہوئے فون بند کر کے اچانک ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا تھا اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے عین سامنے کھڑی زری کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"خیریت؟" دل آور نے ذرا تشویش سے پوچھا تھا۔

"جی' خیریت۔" زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”آپ نے اندر جانا ہے کیا۔“ دل آور نے قدرے الجھ کر استفسار کیا تھا۔
”نہیں۔“ زری نے نفی میں جواب دیا تھا۔
”تو پھر؟“ اب اس کی الجھن اور بھی بڑھ گئی تھی۔
”مجھے بتول آنٹی کے حوالے سے کچھ کہنا تھا۔ مگر اب جب کچھ کہنا چاہ رہی ہوں تو میرے پاس یوں لگ رہا ہے کہ جیسے سارے الفاظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ جیسے کچھ کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ختم ہو گیا ہے۔“ زری واقعی بہت کوشش کر رہی تھی کچھ کہنے کی مگر اس سے کچھ بھی کہا نہیں جا رہا تھا۔
”ہاں یہ تو سچ ہے سب ختم ہو گیا ہے باقی تو کچھ بھی نہیں رہا۔“ وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولا تھا اور اس کے اس انداز پہ زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔
”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ختم ہو گیا ہے؟ اور کیا باقی نہیں رہا کچھ بتانا پسند کریں گے آپ۔“ اب کی بار زری کو الجھن ہوئی تھی اور اس نے دل آور کو سراپا بے چین اور مضطرب سی نظروں سے دیکھا تھا۔
”پلیز راستہ چھوڑیں باہر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ دل آور نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔
”میں بھی سراپا انتظار ہوں وکیل صاحب، آپ کو میرا انتظار نظر کیوں نہیں آتا؟“ زری اس کی سرد مہری پہ بپھر گئی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ مگر وہ ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی نا۔ آخر وہ اس کا اپنا دل تھا۔ چاہے جیسا بھی تھا۔
”پلیز زرین، راستہ چھوڑیں۔“ دل آور نے پھر التجا کی تھی۔
”آپ کا راستہ چھوڑ دوں تو پھر کس کا راستہ لوں وکیل صاحب؟ کوئی تو راستہ دکھائیں؟“ زری اس سے زیادہ بے بس اور نڈھال لگ رہی تھی اور اس کا لہجہ بھی روہانسا سا ہو رہا تھا۔
”زرین! میں نے آج تک آپ سے کبھی کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن آج اگر کچھ کہوں گا تو آپ کو چاہیے کہ آپ میرے اس کہے سے ہی سمجھ جائیں اور میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ”دل آور شاہ مر چکا ہے۔“ بس اور کچھ نہیں۔“ دل آور کے بے تاثر اجنبی اور سفاک لہجے میں کہے گئے اس جملے نے زرین ملک کی روح کھینچ لی تھی اور اس کا کلیجہ جیسے منہ کو آ گیا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے دل آور کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ یہ سب کیا اور کیوں کہہ رہا ہے؟“ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔
”د... ل... آ... و... ر... شا... ہ... مر... چکا... ہے؟“ زری کی زبان بے ربط ہو گئی تھی اور حرف بکھر گئے تھے اور اب وہ یہ سارے حرف جوڑنا بھی چاہتی تو نہیں جوڑ سکتی تھی کیونکہ اس میں سکت ہی نہیں تھی۔
”م... مگر... وکیل صاحب! دل آور شاہ مر چکا ہے تو پھر زری کیوں زندہ ہے؟“ اس نے بڑی دیر بعد کھوئے ہوئے سے لہجے میں پوچھا تھا۔
”میں کچھ نہیں جانتا زرین، میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے، پلیز اب راستہ چھوڑیں۔“ دل آور اس کی سمت دیکھے بنا راہداری کی دوسری سمت دیکھنے لگا تھا جبکہ وہ بری طرح تڑپ اٹھی تھی۔
”راستہ چھوڑ دوں، کیوں وکیل صاحب! کیوں راستہ چھوڑ دوں؟ اک عمر آپ کے راستے میں گزاری ہے وکیل صاحب اور آپ کہہ رہے ہیں کہ راستہ چھوڑ دوں؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ آپ اتنے دنوں سے مجھے اپنے کیوں نہیں لگ رہے؟ مجھے اتنے دنوں سے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ میرے نہیں رہے؟ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ دل آور شاہ نظریں پھیر چکا ہے اور زرین ملک جیتے جی لٹ چکی ہے۔ میں جب جب آپ کو دیکھ رہی ہوں تو مجھے کیوں احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک اجنبی، غیر اور پرائے مرد کو دیکھ رہی ہوں۔ وکیل صاحب میں آپ کو

دیکھوں اور مجھے شرمندگی ہو، ایسا کیوں ہے آخر، کیوں؟ بتائیے مجھے وکیل صاحب، جواب دیجیے مجھے؟“ زری دھواں دھار روتے ہوئے مسلسل ایک ہی تکرار کیے جا رہی تھی اور اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اگر اچانک کوئی اندر آ گیا تو کیا سوچے گا۔
”میں آپ کو اجنبی، غیر اور پرایا لگ نہیں رہا، بلکہ میں ہوں، میں اجنبی بھی ہوں، میں غیر بھی ہوں اور میں پرایا بھی ہوں، آج سے نہیں، بلکہ ازل سے ہوں اور ابد تک ایسا ہی رہوں گا۔ اس لیے آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ دل آور شاہ مر چکا ہے۔“ اس نے اپنے اک اک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر لب بھینچتے ہوئے اس کی اک سائیڈ سے ہو کر گزر گیا تھا اور زری اس کے اس طرح گزر جانے پہ تڑپ تڑپ گئی تھی۔
”وکیل صاحب، یہ کیا کہہ دیا ہے آپ نے؟“ وہ پیچھے سے چیخی تھی، لیکن دل آور راہداری عبور کر کے جا چکا تھا۔
”وکیل صاحب!“ وہ پھر زور سے چیخی تھی۔ مگر تب تک نگارش اس کے قریب آ چکی تھی۔
”زری پلیز! سنبھل جاؤ، بس کرو اب۔“ نگارش کا اپنا لہجہ بھی بھیگ رہا تھا۔ وہ زری کی تڑپ پہ تڑپ جاتی تھی۔
”بھابھی، وہ... وہ... کیا کہہ گیا ہے۔ سنا آپ نے... اس نے... کک کیا کہا ہے؟“ وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے نگارش کا بازو تھام کر باہر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
”ہاں، سن چکی ہوں، سب سن چکی ہوں، اسی لیے تو رو رہی ہوں کہ سب سن لیا ہے۔“ نگارش لاؤنج سے نکل کر ادھر ہی آ رہی تھی، جب ان دونوں کو راہداری میں کھڑے دیکھ کر وہیں کی وہیں رک گئی تھی۔
”بھابھی!“ زری بری طرح روتے ہوئے نگارش کے کندھے سے لگ گئی تھی۔
”نگارش، زری، چلنا نہیں ہے کیا۔“ عبداللہ کی آواز پہ وہ دونوں ہی ٹھٹک گئی تھیں۔
”جی! آ رہے ہیں۔“ نگارش زری کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی اور عبداللہ ان دونوں کو بتول آنٹی کی وجہ سے اداس سمجھ کر چپ چاپ ان کے آگے آگے چل پڑا تھا۔
مگر آج اس گھر سے جاتے ہوئے نہ جانے کیوں زری کا دل رو رہا تھا اور بڑی شدت سے رو رہا تھا۔
نگارش نے اسے بمشکل لا کر گاڑی میں بٹھایا تھا اور عبداللہ نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ نبیل ان سے پہلے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اب بس عبداللہ کی باری تھی اور وہ بھی اک جھٹکے سے گیٹ عبور کر گیا تھا اور گیٹ سے نکلتے ہوئے سامنے ڈرائیو وے پہ کھڑے دل آور کو دیکھ کر گاڑی میں بیٹھی زری گھٹ گھٹ کر رو پڑی تھی۔

کوئی ناز تھا جو رہا نہیں
کوئی خیال تھا جو کہا نہیں
کوئی آرزو تھی دبی دبی
کوئی بوجھ تھا جو ہٹا نہیں
کسی موڑ پر تو وہ ملے مجھے
کوئی موڑ ایسا بنا نہیں

☼ ☼ ☼

وہ سب چلے گئے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اب وہ تھا یا اس کی تنہائی تھی اور اس کی اس تنہائی میں صرف سگریٹوں کا دھواں ہی تھا جو اسے اپنی آغوش میں لپیٹ رہا تھا اور وہ اس دھوئیں میں خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا، کیونکہ انسان کا دل جل رہا ہو تو انسان خود دھواں ہی ہو جاتا ہے اور دل آور کے ساتھ بھی اس وقت ایسا ہی ہو رہا

تھا۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا اور وہ سگریٹ کی طرح بجھ رہا تھا۔ اس کا سورج کی طرح دہکنا اور چراغ کی طرح روشن ہونا بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ اب پیچھے جا کر سب کچھ موڑ کے واپس نہیں لا سکتا تھا۔ کیونکہ اب جو کچھ پیچھے رہ گیا تھا' وہ بس پیچھے ہی رہ گیا تھا۔
بالکل ایسے جیسے زری پیچھے رہ گئی تھی۔
اسے پکارتی رہ گئی تھی۔
اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی طرف سے آنکھیں' کان اور دل بند کر کے وہاں سے چلا آیا تھا اور چھوڑ آیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور عمر بھر کے لیے۔
اب اسے آگے کو سفر کرنا تھا۔ وہ سفر جو اس کی اماں اس کے پاؤں سے باندھ گئی تھیں اور جس سے ہٹنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ اب وہی اس کا سفر تھا اور اب وہی اس کی منزل تھی اور اپنی منزل سے کوئی کب تک دور رہ سکتا ہے آخر' کبھی بھی نہیں۔
اور یہ سچ تھا کہ دل آور اگر سفر تھا تو علیزے اس کی منزل تھی۔
اور علیزے اگر سفر تھی تو دل آور اس کی منزل تھا۔
ان کا تو سفر اور منزل کا ساساتھ تھا۔
جو شروع سے چلا آرہا تھا اور جس نے ہمیشہ رہنا تھا۔
یہ پل دو پل کی دوری بھی کوئی دوری تھی بھلا۔
اس نے پلٹنا تو آخر منزل کی طرف تھا سو وہ پلٹ گیا تھا۔
رات کے تین بجے کا وقت تھا جب وہ آخری سگریٹ اپنے بوٹ تلے مسل کر گہری سانس کھینچتا ہوا لان سے پلٹ کر اندر آگیا تھا۔ گل' گلاب خان اور زلفی تو مہمانوں کے جاتے ہی اپنے اپنے کوارٹرز میں چلے گئے تھے۔ اب بس اسی کے لیے اندرونی مین ڈور کھلا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے اندر آتے ہی مین ڈور بند کر دیا تھا اور قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیے تھے۔
بے شک اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا' لیکن پھر بھی اپنے بیڈ روم کے حوالے سے اس کا ذہن بالکل صاف اور سلیٹ کی مانند تھا۔ کہیں کونے کھدرے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس کے بیڈ روم میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ البتہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوتے ہی وہ یک دم ٹھٹک سا گیا تھا اور اس کا صاف سلیٹ کی مانند ذہن پھر سے طرح طرح کی سوچوں اور طرح طرح کے خیالوں سے بھر گیا تھا۔ لیکن اب اور کتنا سوچتا' تنگ آکر سوچوں اور خیالوں کو ذہن سے جھٹکتا ہوا دروازہ لاک کر کے آگے بڑھ آیا تھا اور صوفے کے قریب آکر قدم رک گئے تھے اور نظریں علیزے پہ ٹھہر گئی تھیں۔
وہ نہ جانے کب یوں ہی صوفے پہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اس کا سر اور بازو دائیں طرف لڑھک چکے تھے۔ نیند گہری تھی اسی لیے اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی بے ترتیب ہوئی پڑی ہے اور دل آور کی نظریں اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی ہیں۔
شاید اسے احساس ہوتا تو وہ یک دم تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔
مگر بات پھر وہی تھی کہ نیند گہری تھی۔
اور اس کی اس گہری نیند کا دل آور کو بھی احساس ہو چکا تھا۔ اسی لیے دو قدم اور بڑھا کے سوئی ہوئی علیزے کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا اور انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کا مرمریں سا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبانے لگا تھا۔ جیسے اسے نرمی سے سہلا رہا ہو اور علیزے اس

سہلانے پہ کسمساسی گئی تھی۔
"علیزے۔" اس کے کسمسانے پہ دل آور نے آہستگی سے اسے پکارا تھا لیکن نیند گہری تھی۔ اس لیے وہ نہ سن سکی تھی اور نہ محسوس کر سکی تھی۔ البتہ دل آور اس کے ہاتھ کے لمس کو بڑے بوجھل دل سے محسوس کر رہا تھا۔
"علیزے۔ بات سنو میری۔ میں تمہارا ہوں۔ سنبھالو مجھے۔ نہیں سنبھالو گی تو پچھتاؤ گی۔ آج وقت ہے تمہارے پاس۔ آج میں تمہاری مٹھی میں ہوں۔ آج مجھے قید کر لو۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ میری ہو جاؤ۔ اور مجھے اپنا کر لو۔ علیزے۔ آج دل آور شاہ کسی کا بھی نہیں تمہارے سوا۔ آج غافل مت رہو۔ جاگ جاؤ علیزے' غفلت کی نیند اچھی نہیں ہوتی۔ آج مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ میرے ساتھ جاگو۔ میرے ساتھ بات کرو۔ میرے سینے پہ ہاتھ رکھو۔ مجھے قرار دو علیزے۔ میں بے سکون ہوں مجھے سکون دو۔ دعا دو مجھے۔ علیزے مجھے دعا دو۔" اس نے انتہائی بوجھل اور گمبھیر آواز میں کہتے ہوئے اپنے دکھ کی شدت اور اپنے رشتے کی عقیدت تک جاتے ہوئے علیزے کا وہی مرمریں سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا اور جہاں اس کے ہونٹوں کی مہر سے علیزے کا وجود معتبر ہوا تھا وہیں علیزے کے ہاتھ کے پاکیزہ لمس سے دل آور شاہ کے ہونٹ بھی معتبر ہو گئے تھے۔
علیزے کا ہاتھ اور دل آور کے ہونٹ ایک دوسرے کو چھو کر جیسے مہک اٹھے تھے۔
کیونکہ یہ ان کا ایک دوسرے کے لیے زندگی کا پہلا لمس تھا۔ جس سے ان کا رشتہ مزید پائیدار ہوا تھا اور ان کی ایک دوسرے پہ مہر لگ گئی تھی۔
ہاں یہ اور بات تھی کہ علیزے اس مہر سے' اس لمس سے اور اس احساس سے انجان تھی' بے خبر تھی۔ وہ اس پہ اپنے حق اور اپنے استحقاق کی پہلی مہر ثبت کر چکا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں تھی۔
اور اس کی اسی بے خبری میں دل آور نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر آہستگی سے اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بے حد احتیاط سے اسے اٹھا لیا تھا اور صوفے سے بیڈ تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ذرا سا جھک کر اسے بیڈ پہ لٹا دیا تھا۔ کیونکہ وہ اتنے دنوں سے صوفے پہ ہی سو رہی تھی لیکن اگر گہرائی سے سوچا جاتا تو وہ آخر کب تک صوفے پہ سو سکتی تھی؟
جب ایک رشتہ بن چکا تھا' سب کچھ قبول کیا جا چکا تھا' تو پھر اس رشتے کی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بھلا کیا قباحت تھی؟ وہ صوفے پہ سوتی یا بیڈ پہ بات تو ایک ہی تھی' رشتہ تو وہی تھا۔ سو وہ بیڈ پہ ہی سوتی تو بہتر تھا کیونکہ بیڈ پہ اب اس کا اور دل آور کا برابر کا حق تھا اور وہ اسے یہ حق خود اپنے ہاتھوں سے سونپ چکا تھا۔ اسے بیڈ پہ لٹا کر کمبل پھیلا کے اس کے اوپر اوڑھا دیا تھا اور خود دوبارہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا راکنگ چیئر تک چلا آیا تھا جہاں پچھلے کئی دنوں سے اس کی کئی راتیں تمام ہو رہی تھیں اور آج کی رات بھی یوں ہی تمام ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

علیزے سو رہی تھی' جب گل کی آواز پہ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بے ساختہ چھت کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی تھی اور خود کو صوفے کے بجائے بیڈ پہ پا کر اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی اور سامنے ہی راکنگ چیئر پہ بیٹھے دل آور پہ نظر پڑی تھی۔ وہ گل کی طرف متوجہ تھا جو اس کے لیے ٹیبل پہ ناشتا لگا رہی تھی' کیونکہ دل آور کو ناشتے کی طلب ہو رہی تھی اور اس نے گل سے کہہ کر ناشتا یہیں منگوا لیا تھا۔ اس لیے اس وقت اس کا دھیان ناشتے کی طرف ہی تھا۔
جبکہ علیزے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی' لیکن گل کی موجودگی کی وجہ سے

اسے تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہی رہنا پڑا تھا۔ جس پہ وہ مزید پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

"ارے علیزے بی بی، آپ اٹھ گئیں۔ کیا آپ کے لیے بھی ناشتا لے آؤں؟" گل واپس پلٹتے ہوئے اسے دیکھ کر رک گئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ نہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔" علیزے نے بے دھیانی میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ فریش ہو جائیں، میں بعد میں ناشتا بنا دوں گی۔" گل علیزے کو صاحب کے بیڈ پہ سوئے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی تھی۔ اسی لیے اب اسے بڑے آرام سے فریش ہونے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں بیڈ روم میں اکیلے رہ گئے تھے۔

علیزے جو اتنی دیر سے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی اب تنہائی ملتے ہی چپ سی ہو گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے اور کیا کہے؟ اک عجیب سی جھجک تھی جو اس سے کچھ کہنے کے آڑے آ رہی تھی اور ایسا شاید پہلی بار ہو رہا تھا۔ ورنہ وہ تو ڈرائیور سے ہر بات بلا جھجک کہہ جاتی تھی۔ شاید پہلے وہ ڈرائیور کو اپنی پراپرٹی سمجھتی تھی اس لیے اور اب وہ خود کو ڈرائیور کی پراپرٹی سمجھ رہی تھی اس لیے اس سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ کچھ پوچھنے کی کوشش کے باوجود بھی اس سے پوچھ نہیں پائی تھی۔

"گڈ مارننگ!" بالآخر دل آور نے ہی بولنے میں پہل کی تھی مگر علیزے نے پھر بھی ۔۔۔ اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"ناشتا کرو گی؟" دل آور بھی آخر بتول شاہ کا ہی بیٹا تھا زندگی نبھانے والا۔

"نہیں۔" اور وہ بڑی حویلی کی بیٹی تھی کچھ بھی نہ سمجھنے والی، سب کچھ ملیامیٹ کر دینے والی۔

"ہوں، میں جانتا ہوں، تم اس وقت کس سوچ پہ ٹھہری ہوئی ہو۔" دل آور نے اک نظر اسے دیکھتے ہوئے کہا اور جوس کا گلاس اٹھا لیا تھا اور ذرا توقف سے گویا ہوا تھا۔

"تم رات کو سو رہی تھیں، تمہیں صوفے سے اٹھا کے بیڈ تک میں لے کر آیا تھا۔" اس نے انتہائی مضبوط اور تحمل آمیز لہجے میں اس کے ان کہے سوال کا جواب دیا تھا، تاکہ وہ الجھتی نہ رہے۔

"مگر میرے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس کے حوالے سے تم مجھے صوفے سے بیڈ تک لے کر آئے ہو؟" علیزے ڈر اور جھجک کے باوجود بھی بالآخر کہہ ہی گئی تھی اور دل آور جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے لگاتے یک دم ٹھہر سا گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا۔" دل آور نے جیسے اس کی بات پہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزے نے وہی بات دوبارہ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ یونہی چپ کی چپ بیٹھی رہی تھی۔

"ہوں! تو تمہارے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس کے حوالے سے میں تمہیں صوفے سے بیڈ تک لے کر جا سکوں؟" اس نے پرسوچ سے انداز میں کہتے ہوئے جوس کا گلاس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ اور آہستگی سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو پھر اتنے دنوں سے تم کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں قیام پذیر ہو؟ کیوں میرے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہ رہی ہو؟ کیوں میرے سامنے میرے لیے ایک تسلی، ایک دلاسا بن کر بیٹھی ہوئی ہو؟ آخر کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے؟" دل آور کو علیزے کی بات بری لگی تھی اور اسے اس بات پہ غصہ بھی آیا تھا۔

"کیوں کہ میری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ ہے۔ مگر تمہاری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ کچھ بھی نہیں ہے اس لیے تو میں پہلے بھی قید تھی اور میں آج بھی قید ہوں۔ بس فرق صرف اتنا آیا ہے کہ وہ بیسمنٹ تھا اور یہ بیڈ روم

ہے۔ وہاں فرش کا بستر تھا یہاں فوم کا بستر ہے۔ وہ سخت تھا یہ نرم ہے۔ کھانا وہاں بھی ملتا تھا کھانا یہاں بھی ملتا ہے۔ میں تب بھی جی رہی تھی، میں اب بھی جی رہی ہوں، تم کل بھی مجھ پہ حاوی تھے، تم آج بھی مجھ پر حاوی ہو۔ اور میں کل بھی تمہارے سامنے بے بس تھی آج بھی بے بس ہوں اور ہمیشہ اسی طرح بے بس ہی رہوں گی۔ میرا وجود، میری ذات اور میرا غرور نہ کل تھے نہ آج ہیں، نہ آئندہ ہوں گے۔" علیزے کہتے ہوئے بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور دل آور جن قدموں پہ کھڑا تھا انہی قدموں پہ دم بخود سا کھڑا رہا تھا۔

تو علیزے کے اندر یہ غبار تھا کہ وہ بیسمنٹ سے نکل کر بیڈ روم میں کیوں قید ہے؟ اور دل آور کو خبر ہی نہیں تھی۔

"یہ تعلق یہ رشتہ تمہارا احسان نہیں ہے مجھ پہ۔ یہ احسان ہے تو صرف تمہاری مما کا جنہوں نے میری عزت کو عزت سمجھا اور مرنے سے پہلے میرا ننگا سر ڈھانپ دیا میری خاطر، میری عزت کی خاطر تمہاری منت کی، منایا تمہیں اس لیے زندگی میں اگر کبھی میں مر کے خاک بھی ہو گئی تو ان کا یہ احسان تب بھی یاد رکھوں گی اور انہیں ہمیشہ دل سے دعا دوں گی مگر تم۔۔۔"

علیزے بولتے ہوئے آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگی تو بے ساختہ اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی اور دل آور باہر کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ "ڈیس کم ان۔۔۔" اس نے ہیئر برش بالوں میں پھیرتے ہوئے آہستگی سے اندر آنے کی اجازت دی تھی اس کے خیال میں انوشہ یا زین ہوں گے، لیکن ان دونوں کی بجائے آذر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر دانیال خود بھی قدرے حیران ہوا تھا۔

"ہیلو، گڈ مارننگ!" آذر نے ہلکے پھلکے سے انداز میں اسے وش کیا تھا۔

"ہوں، سیم ٹو یو!" دانیال ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ ڈال کر اس کی سمت پلٹا تھا۔

"کیسے ہو؟" آذر دانیال کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"اچھا بھلا ہوں، نظر نہیں آ رہا؟" دانیال نے کندھے اچکائے تھے۔

"نظر ہی تو نہیں آ رہا؟" آذر نے کسی اور ہی لہجے میں کہا تھا۔

"کون نظر نہیں آ رہا؟" اس نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دانیال وجاہت علی۔" آذر نے اس کے نام پہ زور دیا تھا۔

"مجھے بھی کہیں نظر نہیں آ رہا، مگر اب ارادہ ہے کہ اسے تلاش کروں کیونکہ جب تک اسے تلاش نہیں کروں گا تب تک اپنی پہچان اور اپنی شناخت نہیں ہو گی اور اس دنیا میں شناخت بہت ضروری ہے۔" دانیال کا لہجہ استہزائیہ سا ہو رہا تھا اور آذر نے اس کا یہ استہزائیہ پن کافی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟" آذر کھٹک چکا تھا۔

"یار! ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا ہی آپ سے کچھ کہے۔ کبھی کبھی انسان کا اپنا آپ ہی اس سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔" دانیال نے سر جھٹکا تھا۔

"انسان کا اپنا آپ بھی اس سے بے وجہ کچھ نہیں کہتا اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اس لیے تم بتاؤ کہ تمہارے ایسا کہنے کے پیچھے کیا وجہ ہے آخر؟ اور ویسے بھی تم دو روز سے کہیں بھی نظر نہیں آ رہے نہ گھر

میں نہ آفس میں اور موبائل بھی آف مل رہا ہے۔ خیریت تو ہے نا؟"
آذر کو بھی دو دن سے تشویش ہو رہی تھی اسی لیے وہ آج صبح صبح ہی اس کی خبر لینے کے لیے انیکسی میں چلا آیا تھا۔

"ہاں یار! سب خیریت ہے۔ تم پریشان مت ہو اور یہ بتاؤ کہ آج ادھر کا رستہ کیسے بھول گئے؟" دانیال نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

"تمہارا پتا کرنے کے لیے آیا تھا کہ تمہیں کیا ٹینشن ہے؟ کیوں کترائے کترائے سے پھر رہے ہو؟ آخر ہوا کیا ہے؟ تم کچھ بتا کیوں نہیں رہے؟" آذر نے کافی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔

"ارے یار! مجھے چھوڑو۔ مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہی کچھ ہوا ہے تم اپنی کہو آخر تم کومل کے ہو ہی گئے نا؟ کومل تو بہت خوش ہوگی آج کل؟" دانیال نے بڑی خوش اسلوبی سے بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

"دانیال!" آذر اسے دیکھ کے رہ گیا تھا۔

"تو کیا کچھ غلط کہہ رہا ہوں میں؟" دانیال نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"تم صحیح بھی تو نہیں کہہ رہے نا!" اب کی بار آذر نے سر جھٹکا تھا۔

"وہ کیسے؟" اس نے آذر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"وہ ایسے کہ میں اپنے بڑوں کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوں، مجھے ان کے دونوں فیصلے ہی پسند نہیں آئے، نہ مجھے اپنے لیے کومل پسند ہے اور نہ مجھے حرمت کے لیے احمد پسند ہے، میں نے ان سے کچھ سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے ابھی کچھ بھی فائنل نہیں ہوا۔ بات ابھی میرے اختیار میں ہے۔" آذر نے بڑے سکون سے اسے آگاہ کیا تھا اور دانیال ٹھٹک سا گیا تھا اسے آذر کی بات پہ حیرت ہوئی تھی۔

"کیوں؟ تمہیں یہ دونوں فیصلے کیوں پسند نہیں آئے؟"

"کیوں کہ حرمت کے لیے مجھے دانیال وجاہت علی پسند ہے اور اپنی بہن کا ہاتھ میں اسی کے ہاتھ میں دینا چاہوں گا، اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں یہ کرکے ہی رہوں گا۔" آذر نے اچانک اسے اپنی پسند اور اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور دانیال جیسے دم بخود سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا وہ دانیال کے سامنے بیٹھ کر اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا اس لیے دانیال کے لیے تو واقعی یہ ششدر رہ جانے والی ہی بات تھی۔

"مگر آذر!" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ بس میں نے جو سوچ رکھا ہے، میں وہی کروں گا۔ البتہ تمہارے ذہن میں کوئی اعتراض ہے تو تم مجھے بتا سکتے ہو۔ جھجکنے کی اور ہچکچانے کی ضرورت نہیں ہے اور رہی بات کومل کی اور میری تو اس کے بارے میں ابھی میں سوچوں گا تو ہی کوئی فیصلہ کروں گا فی الحال ایک ہی فیصلہ کیا ہے اور وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔" آذر کہہ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"لیکن آذر! وہ سب تو بات طے کر..." دانیال نے پھر بولنے کی کوشش کی تھی، مگر آذر نے ٹوک دیا تھا۔

"جو میں طے کر چکا ہوں، تم اس کی فکر کرو، باقی سب کو چھوڑو، مجھے کوئی پروا نہیں ہے، یہ میرا مسئلہ ہے میں ہینڈل کرلوں گا۔ بس تم خوش رہو اور اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھو، میں ہر میدان میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ملک وجاہت علی کے بیٹے ہو تو عائشہ آفندی کے بھی بیٹے ہو اور بہت اہم ہو ہمارے لیے۔" آذر نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا اور پھر اس کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

جبکہ دانیال ہنوز حیران پریشان سا کھڑا اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ آذر نے اس کے کچھ کہنے کے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی سب کچھ تو وہ خود ہی طے کر گیا تھا تو گویا آذر بھی میرے دل کی بات

سے باخبر تھا...؟
حالانکہ میں نے کبھی کسی کو کچھ محسوس تو نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی... پھر بھی... ممی بھی جان گئیں اور آذر بھی...؟ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتا ہوا پرفیوم اسپرے کرکے خود بھی بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زلفی...!" دل آور کی آواز پہ زلفی جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

"جی صاحب جی... !حکم...؟"

"گل کہاں ہے؟"

"جی... !وہ تو کوارٹر میں ہے شاید۔" زلفی نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا تھا کہ گل کہاں ہے آخر؟

"اچھا ٹھیک ہے! پھر تم ہی چلے جاؤ۔" دل آور نے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کہاں صاحب جی؟" زلفی نے استفسار کیا تھا۔

"اوپر بیڈ روم میں! علیزے بی بی سے کہو صاحب نیچے بلا رہے ہیں۔" دل آور نے اسے پیغام دیا تھا۔

"بس اتنا ہی کہنا ہے؟" زلفی جاتے جاتے رک گیا تھا۔

"ہوں! اتنا ہی کہنا ہے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا اور زلفی خوشی خوشی پلٹ کر اوپر چلا آیا تھا۔
مگر صاحب کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دیتے ہوئے بے چارے کا دل دھڑک گیا تھا آخر اتنی خوب صورت لڑکی کے سامنے جانا بھی تو آسان نہیں تھا نا؟

ہاں یہ الگ بات تھی کہ اندر سے اس کی دستک کا کوئی بھی ریسپانس موصول نہیں ہوا تھا۔ جس کے بعد اس نے دوبارہ دستک دی تھی، مگر پھر بھی اندر سے چپ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ تب مجبوراً زلفی نے ذرا سا دروازہ دھکیل کر اندر جھانکا تھا اور وہ دلکش سی حسینہ اسے بیڈ پہ بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی اس لیے زلفی سارا دروازہ دھکیل کر اندر آگیا تھا۔

"سلام بی بی جی!" اس نے بڑے اچھے طریقے سے سلام عرض کیا تھا۔
مگر علیزے نے اسے سرخ روئی روئی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کہا تھا۔

"سوری بی بی جی، میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ وہ دراصل مجھے صاحب جی نے بھیجا ہے، وہ آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔" زلفی اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ غلط وقت پر آیا ہے۔ اسی لیے اس نے فوراً معذرت بھی کرلی تھی۔

"کیوں؟ کیوں بلایا ہے نیچے؟" علیزے کی آواز بھی خاصی بھیگی ہوئی تھی۔

"جی! یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیوں بلایا ہے، مگر ان کے بلانے کے انداز سے لگتا ہے کہ کسی کام سے ہی بلایا ہے۔" زلفی نے دل آور کے سنجیدہ اور بے لچک سے انداز کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا تھا اور علیزے اس کی بات سن کر انکار میں جواب دیتے دیتے رک گئی تھی۔

"ہوں! ٹھیک ہے، تم جاؤ میں آرہی ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور پھر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"جی بہتر!" زلفی سر خم کرکے کہتا ہوا پلٹ کر باہر نکل آیا تھا اور اس کے پیچھے ہی دو چار منٹ کے وقفے سے علیزے بھی نیچے آگئی تھی، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا علیزے ڈرائنگ روم میں آکر رک گئی تھی البتہ زبان سے کچھ نہیں کہا تھا، مگر دیکھ سوالیہ نظروں سے رہی تھی۔

"چادر لے لو اور میرے ساتھ چلو۔" وہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"کیوں؟ کہاں جانا ہے؟" علیزے کا سوال بے ساختہ سا تھا۔
"مارکیٹ جانا ہے۔" دل آور بھی مختصر سے جواب دے رہا تھا۔
"مگر کس لیے؟" علیزے کو مارکیٹ کا سن کر حیرانی ہوئی تھی۔
"تمہاری شاپنگ کے لیے۔" دل آور نے آہستہ سے کہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی اس نے یکدم سر اٹھا کر دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا، مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا نجانے ان دونوں کو کیا ہوا تھا کہ وہ صبح سے اک دوسرے سے اجنبی اور کھنچے کھنچے سے نظر آرہے تھے۔
"میری شاپنگ کے لیے؟" اس نے آہستگی سے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔
"ہوں! تمہاری شاپنگ کے لیے۔ تم چادر لے کر آؤ میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھا تھا۔
"مگر مجھے کسی بھی شاپنگ کی اور کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے کچھ نہیں لینا، مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔ میں جیسی ہوں، جہاں ہوں، بس ٹھیک ہوں، تم میری فکر مت کرو۔" علیزے نے دبے دبے لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا اور علیزے کی بات پہ اس کے قدم رک گئے تھے وہ جاتے جاتے دوبارہ اس کی سمت پلٹا تھا۔
"تمہاری فکر میرا فرض بن چکا ہے مسز علیزے شاہ! اور یہ فرض بنانے والی تم خود ہو یہ رشتہ تمہاری ڈیمانڈ تھا اب اگر ڈیمانڈ پوری ہوئی ہے تو رونا دھونا کس بات کا ہے؟ مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کسی قسم کے عہد و پیمان کا چکر تھا کہ جس کے پورا نہ ہونے پہ ہمیں کوئی افسوس یا رنج ہوگا، بلکہ ہمارا تعلق تو مجبوری کا تعلق ہے جسے اب تم نے بھی نبھانا ہے اور میں نے بھی نبھانا ہے۔ چاہے اس کو نبھانے میں ہمارے دل پہ کچھ بھی گزرے.... الزام ایک دوسرے کو نہیں دینا۔ بس نبھانا ہے ہر صورت اور ہر حال میں نبھانا ہے، نہ تم شکوہ کرو نہ میں شکوہ کرتا ہوں بس جیسے چل رہا ہے ویسے چلنے دو البتہ جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے لیکن آج کے بعد میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اس تعلق کو اور اس رشتے کو اچھے طریقے سے اور پوری ایمان داری سے نبھا سکوں کیونکہ مجھے اس تعلق اور رشتے میں میری ماں نے باندھا ہے اور اس لحاظ سے میں اس رشتے کا ہمیشہ احترام کروں گا اور ہمیشہ عزت بھی دوں گا۔ زندگی کے ہر مقام پہ اور زندگی کے ہر موڑ پہ، اس معاملے میں تم کبھی بھی مجھے پیچھے نہیں پاؤ گی۔ جو تمہارا حق ہے اور جو تمہارا مقام ہے وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ البتہ اس معاملے میں تمہاری کیا سوچ ہے اور کیا نظریہ ہے یہ میں نہیں جانتا مگر پھر بھی باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں پندرہ منٹ کا ٹائم ہے آنا چاہو تو آجاؤ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، میری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔" وہ اسے سب کچھ صاف صاف سنا کر اک جھٹکے سے پلٹا اور باہر نکل گیا تھا اور پیچھے کھڑی علیزے گم سم سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اب عروج پر ہے تمہارا موسم خزاں میں تم کو خرید لیں گے
مانگو گے ہم سے رحم کی طلب، نہ تم کو مہلت مزید دیں گے
وفا کی لالچ میں ہم نے صدیوں سے خون اپنا سکھا دیا ہے
فریب و مستی کے بدلے تم کو سزا بھی سن لو شدید دیں گے

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد علیزے چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی اور اسے گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اسے وہ دن یاد آگیا تھا جب وہ پہلی بار بڑی حویلی کے کوریڈور سے نکل کر باہر آئی تھی اور وہ اسی طرح اس کی گاڑی کے قریب کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔
مگر کوئی علیزے کے دل سے پوچھتا کہ تب اور اب میں کتنا فرق تھا اور اس نے تب اور اب کے درمیان کیا کچھ جھیلا تھا؟
"دروازہ کھلا ہے آیئے بی بی جی" گلاب خان نے مداخلت کرتے ہوئے ان دونوں کو ہی چونکا دیا تھا کیوں کہ دل آور بھی اسی خیال میں پیچھے چلا گیا تھا جس خیال کے تحت علیزے کے قدم ذرا فاصلے پہ ہی رک کے رہ گئے تھے اور وہ چاہ کر بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔
مگر گلاب خان انہیں حال میں کھینچ لایا تھا اور وہ سر جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور گلاب خان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔
"آیئے صاحب جی۔! بی بی جی انتظار کر رہی ہیں۔" گلاب خان نے اسے بھی متوجہ کیا تھا اور دل آور گہری سانس کھینچ کر اپنی سوچوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی پھر گلاب خان نے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا اور دل آور گاڑی نکال کر روڈ پہ لے آیا تھا۔
البتہ اس کا دھیان علیزے کی طرف ہی تھا۔ یعنی وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس نے بھی "نبھانا" ہی ہے....؟
اس نے اک نظر اپنے برابر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی علیزے کو دیکھا اور پھر نجانے کیوں لب بھینچتے ہوئے جیب سے موبائل نکال کر عبداللہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا اور دوسری طرف عبداللہ نے فوری کال ریسیو کی تھی۔
"السلام علیکم! کیسے ہو عبداللہ" دل آور کے لہجے میں بے پناہ ٹھہراؤ اور بے پناہ صبر کی جھلک نظر آرہی تھی۔
"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ خیریت سے ہو نا؟" عبداللہ کو اس کی فکر تھی۔
"ہاں! خیریت سے ہوں تم لوگ آج آئے کیوں نہیں؟" دل آور اپنے مطلب کی بات کرنا چاہ رہا تھا۔
"بس! آج سوچا کہ تم ریسٹ کر لو ہم کل مل لیں گے۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔
"کل نہیں! آج ملنا ہے تم اور نبیل شام کو میری طرف آرہے ہو وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ..." دل آور نے ملنے پہ زور دیا تھا۔
"کیوں؟ خیریت؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" عبداللہ کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔
"ہاں! سب ٹھیک ہے، بس تم لوگوں کو کسی سے ملوانا ہے آج..." دل آور تو جیسے بلا کا پر سکون نظر آرہا تھا جبکہ اس کے برابر بیٹھی علیزے بری طرح چونک گئی تھی اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔
"واقعی کسی سے ملوانا ہے کیا؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔
"ہاں! واقعی ملوانا ہے کسی سے، تم بھابھی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آجانا میں نبیل کو بھی کہہ دیتا ہوں اوکے؟" دل آور نے بات سمیٹی تھی۔
"ہوں! اوکے۔" عبداللہ نے پر سوچ سے انداز میں کہا تھا اور پھر فون بند ہو گیا تھا جبکہ علیزے ابھی بھی اسے کچھ حیران اور کچھ بے یقین نظروں سے دیکھ رہی تھی، مگر وہ اس سے بے نیاز اب نبیل کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔
(باقی آئندہ)

☆ ☆

انیلا کرن علی

گھڑی کی سوئیاں بارہ کا ہندسہ کراس کر چکی تھیں۔ گھر کے سب لوگ بڑے سے صحن میں پیڈسٹل فین لگائے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ صرف ایک مصباح تھی جو صحن میں لگے اپنے بستر کے بجائے کمرے میں بچھی چٹائی پر بیٹھی تھی اور بے حد انہماک اور توجہ سے کاٹن کی ہلکے سبز اور گلابی کنٹراسٹ کی قمیص سلائی کر رہی تھی۔

اسے ہر صورت صبح سات بجے تک یہ قمیص ثانیہ کے گھر پہنچانا تھی۔ ثانیہ لڑکیوں کے کالج میں لیکچرر تھی اور صبح اس کے کالج میں کوئی فنکشن ہو رہا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے اسے یہ سوٹ پہننا تھا۔ جو وہ مصباح کو دے تو تین دن پہلے گئی تھی مگر وہ خالہ رشیدہ کی بیٹی کے جہیز کے کپڑوں کی سلائی میں اتنی مصروف رہی تھی کہ اسے ثانیہ کے سوٹ کی طرف دیکھنے کا بھی وقت نہیں ملا۔ آج شام کو ہی اس نے خالہ رشیدہ کی بیٹی کے تمام سوٹ مکمل کر کے ان کے حوالے کیے تھے اور بغیر آرام کیے ثانیہ کا سوٹ لے کر بیٹھ گئی تھی۔ ثانیہ نے ہمیشہ کی طرح ایک نیا اور منفرد ڈیزائن ایک میگزین سے پسند کر کے اسے دیا تھا جو جتنا خوب صورت تھا، اتنا ہی پیچیدہ اور محنت طلب بھی تھا مگر مصباح وقت کی کمی کے باوجود اسے انکار نہیں کر پائی تھی۔ کیونکہ ثانیہ جب سے شادی ہو کر ان کے محلے میں آئی تھی۔ اسی سے کپڑے سلوا رہی تھی بے حد ملنسار اور خوش مزاج ثانیہ سے اب تو اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ اسی لیے عام طور پر مصباح اس کے کام کو ترجیح دیا کرتی تھی اور انکار تو وہ کسی کو بھی نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق یہ گھر آئے رزق کو ٹھکرانے والی بات تھی۔ اس لیے وہ خود بے آرام ہونا قبول کر لیتی تھی۔ مگر کسی کا بھی کام پکڑنے سے انکار نہیں کرتی تھی۔

ان کے معاشی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ابا کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور اس کے اکلوتے بھائی عرفان کی تعلیم واجبی سی تھی۔ اس لیے اسے جاب بھی واجبی سی ہی ملی تھی۔ صرف عرفان کی کمائی سے گھر کا خرچ چلانا بہت مشکل تھا۔ اس لیے مصباح جان توڑ محنت کرتی تھی۔ تاکہ گھر کے اخراجات بھی آسانی سے پورے ہوں اور اماں اپنی خواہش کے مطابق ان تینوں بہنوں کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرتی رہیں۔ پھر وہ ضد کر کے اپنی دونوں بہنوں کو کالج میں پڑھا رہی تھی اور ان کا تعلیم اور کالج کا تمام خرچ خود برداشت کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی طرح اس کی دونوں بہنیں بھی کم عمر میں ہی مشقت کی چکی میں پسنا شروع ہو جائیں۔

خود اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر میٹرک میں اچھے نمبر لینے کے باوجود گھر کی مالی حالت کی وجہ سے وہ آگے نہیں پڑھ سکی تھی اور اسے سلائی سیکھ کر مشین کے آگے بیٹھنا پڑا۔ مگر وہ اپنی بہنوں کے لیے ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے برعکس اس کی خواہش تھی کہ اس کی بہنیں تعلیم حاصل کر کے معاشرے میں کوئی اچھا مقام حاصل کریں۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اسے اضافی محنت کرنا پڑتی تھی۔ ویسے اس کی آمدن اچھی تھی۔ کیونکہ وہ بہت محنت اور لگن سے کام کیا کرتی تھی اور اس کے ہاتھ میں صفائی بھی بہت تھی۔ اس لیے اس کے پاس ہر وقت کام کا ڈھیر لگا رہتا تھا اور وہ ہر وقت مصروف نظر آیا کرتی تھی۔

"مصباح! ابھی کتنا کام باقی ہے۔ بس کرو باقی کا صبح کر لینا۔ اب آ کر سو جاؤ۔"

اماں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے برابر بچھی اس کی چارپائی خالی دیکھ کر غنودگی کے عالم میں اسے پکارا تھا۔

"بس اماں! تھوڑا سا کام ہی رہ گیا ہے۔"

قمیص کے دامن پر پائپنگ کرتے ہوئے اس نے ذرا سا سر اٹھا کر اماں کی تسلی کروائی اور دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"مصباح! کھانا کھا لو!"

اماں نے سالن کی پلیٹ اور تازہ روٹی اس کے

قریب رکھتے ہوئے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کاسنی رنگ کے بے حد قیمتی اور خوب صورت فراک کی سلائی میں اتنی مگن تھی کہ اس نے سر بھی اوپر نہیں اٹھایا۔ بس اماں کے دلاسے کے لیے ذرا سی گردن ہلادی تھی۔

"میں ذرا کونے والی عابدہ کے گھر جارہی ہوں۔ نئی کمیٹی کی پرچیاں کھلنی ہیں ذرا دیر لگ جائے گی۔"

چند منٹ کے بعد اماں دوبارہ کمرے سے نکل کر آئی تھیں اور انہوں نے چادر اوڑھتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ اس مرتبہ اس نے سر اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا اور اچھا کہہ کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کاسنی رنگ کا یہ قیمتی فراک خصوصی توجہ کا متقاضی تھا۔ جو اسے آج شام تک مکمل کرکے دینا تھا۔ کیونکہ پچھلی گلی والی یاسمین نے اگلے روز یہ فراک اپنی منگنی پر پہننا تھا۔

بہت دیر کے بعد اس کا ارتکاز عرفان کی آواز سے ٹوٹا۔ وہ ابھی ابھی کام سے واپس آیا تھا اور گھر میں کسی کو بھی موجود نہ پاکر اس نے مصباح سے ہی سوال کرلیا تھا۔ ورنہ عام حالات میں وہ اسے مخاطب کرنے سے گریز ہی کرتا تھا۔ وہ مصباح سے تین سال بڑا تھا۔ مگر ان دونوں میں اوپر تلے والے بہن بھائیوں والی بے تکلفی بالکل نہیں تھی۔ مصباح کے خود سے زیادہ کمانے کی وجہ سے عرفان کے اندر اس کے معاملے میں ایک عجیب سا احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا۔ جس کو مصباح کے ہروقت مصروف رہنے اور عرفان کا کوئی بھی کام نہ کرنے نے مزید ہوا دی تھی۔

اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہ نہ تو باقی دونوں بہنوں کی طرح عرفان کے آگے پیچھے پھرتی تھی اور نہ ہی اس کے باہر سے آنے پر باقی بہنوں کی طرح اس سے چائے یا کھانے کا پوچھ پاتی تھی۔ اس کے دماغ پر ہروقت اتنے کام سوار رہتے تھے کہ اسے ان چیزوں کا دھیان ہی نہیں آتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے عرفان کو مختصراً اماں کے بارے میں بتایا اور دوبارہ سے اپنے کام میں منہمک ہوگئی۔ عرفان بھی اس کا جواب سن کر خاموشی سے اندر چلا گیا۔

چند منٹ کے بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آیا تو مصباح بہت توجہ سے فراک کی ترپائی کررہی تھی۔ عرفان کا منہ بن گیا۔ وہ سارا دن کام کرنے کے بعد گھر لوٹا تھا اور اس کی بہن کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس سے کھانے کا ہی پوچھ لیتی۔ اسے مصباح پر بے طرح غصہ آنے لگا۔ مگر اس پر غصہ کرتے ہوئے عرفان نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ جس کا اپنا کھانا پاس پڑے پڑے ٹھنڈا ہوگیا ہو۔ وہ کسی اور سے کھانے کے بارے میں کیا پوچھے گی۔

عرفان نے اس کے قریب چٹائی پر پڑا ہوا تکیہ اٹھایا اور قدرے فاصلے پر پڑی چارپائی پر جاکر لیٹ گیا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ صحن میں مکمل طور پر سناٹا چھا گیا تھا۔ جسے عرفان نے اپنے اندر کی کھولن اور مصباح نے اپنی مصروفیت میں بالکل بھی محسوس نہیں کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد جب مصباح سے چھوٹی دونوں بہنیں سیڑھیاں اترتی دکھائی دیں تو اس سناٹے میں چہل پہل پیدا ہوگئی۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں۔

مصباح سے چھوٹی سلمیٰ سیکنڈ ایئر میں تھی اور سب سے چھوٹی ارم فرسٹ ایئر میں۔ دونوں کو ہی پڑھنے کا کچھ خاص شوق نہیں تھا۔ مگر کالج جانا دونوں کو ہی بہت اچھا لگتا تھا۔ خاص طور پر سلمیٰ کو۔ وہ کالج سے کبھی ایک چھٹی بھی نہیں کرتی تھی۔ اپنے گھر کی بور رنگ اور ٹھہری ہوئی زندگی سے اس کی جان جاتی تھی۔

"بھائی! کھانا لے آؤں؟"

عرفان پر نظر پڑتے ہی سلمیٰ نے پوچھا تھا۔ عرفان نے آنکھوں پر رکھا ہوا بازو ہٹا کر اسے دیکھا اور مصباح کو سنانے کے لیے دانستہ اونچی آواز میں بولا۔

"ہاں بھئی لے آؤ' میرا تو بھوک سے برا حال ہے۔"

اس نے مصباح کو سنانا چاہا تھا مگر وہ ان کی طرف متوجہ ہی کب تھی جو اسے پتا چلتا۔

"باجی! کھانا نہیں کھانا تو اٹھالوں؟"

چھوٹے سے کچن کی طرف جاتے ہوئے اس نے مصباح کے قریب رکھے سالن اور روٹی کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ہاں اٹھالو۔"

مصباح نے اپنی مصروفیت میں اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔ اس لیے وہ ان ناگوار تاثرات کو بھی نوٹ نہیں کرسکی جو اس کے قریب سے کھانا اٹھاتے ہوئے سلمیٰ کے چہرے پر چھائے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہاں تم نے باکس پلیٹ ڈالنے ہیں اور ان کے درمیان سیدھی پٹی لگانی ہے اور اس پٹی پر سرخ بٹن۔"

مصباح کو اپنے نئے سوٹ کا ڈیزائن سمجھاتے سمجھاتے ثانیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ وہ چونک سی گئی کیونکہ مصباح کا ہاتھ کافی گرم ہورہا تھا۔

"ارے تمہیں تو بخار ہے۔"

مصباح کی کلائی تھامتے ہوئے اس نے تشویش سے کہا تھا۔ مصباح پھیکے سے انداز سے مسکرادی۔

"ہاں تھوڑا سا ہے۔" اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔ مگر ثانیہ کی تشویش میں کمی نہیں ہوئی۔

"تھوڑا سا نہیں ہے۔ اچھا خاصا ہے۔ چھوڑو یہ سب کچھ اور آرام کرو۔ میں تمہیں فون پر ڈیزائن سمجھادوں گی یا دوبارہ آجاؤں گی۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ گول مول کرکے شاپر میں ٹھونسا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ثانیہ تم ڈیزائن سمجھاؤ۔"

مصباح نے اسے ادھر ادھر پھیلے سارے کپڑے عجلت بھرے انداز سے سمیٹتے دیکھ کر کمزور سا احتجاج کیا تھا۔

"کوئی ٹھیک نہیں ہو تم۔ اچھا خاصا بخار ہے تمہیں اور تمہیں آرام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مگر تم نے تو خود کو ایک مشین بنایا ہوا ہے۔ ہروقت کام' ہر وقت کام۔ بندہ کبھی تھوڑا سا آرام ہی کرلیتا ہے۔ کہیں گھوم پھر آتا ہے۔ ٹی وی دیکھ لیتا ہے۔ مگر تم نے تو بالکل ہی حد کی ہوئی ہے مصباح! اس طرح کام کروگی تو خود کو ختم کرلوگی۔"

ثانیہ نے اسے بری طرح سے لتاڑا تھا۔

"کام نہ کروں تو کیا کروں؟" وہ زچ ہو کر بولی تھی۔ "مہنگائی دیکھو کتنی بڑھ گئی ہے اور تمہیں پتا ہے ہمارے حالات کیسے ہیں۔ عرفان بھائی کی تنخواہ سے تو گھر کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ پھر سلمیٰ اور ارم کے تعلیمی اخراجات ہیں' اماں کی کمیٹیاں ہیں۔ خاندان میں سو طرح کا دینا دلانا ہوتا ہے۔ میں کام نہیں کروں گی تو یہ سب کیسے ہوگا؟"

"یہ سب باتیں ٹھیک ہیں مصباح! مگر تم انسان ہو' خود کو مشین مت بناؤ۔ اپنے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ اٹھاتے اٹھاتے تھک جاؤ۔ آرام کرنا اور تھوڑی بہت تفریح کرنا تمہارا بھی حق ہے۔ مگر تم تو عید والے دن بھی سلائی مشین کے آگے ہی بیٹھی ملتی ہو۔"

نرمی سے سمجھاتے سمجھاتے ثانیہ کے انداز میں ایک بار پھر خفگی در آئی تھی۔ مصباح کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"تم کیا سمجھتی ہو' میں شوق سے ہروقت سلائی مشین کے آگے بیٹھی رہتی ہوں۔ میرا دل آرام کرنے کو نہیں چاہتا۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح تفریح اور فیشن نہیں کرنا چاہتی؟ ایسا نہیں ہے ثانیہ! میں بھی وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ جو میری عمر کی دوسری لڑکیاں کرتی ہیں۔ مگر میں ایسا کر نہیں سکتی۔ اگر میں اپنے لیے آرام ڈھونڈوں گی تو میری بہنوں کو بھی میری طرح سلائی مشین کے آگے بیٹھنا پڑے گا اور میں ایسا نہیں چاہتی' میں انہیں خود سے بہتر زندگی دینا چاہتی ہوں۔"

وہ آزردہ ہورہی تھی۔ ثانیہ نے بے اختیار ہی دلاسا دینے والے انداز سے اس کا ہاتھ تھپکا اور محبت سے بولی۔

"میں تمہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کررہی مصباح! میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ تھوڑا اعتدال سے کام لو اور اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جتنا اٹھا کر تم آسانی سے

زندگی کا راستہ طے کر سکو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے حصے کا بوجھ خود پر لاد کر تم خود تھک کر گر جاؤ اور باقی لوگ تمہیں روندتے ہوئے زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جائیں۔"

اس نے آج بالآخر مصباح سے وہ ساری باتیں کہہ دی تھیں جو وہ بڑے دنوں سے بتانا چاہ رہی تھی۔ اپنی انصاف پسند طبیعت کے باعث اسے پہلے دن سے ہی یہ بات کھلتی تھی کی مصباح خود سارا وقت محنت کرتی رہے اور اس کی بہنیں صرف اس لیے آرام کی زندگی گزاریں کہ وہ اس سے چھوٹی ہیں اور مصباح انہیں زندگی کی سختیوں سے بچانا چاہتی ہے۔

ثانیہ نے یہ بات، بہت شروع میں محسوس کرلی تھی کہ مصباح کے دن رات مشین بنے رہنے کے باوجود اس کی بہنوں کو اس کی قربانیوں کا کوئی احساس نہیں ہے۔ اگر ان کو احساس ہوتا تو وہ کبھی تو اپنی بہن کا ہاتھ بٹانے اور اسے آرام فراہم کرنے کی کوشش کرتیں۔ مگر ایسی کوئی کوشش کرنا تو در کنار وہ کبھی اس کی معمولی سی احسان مند بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ بلکہ الٹا ان دونوں اور مصباح کے درمیان ایک نامحسوس سا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اکٹھی کالج جاتی تھیں۔ گھر میں بھی ان کا زیادہ وقت ایک ساتھ ہی گزرا کرتا تھا اور ان دونوں کی دلچسپیاں بھی مشترکہ تھیں۔ اس لیے دونوں میں ہی گاڑھی چھنتی تھی اور اپنی اس دوستی میں ان دونوں نے کبھی مصباح کو شریک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دونوں اس کے پاس اس وقت آکر بیٹھتی تھیں جب انہیں اس سے کوئی اضافی رقم چاہیے ہوتی یا کسی نئے سوٹ کی فرمائش کرنا ہوتی تھی۔ پتا نہیں مصباح کو یہ سب محسوس ہوتا بھی تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسی چیزوں کو اگنور کر دیا کرتی تھی۔ مگر ثانیہ کو یہ سب بہت کھلتا تھا۔ اس لیے آج اس نے موقع دیکھ کر ڈھکے چھپے انداز سے مصباح کو سمجھانے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ اس کی باتیں سن کر مصباح کچھ بولی تو نہیں تھی۔ مگر سوچ میں ضرور پڑ گئی تھی۔ طبیعت کی خرابی نے ویسے بھی اسے کافی زود رنج بنایا ہوا تھا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ مگر مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کروں۔" کافی دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ بے دلی سے بولی تھی۔ ثانیہ مسکرا دی۔ اس کے لیے اتنا بہت تھا کہ مصباح اس نہج پر سوچنے لگی تھی۔

"فی الحال تم یہ کرو کہ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ میں آنٹی سے کہتی ہوں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔"

مصباح کا بازو پکڑ کر اس نے زبردستی اسے چٹائی سے اٹھایا اور اس کی امی کو بلانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

پتا نہیں ثانیہ کے سمجھانے کا اثر تھا یا مصباح تھک ہی زیادہ گئی تھی کہ اگلا پورا ہفتہ اس نے بالکل کام نہیں کیا۔ جن لوگوں کو اس ہفتے کے دوران اس نے کام مکمل کر کے دینا تھا۔ انہیں اپنی بیماری کا بتا کر معذرت کرلی اور چونکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ ہی وقت پر کام مکمل کر کے دیتی رہی تھی۔ اس لیے اس بار دیر ہونے پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اس ہفتے کے دوران اس نے کوئی نیا کام پکڑا بھی نہیں اور اگر کسی نے زیادہ ہی اصرار کیا تو اس نے کام تو پکڑ لیا۔ مگر کپڑے واپس کرنے کی تاریخ اپنی مرضی اور سہولت کی دی اور اسے حیرت ہوئی تھی کہ کسی نے بھی اصرار نہیں کیا کہ اسے پہلے کی طرح دو دن کے اندر اندر اپنا کام تیار چاہیے۔

اس ایک ہفتے کے دوران اس نے خوب آرام کیا۔ ٹی وی ڈرامے دیکھے۔ اماں کے ساتھ کچن کے کاموں میں ہاتھ بٹایا اور بازار جا کر اپنے لیے لان کے نئے سوٹ بھی لے کر آئی۔ ورنہ اس سے پہلے وقت کی کمی کے باعث وہ بازار جا ہی نہیں پاتی تھی اور عموماً" اماں یا بہنیں ہی اس کے لیے کپڑے لے آیا کرتی تھیں۔ جو عموماً" وقت کی کمی کے باعث سلنے کے لیے کئی کئی ہفتے یوں ہی پڑے رہا کرتے تھے اور بیچ میں اکثر اوقات کوئی نہ کوئی سوٹ اس کی بہنیں منت سماجت کر کے اپنے لیے سلوا لیا کرتی تھیں۔ اس بار بھی سلمٰی نے اس کے بازار سے آتے ہی گلابی رنگ کا وہ سوٹ اس سے مانگ لیا تھا۔ جو اس کے کپڑوں میں سب سے مہنگا اور خوب صورت تھا اور اس نے بہت شوق سے خریدا تھا۔ پہلے والی بات ہوتی تو شاید وہ سلمٰی کو اس کے اصرار پر یہ سوٹ دے ہی ڈالتی۔ مگر اس بار ایک تو وہ خود جا کر شوق سے یہ سوٹ لائی تھی اور دوسرے اس نے اس سوٹ کے لیے ایک نیا اور اچھوتا ڈیزائن بھی سوچ لیا تھا۔ اس لیے سلمٰی کے بے حد اصرار کرنے پر بھی اس نے وہ سوٹ اسے دینے سے انکار کر دیا۔

"ٹھیک ہے نہ دیں۔ آپ کماتی جو ہیں۔ اس لیے اپنے لیے اتنا مہنگا سوٹ خرید لیا ہے۔ ہمارے لیے تو کبھی سات، آٹھ سو سے آگے نہیں بڑھیں اور اپنے لیے ڈھائی ہزار کا سوٹ خرید لیا ہے۔"

اپنا اصرار بے کار جاتے دیکھ کر وہ طعنوں پر اتر آئی تھی۔ مصباح کو دلی افسوس ہوا۔ اس نے پہلی بار اپنے دل کی مان کر اگر ایک مہنگا سوٹ اپنے لیے خرید لیا تو اس کی بہن فوراً" اسے جتانے کھڑی ہو گئی تھی اور جب وہ پرانے بدرنگے کپڑے پہن کر سارا سارا دن سلائی مشین کے آگے بیٹھی رہتی تھی اور اپنی محنت کی کمائی بے دریغ ان دونوں پر لٹاتی تھی تو اس کی بہنوں نے کبھی جھوٹے منہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے لیے بھی ویسی ہی چیزیں خریدا کرے جیسی ان دونوں کے لیے لیتی ہے۔

مصباح کا دل بے حد برا ہو رہا تھا۔ اس نے گلابی سوٹ تہ کر کے شاپر میں ڈالا اور اپنے ٹرنک میں رکھ دیا۔ سلمٰی کی باتوں نے اس کے شوق پر پانی پھیر دیا تھا۔ اب اس کا یہ سوٹ سلائی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ سلمٰی کو بھی اپنا یہ سوٹ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے فی الحال اس نے یہ سوٹ سنبھال کر رکھ دیا اور خود سلائی مشین کے آگے جا بیٹھی۔ اس کی عیاشی کا ہفتہ گزر چکا تھا۔ اب اسے ایک بار پھر مشقت کی چکی میں پسنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مصباح کہاں ہے؟"

ثانیہ آج بڑے دنوں کے بعد آئی تھی اور مصباح کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا سلمٰی سے ہو گیا تھا۔ وہ سلمٰی کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اسے وہ بڑی مغرور اور اکھڑ سی لگتی تھی۔ اس لیے ثانیہ اس سے کم ہی مخاطب ہوا کرتی تھی۔ مگر آج سامنے کوئی اور نظر نہیں آیا تو اس نے سلمٰی سے ہی پوچھ لیا۔

"اندر کمرے میں لیٹی ہوں گی۔ انہوں نے کہاں جانا ہے؟"

سلمٰی کے انداز میں نخوت تھی اور بڑی بہن کے لیے محبت اور احترام کے جذبات بالکل مفقود تھے۔ فیروزی اور سفید کنٹراسٹ کا لان کا خوب صورت سا سوٹ پہنے ہلکا سا میک اپ کیے وہ کہیں سے بھی مصباح کی بہن نہیں لگ رہی تھی۔ وہ شاید کہیں باہر جا رہی تھی۔ اس لیے ثانیہ کی بات کا جواب دے کر بغیر رکے مورنی کی سی چال چلتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ثانیہ نے غصے سے سر جھٹکا اور اندرونی کمرے کا رخ کیا۔ گھر میں شاید مصباح کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"مصباح! تم کدھر ہو؟"

کشادہ صحن کو عبور کرنے کے بعد اس نے آواز دی تو مصباح جو سر تک چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ثانیہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شاید وہ روتی رہی تھی۔

"مصباح! کیا ہوا تمہیں؟"

اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ثانیہ نے پریشانی سے پوچھا تھا۔ مصباح نے نفی میں سر ہلایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی "کچھ بھی نہیں۔"

ساتھ ہی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ثانیہ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"تم رو کیوں رہی ہو مصباح! سب ٹھیک تو ہے نا؟"

اس نے بے اختیار ہی روتی ہوئی مصباح کو اپنے ساتھ لگا لیا۔
"کچھ ٹھیک نہیں ہے ثانیہ! کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
مصباح کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ ثانیہ نے اسے کھل کر رونے دیا۔ بس نرمی سے اس کا سر تھپکتی رہی۔ کچھ دیر روتے رہنے کے بعد مصباح خود ہی چپ کر گئی اور سیدھی ہو کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ ثانیہ اٹھ کر گئی اور اس کے لیے پانی لے آئی۔
"اب بتاؤ کیا ہوا ہے۔ کیوں اس طرح رو رہی ہو۔ تم اتنی نازک تو نہیں ہو کہ کسی چھوٹی بات پر یوں رو۔"
مصباح کے ہاتھ سے خالی گلاس لے کر ثانیہ نے اس کے قریب بیٹھ کر سوال کیا تھا۔ مصباح چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔
"بات تو شاید اتنی بڑی نہیں ہے۔ مگر مجھے بہت بڑی لگ رہی ہے۔ تم شاید ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ مجھے دوسروں کے بوجھ خود پر نہیں لادنے چاہئیں۔ ورنہ کل کو یہی لوگ مجھے روند کر آگے نکل جائیں گے۔"
"ہوا کیا ہے' کچھ بتاؤ تو سہی۔" ثانیہ جلد از جلد اس کے رونے کا سبب جان لینا چاہتی تھی۔
"میرے لیے ایک رشتہ آیا تھا تین دن پہلے۔ مگر وہ لوگ میری بجائے سلمیٰ کو پسند کر گئے۔"
مصباح نے نظریں جھکاتے ہوئے بتایا۔
"اوہ۔" ثانیہ کے منہ سے اسی قدر نکل سکا تھا۔
"مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ انہوں نے میری بجائے سلمیٰ کو کیوں پسند کر لیا۔ یہ تو اب بہت عام سی بات بن چکی ہے۔ افسوس تو مجھے سلمیٰ پر ہو رہا ہے۔ اس نے اس بات پر بہت ہنگامہ کیا ہے کہ اماں نے ان لوگوں کو سلمیٰ کا رشتہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کیوں کیا کہ وہ بڑی سے پہلے چھوٹی بیٹی کا رشتہ نہیں کریں گی۔ اس نے یہ تک کہہ دیا کہ اگر باجی کی شادی ساری عمر نہ ہوئی تو کیا وہ بھی کنواری بیٹھی رہے گی اور بھی کئی باتیں کیں اس نے جنہیں دہرانے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

مصباح کی آنکھوں میں دوبارہ سے آنسو آگئے۔ ثانیہ کو اس کے آنسوؤں نے تکلیف پہنچائی تھی۔ مگر اسے سلمیٰ کے رویے پر کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے بہت پہلے سے سلمیٰ کی خود غرضی اور خود پرستی کا اندازہ ہو چکا تھا۔
"اب رونے سے کیا حاصل ہوگا مصباح! تم نے بھی تو بغیر سوچے سمجھے خود کو مشقت کی بھٹی میں جھونکے رکھا۔ صرف یہ سوچ کر کہ تمہاری بہنیں آرام سے رہیں۔ تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اگر تم تینوں اپنے اپنے حصے کا کام کرو گی تو سب کو آرام بھی ملے گا اور مسائل بھی آسانی سے ختم ہوں گے۔ مگر تمہارے ذہن میں تو پتا نہیں کیسے یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ تم خود کو فنا کر کے اپنی بہنوں کو ضرورت سے زیادہ آرام دو گی تو کوئی بہت اعلا مثال قائم کرو گی۔ تم سلمیٰ اور ارم سے صرف چند برس بڑی ان کی بہن ہو۔ ان کی ماں نہیں ہو۔ جس نے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں دیکھ لی ہوں اور اب اپنی بیٹیوں کی خوشیوں پر اپنے سکھ قربان کر رہی ہو۔ آنکھیں کھولو مصباح! حقیقت کو سمجھو۔ زندگی کی خوشیوں پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے' جتنا سلمیٰ اور ارم کا' جتنا میرا اور جتنا باقی سب کا۔ تم اگر آج اپنا من مار کر اپنی بہنوں کو اضافی آرام دے بھی دو گی تو کل تمہارے دامن میں صرف پچھتاوے رہ جائیں گے۔ نہ تمہاری بہنیں تمہاری قربانیوں کو یاد رکھیں گی اور نہ ہی یہ معاشرہ تمہیں کسی ایوارڈ سے نوازے گا۔ تم' ارم اور سلمیٰ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے۔ اگر اس گھر کا کوئی مسئلہ ہے تو وہ تم سب کا ہے۔ صرف تمہارا نہیں ہے۔ اگر تم کام کر سکتی ہو تو تمہاری بہنیں بھی کر سکتی ہیں۔ پڑھائی کاموں کو روکتی تو نہیں۔ وہ اگر کالج سے آکر تھوڑی دیر بھی کام کر لیں تو اپنی پڑھائی کے اخراجات خود اٹھا سکتی ہیں۔ اس طرح تمہارا بوجھ بھی کم ہوگا اور تم خود پر توجہ بھی دے سکو گی۔"
ثانیہ غصے سے بول رہی تھی اور مصباح سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ خاموش ہوئی تو مدھم آواز میں مصباح نے کہا۔

"اماں نے تو مجھ سے کئی بار کہا کہ میں ارم اور سلمیٰ کو اپنے ساتھ بٹھاؤں۔ تاکہ ہم تینوں مل جل کر کام کریں۔ مگر میں ہی نہیں مانی' شاید میں نے غلط ہی کیا۔"
اس کے لہجے میں ملال کے سارے رنگ تھے۔
"شاید نہیں ہم نے یقیناً غلط کیا ہے۔"
ثانیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔
"تم دیکھو تو سہی' تم نے اپنے ساتھ کیا کیا ہے۔ سارا سارا دن مشین کے آگے بیٹھے رہنے سے تمہارا فگر خراب ہو گیا ہے۔ چہرے پر ہر وقت مردنی چھائی رہتی ہے۔ تم دیکھنے میں سلمیٰ سے دس برس بڑی لگتی ہو۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تمہیں کچھ خبر نہیں ہے۔ گھر کے کاموں کے لیے تمہیں وقت نہیں ملتا۔ کل کو تمہاری شادی ہو گئی تو تمہارا شوہر تم سے کھانا مانگے گا' اپنے کپڑے تم سے نہیں سلوائے گا۔"
ثانیہ نے بہت غصے سے کہا تھا۔ مگر مصباح کی ہنسی نکل گئی۔
"ہاں ہنس لو' ہنس لو' پھر تکیے میں منہ دیے روتی رہنا۔" وہ اس کے ہنسنے سے چڑی تھی۔ مصباح سنجیدہ ہو گئی۔
"تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں ثانیہ۔۔۔ مگر مجھے یہ بھی تو بتاؤ کہ میں کروں کیا۔ کیسے سب کچھ ٹھیک کروں۔" اس نے گویا بے بسی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ثانیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔
"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تمہیں میں جیسا کہتی ہوں تم ویسا ہی کرو۔"
وہ جوش کے عالم میں کھسک کر مصباح کے قریب آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ میں نے ہر صورت تھرڈ ائیر میں داخلہ لینا ہے۔ میری سب دوستوں نے فارم بھی جمع کروا دیے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"
سلمیٰ نے پچھلے ایک گھنٹے میں کوئی دسویں بار وہی راگ الاپا تھا۔ اماں بری طرح سے چڑ گئیں۔
"میں نے کہہ دیا نا۔ میرے پاس فالتو رقم نہیں ہے۔ تم اس سال سلائی سیکھو' کچھ روپے جمع کرو' پھر اگر دل چاہے تو اگلے سال داخلہ لے لینا اور اب اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔"
کریلے چھیلتی ہوئی اماں خود بھی بے حد کڑوی ہو رہی تھیں۔ سلمیٰ روہانسی ہو گئی۔
"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مجھے بی اے کروائیں گی۔ پھر اب آپ کیوں مکر رہی ہیں؟"
اس نے ڈھٹائی سے مصباح کا فرمان اماں کے کھاتے میں ڈالا۔ مگر نہ تو اماں نے ہی اس کے کہے کا کوئی اثر لیا اور نہ ہی پاس بیٹھی مصباح نے توجہ دی۔ جو سلائی مشین کے آگے بیٹھی اپنا گلابی سوٹ بے حد توجہ اور لگن سے سی رہی تھی۔ کبھی وہ سلمیٰ اور ارم کی تعلیم کی سب سے بڑی حامی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب یوں کان لپیٹے بیٹھی تھی جیسے اماں اور سلمیٰ کسی ایسی زبان میں گفتگو کر رہی ہوں جو اس کے لیے قطعی اجنبی ہو۔ پچھلے چند ہفتوں سے اس میں بہت ساری تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اس نے سلائی کا کام لینا بہت کم کر دیا تھا۔ اب وہ صبح نو بجے سے لے کر دوپہر ایک بجے تک ہی کام کرتی تھی۔ ایک بجے اماں کے ساتھ کچن میں جا گھستی اور کھانا پکانے کا زیادہ تر کام وہی کیا کرتی تھی۔ ثانیہ نے اسے ایف اے کا کورس لا دیا تھا اور وہ بہت لگن اور محنت سے شام تک اپنی پڑھائی کو وقت دینے لگی تھی۔ سلمیٰ اور ارم کے برعکس اسے پڑھنے کا کافی شوق ہوا کرتا تھا۔ مگر گھر کی معاشی حالت کی وجہ سے اسے میٹرک کے بعد سلائی سیکھ کر کام کرنا پڑا تھا۔ اپنی زندگی کی اس کمی کی وجہ سے وہ اپنی بہنوں کو پڑھانے کی متمنی رہی تھی۔
اب ثانیہ کے سمجھانے پر اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑ لیا تھا۔ کئی سالوں تک پڑھائی سے دور رہنے کی وجہ سے اسے وقت تو بہت پیش آ رہی تھی۔ اوپر سے سلمیٰ کے طنزیہ جملے بھی اس کا دل برا کرتے رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ بہت محنت سے پڑھ رہی تھی۔ انگلش پڑھنے کے لیے وہ شام کو کچھ وقت کے لیے ثانیہ کے گھر جاتی تھی۔ رات کے

کھانے کے بعد چھت پر لمبی واک کرتی اور اپنے بے جان بالوں کو کسی خاص قسم کے تیل سے پالش کرنے کے بعد مہنگے شیمپو سے سر دھونے لگی تھی۔ تین بار وہ ثانیہ کے ساتھ پارلر جا چکی تھی اور اس کے ساتھ بازار جا کر کئی قسم کی کریمیں اور لوشن بھی خرید کر لائی تھی۔ خود پر بھرپور توجہ دینے سے اس کی شخصیت میں کئی نمایاں تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ جو سب کی سب مثبت تھیں۔

سلمیٰ یہ سب کچھ دیکھ کر اندر سے کڑھتی تھی۔ مگر مصباح کو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اسے اماں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ جن کو ثانیہ نے نہ جانے کیا پٹی پڑھائی تھی کہ وہ مصباح کو اتنا کام بھی نہیں پکڑنے دیتی تھیں جتنا وہ خود پکڑنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھنے لگی تھیں اور اسے روز اپنے لباس کا خیال رکھنے کی بھی تاکید کرنے لگی تھیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے سلمیٰ کو مصباح سے چڑ ہونے لگی تھی۔ اس نے پچھلے کئی دنوں سے مصباح سے بات چیت بند کی ہوئی تھی۔ مگر مصباح نے اس کی ناراضی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ نہ مانیں، میں عرفان بھائی سے بات کرتی ہوں۔" اماں کی طرف سے مکمل مایوس ہو کر سلمیٰ نے اپنی طرف سے ترپ کا پتا پھینکا تھا۔ عرفان کے سب سے زیادہ آگے پیچھے وہی پھرا کرتی تھی۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات نہیں ٹالے گا۔

"ہاں، ہاں جاؤ عرفان سے بات کرو، وہ ضرور ہی تمہیں کالج میں پڑھائے گا۔ جو تمہارے کالج کے دو سالوں میں دس بار مجھے طعنہ دے چکا ہے کہ میں تمہیں پڑھا کر روپے ضائع کرتی ہوں اور اوپر سے تمہارا رزلٹ۔ مر کر تو تم پاس ہوئی ہو۔ اگر اسی طرح تم نے روپیٹ کر بی اے کر بھی لیا تو کون سا مجسٹریٹ لگ جاؤ گی۔ اس لیے اچھا ہے کوئی ہنر سیکھ لو۔ کل کو تمہارے کام آئے گا۔"

اماں نے چمک کر کہا تھا۔ سلمیٰ ڈھیلی پڑ گئی۔

"مگر اماں! آپ یہ بھی تو دیکھیں نا کہ اگر میں پورا سال کچھ نہیں پڑھوں گی تو اگلے سال تک مجھے سب کچھ بھول چکا ہوگا۔ کتنی مشکل پیش آئے گی۔ پھر مجھے۔ اماں پلیز مان جائیں نا۔" لڑائی جھگڑے سے مایوس ہو کر اب وہ منتوں، ترلوں پر اتر آئی تھی۔ مگر اماں پر ابھی بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کیوں مشکل پیش آئے گی۔ مصباح بھی تو اتنے سالوں کے بعد پڑھ رہی ہے اور اگر تم ایک سال کا وقفہ نہیں کرنا چاہتیں تو پرائیوٹ بی اے کر لو۔" دوٹوک انداز سے کہہ کر وہ سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔ سلمیٰ بری طرح سے جل گئی۔

"ہونہہ مصباح! یہ سارا کیا دھرا انہی کا تو ہے۔ میں بھی دیکھوں گی کیسے پاس ہوتی ہیں۔ ارادہ کرنا اور بات ہے مگر پڑھائی اتنی بھی آسان نہیں ہے۔"

وہ غصے سے بڑبڑائی تھی۔ مصباح نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی۔ مگر بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی اپنا کام کرتی رہی۔ سلمیٰ کچھ دیر غصے سے اس کو گھورتی رہی۔ پھر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

سہ پہر کا وقت تھا۔ جب عرفان نے گھر میں قدم رکھا۔ صحن کا منظر روزمرہ والا تھا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ نیم کے گھنے درخت کی چھاؤں میں بچھی چٹائی پر سلمیٰ سلائی مشین کے آگے بیٹھی بہت توجہ اور انہماک سے اپنا کام کر رہی تھی اور بے حد مصروف نظر آ رہی تھی۔ اب سلائی میں اس کا ہاتھ کافی صاف ہو گیا تھا اور اسے اچھا خاصا کام بھی ملنے لگا تھا۔ اپنی کمائی کے روپے ہاتھ میں آنے لگے تو اسے اس کام میں مزا بھی آنے لگا تھا۔ اس لیے اب وہ بہت شوق اور دلچسپی سے یہ کام کرتی تھی۔ بلکہ سلائی کے ساتھ ساتھ وہ کپڑوں کی ڈیزائننگ بھی خود ہی کرنے لگی تھی۔ فیشن کی سمجھ بوجھ اسے مصباح سے زیادہ تھی۔ اس لیے سلائی میں مصباح جیسی تیزی اور مہارت نہ ہونے کے باوجود اسے کافی مل جاتا تھا۔ مصباح کے ساتھ اس کے تعلقات اب کافی اچھے ہو چکے تھے۔

ابتدا میں اس نے کافی دنوں تک مصباح سے بول

چال بند رکھی۔ مگر آخر کب تک اسے کام سیکھنا تو مصباح سے ہی تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مصباح کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا تھا۔ مصباح نے البتہ اس کے شروع کے روکھے پھیکے رویے کے باوجود اسے کام سکھانے میں کسی طرح کی ڈنڈی نہیں ماری تھی اور پورے خلوص اور لگن سے اسے سب کچھ سکھایا تھا۔ بلکہ اب بھی کوئی مشکل ڈیزائن ہوتا یا سلمٰی کو کوئی کام جلدی مکمل کرکے دینا ہوتا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اپنی تمام تر مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی مدد کر دیا کرتی تھی۔

سلمٰی کی دیکھا دیکھی ارم نے بھی سلائی سیکھنا شروع کر دی تھی۔ وہ پڑھائی میں سلمٰی سے بھی گئی گزری تھی۔ اس لیے فرسٹ ایئر میں دو سپلیاں لے کر وہ صرف ڈیڑھ ماہ مزید کالج گئی تھی اور پرائیویٹ امتحان دینے کا کہہ کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ ویسے بھی سلمٰی کے بغیر اس کا کالج میں دل نہیں لگتا تھا اور جب سے سلمٰی کمانے لگی تھی۔ اس کے پاس پیسے دیکھ کر اس کا دل بھی کام کرنے کو چاہنے لگا تھا۔ اس لیے اب وہ تینوں بہنیں مل کر کام کرتی تھیں۔ ان کے نا صرف معاشی حالات پہلے سے اچھے ہو چکے تھے بلکہ ماحول میں بھی دوستانہ رنگ نظر آنے لگا تھا۔

"اماں کہاں ہیں؟"

صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے عرفان نے سلمٰی سے پوچھا تھا۔

"ساتھ والوں کے گھر قرآن خوانی میں گئی ہیں۔"

وہ بغیر سر اٹھائے مصروفیت بھرے انداز میں بولی تھی۔ عرفان ایک پل کے لیے ٹھٹکا۔ یہ وہی سلمٰی تھی جو ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی اور اب اس کے پاس اکلوتے بھائی سے کھانا یا پانی پوچھنا تو درکنار اس سے بات کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ پہلی بار اسے مصباح اپنے اس رویے میں حق بجانب دکھائی دی۔ جو وہ اپنے شدید مصروفیت کے دنوں میں روا رکھتی تھی۔

"بھائی آپ آگئے، کھانا لے آؤں۔"

عرفان کی آواز سن کر مصباح کچن سے نکل کر آئی تھی۔ سرخ لان کے صاف ستھرے شلوار سوٹ میں اس کی گندمی رنگت دمک رہی تھی۔ چمک دار براؤن بال سلیقے سے چوٹی کی شکل میں گندھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر نرمی اور اپنائیت کا تاثر تھا جو عرفان کو بہت بھلا لگا۔ اسے بے اختیار ہی مصباح پر پیار آنے لگا۔

"ہاں لے آؤ، میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔"

اس نے شاید پہلی بار مصباح سے اتنی نرمی سے بات کی تھی۔

مصباح کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئی۔ "سلمٰی! اپنا کام کچھ دیر کے لیے ایک طرف رکھ دو۔ میں کھانا لا رہی ہوں۔ پہلے کھانا کھالو، پھر باقی کا کام کرنا۔"

جاتے جاتے وہ سلمٰی کو ہدایت دینا نہیں بھولی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سلمٰی بھی اس کے والی غلطی دہرائے اور خود کو ایک مشین بنالے۔ اس لیے وہ سلمٰی کو اکثر تنبیہہ کرتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی بہنیں کام کرنے کے ساتھ اپنا خیال بھی رکھتی تھیں اور آرام اور تفریح کے لیے کچھ وقت بچاتی تھیں۔ اگلے مرحلے میں اس کا ارادہ انہیں تعلیم کی طرف مائل کرنے کا تھا۔ وہ ابھی بھی اپنی اس خواہش سے دستبردار نہیں ہوئی تھی کہ اس کی بہنیں کم از کم بی اے تک تعلیم ضرور حاصل کریں۔ اگرچہ ابھی ان دونوں کو اس طرف مائل کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ اب ان دونوں کی ترجیحات بدل گئی تھیں۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی انہیں ضرور اس طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

☼ ☼ ☼

مصباح کا ایف اے کا رزلٹ آیا تھا۔ اپنی شبانہ روز محنت لگن اور ثانیہ کی توجہ سے وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھی۔ ثانیہ نے اس کا رزلٹ نیٹ پر دیکھا تو اسے بے ساختہ خوشی نے گھیر لیا۔ کافی اچھے پیپرز دینے کے باوجود مصباح کو یقین نہیں تھا کہ وہ پاس ہو جائے گی اور اپنی تمام تر امیدوں کے باوجود ثانیہ کے ذہن پر بھی اس کی مایوسی کا اثر پڑا تھا۔ اس لیے اس کا رزلٹ دیکھ کر ثانیہ کو کچھ زیادہ ہی خوشی ہوئی۔ اس نے نیٹ پر رزلٹ دیکھا تھا اور اسی وقت مصباح کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ حالانکہ اس وقت شام رات سے گلے ملنے والی تھی۔ مگر نہ تو وہ صبح تک انتظار کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی فون پر مصباح کو یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی۔ اس لیے اسی وقت مصباح کے گھر جا پہنچی۔

مصباح کے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے ایک رونق اور چہل پہل کا احساس ہوا۔ چاروں ماں بیٹیاں ایک ہی کمرے میں بیٹھی تھیں اور ان کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی! سب لوگ بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔"

اس نے بجی سنوری مصباح کو بغور دیکھتے ہوئے شوخی سے پوچھا، جو کاہی سبز رنگ کے خوب صورت سوٹ میں ملبوس بہت دلکش لگ رہی تھی۔ ثانیہ کی بات سن کر اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔

"باجی کی بات پکی ہو گئی ہے۔ اگلے جمعہ منگنی ہے۔"

سلمٰی نے چہک کر اسے بتایا تھا۔

"واقعی؟ بہت بہت مبارک ہو بھئی۔"

اس نے بے اختیار ہی مصباح کو گلے لگایا تھا۔

"بس بیٹا! ابھی کچھ دیر پہلے ہی فائنل ہوا ہے۔ لڑکا اور خاندان، بہت شریف اور اچھے لوگ ہیں۔"

مصباح کی امی اپنے قریب اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولیں۔ مصباح شرمائی اور چائے بنانے کا کہہ کر باہر نکل گئی، ثانیہ اس کے انداز پر مسکرا دی اور اس کی امی سے رشتے کی تفصیلات پوچھنے لگی۔ ارم اور سلمٰی وہیں ایک طرف بیٹھی مصباح کی شادی پر بنائے جانے والے اپنے کپڑوں پر تبادلہ خیالات کر رہی تھیں۔ ہر طرف رونق اور خوشی کا بے حد خوشگوار احساس پھیلا ہوا تھا وہ کچھ دیر اندر بیٹھی پھر مصباح کے پاس کچن میں چلی آئی۔ وہ چائے بنا چکی تھی اور اب کپوں میں انڈیل رہی تھی۔ ثانیہ کو دیکھ کر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی جس نے اس کے دلکشی کو مزید بڑھا دیا۔ ثانیہ نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری اور مسکرا کر بولی۔

"میں بھی تمہارے لیے ایک خوش خبری لائی ہوں۔"

اس نے سسپنس پھیلانے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا وہ کیا؟"

مصباح نے ذرا سا سر اٹھا کر دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ" "وہ ایک لمحے کے لیے رکی تھی" "تم نے ایف اے پاس کر لیا ہے۔"

"سچی؟" مصباح کے ہاتھ سے چھلنی چھوٹ گئی۔ "تم سچ کہہ رہی ہو ثانیہ۔" وہ بے یقینی اور خوشی کے جذبات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"بالکل" ثانیہ محبت سے مسکرائی۔

"اور اب تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم شادی کی خوشی میں پڑھائی نہیں چھوڑو گی اور کم از کم بی اے ضرور کرو گی۔"

"ان شاء اللہ ضرور کروں گی۔ ثانیہ! تمہارا بہت شکریہ میری زندگی میں یہ ساری خوشیاں تمہاری ہی بدولت آئی ہیں۔"

اس نے محبت اور شکر گزاری کے جذبات سے مغلوب ہو کر ثانیہ کا ہاتھ تھاما تھا۔

"میری وجہ سے کچھ نہیں ہوا مصباح! یہ سب تو تم نے اپنی محنت لگن اور خلوص سے حاصل کیا ہے۔ میں نے تو صرف تمہیں اعتدال اور توازن کا راستہ دکھایا تھا۔ تمہاری کوشش اور امید تھی جو بہار تمہارے گلشن میں خوشیوں کا سندیسہ لے کر آئی۔"

ثانیہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپکا۔ مصباح گم سم سی کھڑی اس کی بات سنتی رہی۔

"چلو! اب چائے اٹھاؤ۔ اندر جا کر باقی سب کو بھی خوش خبری سناتے ہیں۔"

ثانیہ نے بشاشت بھرے انداز سے اسے ٹوکا مصباح ذرا سا چونکی اور نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے چائے والی ٹرے کی طرف مڑ گئی۔

☼ ☼

سحر ساجد

طاقتِ پرواز

مکمل ناول

وہ پارک میں رکھے لکڑی کے بینچ پہ بیٹھی اس طرح آئس کریم کھا رہی تھی جیسے کہ ساتھ بیٹھے شخص سے زیادہ اہمیت اس آئس کریم کپ کی تھی اور وہ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اسے اب غصہ آرہا ہوگا وہ اس کی خفا نظریں اپنے چہرے پہ محسوس کرسکتی تھی مگر اس کے آئس کریم کھانے میں فرق نہیں آیا تھا۔

وہ ہنوز اسی توجہ سے آئس کریم کھاتی رہی اور اس شخص کے لیے اس کی لاپروائی قائم تھی۔

"ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کہ تم یہاں آئس کریم کھانے ہی تو آئی ہو۔" اس نے علی کی غصہ بھری جھنجلائی آواز سنی۔ بالآخر وہ بول پڑا تھا اپنی بے ساختہ ہنسی کو چھپانے کے لیے اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے رخ بدلا تھا۔

"آپ یہاں مجھے آئس کریم کھلانے ہی تو لائے تھے۔ دادا سے یہی کہا تھا آپ نے۔۔۔" اس کے چہرے پہ ایسی مسکراہٹ تھی جیسی کسی کو چھیڑنے کے لیے ہوتی ہے۔

"ہاں مگر۔۔۔" وہ اور جھنجلایا تھا۔

"مگر کیا؟ اب میں جس کام کے لیے خصوصی طور پر گھر سے آئی ہوں۔۔۔ وہی نہ کروں۔" وہ اب بھی اسے دیکھ نہیں رہی تھی اور اپنے سابقہ کام میں بڑی مستقل مزاجی سے مصروف تھی۔

پھر اس نے اپنے چہرے پہ علی کی نظروں کی جو تپش محسوس کی تھی۔ وہ احساس غصہ یا جھنجلاہٹ کا نہیں تھا۔ لگا وہ اسے سنجیدہ نظروں سے گھور رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ سر اٹھا کر علی کو دیکھتی اس نے علی کا ہاتھ اپنے کپ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تھا اور۔۔۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ ڈسٹ بن میں تھا۔

"آ۔۔۔" اس کا منہ کھلا اور اس نے حیران ہو کر علی کو دیکھا تھا اور اب علی کے چہرے پہ بڑی محظوظ ہوتی مسکراہٹ تھی۔

"تمہارے اور میرے درمیان جو بھی ایسی چیز آئی جسے تم نے مجھ سے زیادہ اہم سمجھا اس کا یہی حال ہوگا۔" اس نے۔ انگلی سے ڈسٹ بن کی طرف اشارہ کیا تھا۔ عائشہ نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا تھا۔

"پھر دادا سے کیوں کہا کہ آئس کریم کھلانے لے کر جانا ہے۔۔۔ سیدھا سیدھا یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ مجھے عائشہ کے ساتھ جانا ہے۔" وہ اب خفگی سے بول رہی تھی۔

"کیا؟ اب میں تمہارے دادا سے یہ کہتا محترم میرا رومینس کا موڈ ہو رہا ہے تو میں اپنی منکوحہ کے ساتھ باہر جانا چاہتا ہوں۔"

"تو کہہ دیتے۔۔۔ میرے دادا بہت لبرل ہیں، وہ مجھے اپنے محرم رشتے کے ساتھ جانے سے ذرا بھی نہ روکتے۔"

"وہ اتنے بھی لبرل نہیں ہیں۔۔۔ اس بات پہ یقیناً" مجھے اٹھا کر ڈرائنگ روم سے باہر پھنکوا دیتے۔"

"آپ کہہ کر دیکھ لیتے۔"

اس کے اس جواب پہ علی خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔۔۔ مگر محترمہ جانتی ہیں میں جھوٹ نہ بولتا تمہیں میری ذرا بھی پروا نہیں" ہے عائشہ" بڑے افسوس کے ساتھ اسے آگاہ کیا گیا تھا اپنا اسکارف صحیح کرتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

"زندگی میں، میں نے دو ہی مردوں کی پروا کی ہے جن میں دادا کے بعد دوسرے تم ہو اور تم کہتے ہو کہ مجھے تمہاری پروا نہیں۔" اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر جھکایا تھا اور علی اسے دوپٹہ مراقبے میں جاتا دیکھ کر بے ساختہ جھنجلایا تھا۔

وہ بہت کم بولتی تھی آج غنیمت تھی کہ اس نے چار باتیں کرلی تھیں ورنہ علی تو خود کو دنیا کا بے وقوف ترین آدمی مانتا تھا تب جب وہ اس کے ساتھ ہوتا تھا اور تب جب وہ بول رہا ہوتا۔۔۔ کیونکہ وہ تو ہمیشہ خاموش ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"انرجی کی کتنی فارمز (Forms) ہوتی ہیں عائشہ؟" سونے سے پہلے دادا نے اچانک پوچھا تھا۔

اور وہ سمجھی تھی کہ وہ اسے کل ٹیسٹ کا ریوائز کروانے کے لیے پوچھ رہے ہیں۔

"تھرمل' پوٹینشل' کیمیکل' ساؤنڈ' الیکٹریکل انرجی اور ___" وہ انگلیوں کی پوروں پہ گنتے ہوئے شروع ہو چکی تھی۔ دادا مسکرا کر اسے دیکھتے رہے۔ وہ دس سال کی بچی انہیں بے حد عزیز تھی۔

"بس ___ ہو گئیں کاؤنٹ سب؟" انہوں نے پوچھا۔

"میری ٹیچر نے اتنی ہی لکھوائی تھیں۔"

وہ ذرا کنفیوژن سے بولی تھی۔ دادا کے انداز سے اسے لگا تھا کہ جیسے وہ کچھ مس کر گئی تھی۔ "ہاں! تمہاری ٹیچر نے جو لکھوایا ___ وہ تم نے بتا دیا مگر تمہیں معلوم ہے کہ انرجی کی ایک اور فارم بھی ہوتی ہے جسے کوئی ٹیچر لکھواتا ہے ___ نہ بتاتا ___ وہ صرف ایک ___ محترم ہستی نے ہی بتائی تھی وہ بھی چودہ سو سال پہلے ___ تب جب انرجی کی کوئی بھی فارم ابھی دریافت نہیں ہوئی تھی۔

ہم سائنس پڑھتے ہیں ___ اسے اپلائی بھی کرتے ہیں مگر ہم اسلام پڑھتے ہیں نہ اسے اپلائی کرتے ہیں یا پھر شاید ابھی ہم اسلامک باتوں کو سائنسی طریقے سے جسٹی فائے کرنے کے قابل ہی نہیں ہوئے۔"

اسے دادا کی باتیں مشکل لگ رہی تھیں۔ اسے اسلام سے دلچسپی تھی نہ ہی سائنس سے ___

وہ تو بس انرجی کی اس فارم کو جاننا چاہتی تھی جو کہ وہ مس کر گئی تھی اسے بس جاننے کی جلدی تھی دس سال کی بچی کی دلچسپی اور کس میں ہو گی؟

"Grand pa! You are telling me or not"

وہ دادا کو گرینڈ پا تب بولتی تھی جب کہ وہ ناراض ہوتی یا پھر بہت موڈ میں اور اس وقت وہ موڈ میں نہیں تھی۔

"تم نے مجھ سے اس ہستی ___ کے بارے میں نہیں پوچھا جنہوں نے انرجی کی وہ فارم بتائی تھی۔" دادا نے اپنے پہلو میں لیٹی اس بچی سے ذرا ناراض ہو کر کہا تھا۔

"کیونکہ میں جانتی ہوں وہ کون تھے۔ وہ اللہ کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔" اس نے یہ بات کسی سبق کی طرح دہرائی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ___ اللہ کے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے؟"

"کیونکہ آپ نے چودہ سو سال کا ذکر کیا تھا۔" وہ جھنجلائی تھی۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی تو دادا کیوں پوچھ رہے تھے۔ مگر وہ تو اسے پوائنٹ پہ لا رہے تھے۔

"کیا آخری نبی کے بعد کوئی نبی آئے گا عائشہ؟" انہوں نے سوال کیا تھا۔ یہ سوال ہر روز ___ ہر رات کسی نہ کسی طریقے سے عربے سے اس سے ضرور پوچھا جاتا تھا۔

"نہیں! ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

"اور اگر کوئی یہ کہے کہ ان کے بعد کوئی نبی آئے گا تو وہ کیا ہے؟"

"وہ مرتد ہے ___ وہ کافر ہے۔" اس نے روز کی طرح یہ بات بھی دہرائی تھی۔

"کیا ایک مسلمان کو یہ گوارا ہے کہ وہ مرتد ہو کر مرے؟"

"نہیں! ایک مسلمان ایسا نہیں کر سکتا۔"

"مسلمان کو کیسی موت کی تمنا کرنا چاہیے عائشہ؟"

"اسے ایمان کے ساتھ مرنے کی تمنا کرنی چاہیے دادا۔" یہ جواب اس نے جمائی روک کر دیا تھا اسے اب نیند آ رہی تھی دادا اب اسے وہ دعا سنانے کو کہہ رہے تھے جو کہ سورۃ البقرہ کی آخری آیات میں سے تھی باوجود اس کے کہ وہ غنودگی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دعا صحیح سنائی تھی۔

دادا اب بہت پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہے تھے اور وہ آپ بتدریج نیند کی طرف جا رہی تھی۔

"آپ نے مجھے انرجی کی وہ فارم نہیں بتائی جس کو اللہ کے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتایا تھا۔" اس نے اچانک پوری آنکھیں کھول کر کہا تھا یوں جیسے وہ نیند کو بھگانا چاہتی ہو ___ پھر دادا نے اسے انرجی کی وہ فارم بتائی تھی۔

"یہ عجیب سی بات ہے۔" جواب سن کر عائشہ کو تھوڑی دقت محسوس ہوئی تھی یقین کرنے میں۔

"کیوں ___ کیوں ہے؟" گرینڈ پا نے الٹا سوال کر دیا تھا۔ ان کے سوال پہ وہ منہ اٹھا کر گرینڈ پا کو دیکھنے لگی تھی۔

"آپ اس بات کو Jastify کریں۔"

"میں ضرور کروں گا مگر ابھی نہیں ___ کل ___ ابھی تم سو جاؤ۔"

"That's not fair" وہ منہ بنا کر بولی تھی۔

وہ اس پر کمبل برابر کرنے لگے تھے یہ اس بات کا اعلان تھا کہ انہیں اس کے احتجاج کی بالکل بھی پروا نہیں ہے۔

"مجھے نیند نہیں آئے گی۔" انہیں کمبل کے اندر سے آواز آئی تھی۔

"یہی بات تم مجھے ٹھیک دس منٹ بعد کہنا تب ہم اس موضوع پہ بات کر لیں گے۔"

"اوکے!" اب کے کمبل کے اندر سے بہت پرجوش سی آواز ابھری تھی۔ اور ٹھیک دس منٹ بعد دادا نے اس کے چہرے سے کمبل ہٹا کر دیکھا تھا۔ وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

"اللہ تمہارا ایمان سلامت رکھے۔" روز کی دی جانے والی دعا ایک دفعہ پھر انہوں نے دہرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم اتنا کم کیوں بولتی ہو؟" اس سوال پہ عائشہ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ وہ کافی دیر سے یوں ہی خاموش چل رہے تھے۔

"مجھے لگتا ہے کہ میری باتیں لوگوں کو Bother کرتی ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"پتا نہیں لوگ کہتے ہیں میں عجیب ہوں' میری باتیں عجیب ہیں کچھ کچھ ماورائی۔" ___ علی نے آج عقل مندی کا کام کیا تھا۔ وہ اسے آج آئس کریم کھلانے نہیں لے کر گیا تھا۔ وہ اس کے گھر کے باہر والے روڈ پر جو کہ نیچے کی طرف جاتا تھا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ مری کا ایک پرسکون علاقہ تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تم عجیب ہو اور جہاں تک باتوں کا تعلق ہے وہ تو تب ہی پتا چلے گا جب تم کچھ بولو گی۔" اس بات پہ وہ ہلکا سا ہنسی تھی۔

"آپ خود کو خوش قسمت تصور نہیں کرتے۔ آپ ان خوش قسمتوں میں شامل ہیں جن کی بیویاں کم بولتی ہیں۔" چلتے چلتے رک کر اس نے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائی تھی۔

"نہیں! میں تب خود کو خوش قسمت سمجھوں گا جب میری بیوی اپنے دادا کی طرح مجھ سے بھی دل کی ہر بات ___ سب کچھ شیئر کرنے لگے گی۔" وہ اب اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے سر پہ چمکنے والے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ یہ علی سے نظریں نہ ملانے کی ایک لاشعوری سی حرکت تھی۔

"مجھے ریلیشنز بنانے نہیں آتے۔ میں اس معاملے میں بہت بری ہوں۔"

"کوئی بات نہیں میں اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ اچھا ہوں۔"

جیب میں ہاتھ ڈالے' اس کے سامنے کھڑا شخص مسکرایا۔ عائشہ نے بے اختیار نظریں جھکائی تھیں وہ چند لمحے تک یوں ہی اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

"تم نے میرے پرپوزل سے انکار کیوں کیا تھا؟" علی نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا تھا۔

عائشہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا اسے اندازہ تھا کہ علی یہ سوال ضرور کرے گا۔ وہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔

"یہی خوف تھا نا کہ تم اس رشتے کو استوار نہیں کر سکو گی۔" اب کی بار عائشہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا

تھا کتنا عرصہ ہوا تھا ان کے نکاح کو۔۔۔ محض دو ماہ اور اس عرصے میں وہ کتنی بار ملے تھے؟ دو تین یا پھر چار مرتبہ۔ اور اتنا صحیح اندازا۔۔۔ کیا تھا وہ شخص۔۔۔

چند لمحوں بعد اس نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔ علی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھپتھپایا تھا۔ یہ اسے کسی تسلی کی طرح محسوس ہوا اور ایک دفعہ پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ خموشی سے چلنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

غیاث احمد کا تعلق لاہور کے ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ ان کی چھ اولادیں تھیں پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا انہوں نے اپنی اوقات کے مطابق بیٹیوں کو پڑھایا اور پھر ایک ایک کر کے ان کی شادیاں کر دی تھیں۔ بیٹا سب سے چھوٹا تھا۔

غیاث احمد اپنے زمانے کے بی اے پاس تھے۔ انہوں نے بیٹیوں کو بھی پڑھایا اور چاہتے تھے کہ بیٹا بھی تعلیم حاصل کرے مگر وہ تعلیمی میدان میں چلا نہیں اور میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا تھا۔ تب غیاث احمد نے چاہا کہ وہ کوئی ہنر سیکھ لے مگر وہ کوئی کام بھی نہیں کر سکا۔ بہنوں اور ماں کے پیار نے صرف اسے بگاڑا ہی تھا۔ وہ جو ہل کر پانی تک نہیں پی سکتا تھا وہ کام یا محنت خاک کرتا۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی جب ارسلان احمد محض بیس سال کا تھا۔ اس کی ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی کچھ اس کی پریشانی بھی تھی۔ گھر کا خرچ ابھی تک غیاث احمد اٹھا رہے تھے۔ تبھی ارسلان کی ماں کو اک نئی بات سوجھی۔ ان کے خیال میں شادی اس مسئلے کا حل تھی لیکن شادی مسئلے کا حل نہیں ہوتی یہ ارسلان احمد جیسے کیسز میں مزید مسائل کا باعث بنتی ہے۔

غیاث احمد کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے ارسلان کی شادی محض اکیس سال کی عمر میں کر دی تھی اور بائیس سال کی عمر میں وہ باپ بھی بننے والا تھا مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ گھر کا خرچ ابھی تک غیاث احمد کے کندھوں پہ تھا الٹا آمنہ (ارسلان کی بیوی) کو اپنے اخراجات کے لیے ٹیوشنز کرنی پڑتی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ کچھ پڑھی لکھی تھی۔

شروع شروع میں آمنہ نے نرمی سے ارسلان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اگر وہ سمجھانے سے سمجھنے والا ہوتا تو یقیناً" اپنے ماں باپ کی بات سب سے پہلے سمجھتا۔ اور بات بالآخر آئے روز کے جھگڑے تک جا پہنچی تھی۔

ان ہی جھگڑوں سے تنگ آ کر ارسلان نے باہر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ باہر جانے کے لیے سب سے پہلے پاسپورٹ بنوانا پڑتا ہے اس کے پاس پاسپورٹ بنوانے تک کے پیسے نہیں تھے ویزہ تو دور کی بات تھی اور غیاث احمد اس سلسلے میں اس کی مدد کرنے والے نہیں تھے۔ تبھی وہ آمنہ سے اس کی سونے کی بالیاں بیچنے پہ اصرار کرنے لگا تھا آمنہ کے پاس وہ بالیاں واحد قیمتی چیز تھیں اور انہیں وہ ارسلان کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہی لڑائی جھگڑوں سے آمنہ کا بی پی ہائی رہنے لگا تھا جو کہ اس حالت میں اس کے لیے یقیناً" اچھا نہیں تھا۔

اور پھر ایک رات۔۔۔

انہی سونے کی بالیوں کی وجہ سے ان کا جھگڑا ہوا تھا اور وہ جھگڑا اتنا شدید تھا کہ اس کے ماں باپ اٹھ گئے تھے غیاث احمد بار بار ارسلان کو دروازہ کھولنے کا کہہ رہے تھے۔ مگر وہ دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔

وہ سخت غصے میں تھا اور شاید اس نے پی بھی رکھی تھی سو اس نے آمنہ کو بری طرح سے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ باہر۔۔۔ اس کے ماں باپ کا شور تھا اور اندر آمنہ کی چیخیں۔۔۔ وہ انسان، انسان نہیں رہا تھا شیطان بن گیا تھا۔

غصہ حرام ہے اور یہ حرام چیز یقیناً" انسان سے حلال کام نہیں کرواتی۔ ہوش تو اسے تب آیا جب آمنہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ تب اسے پتا چلا کہ اس نے کیا کیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے وہ بیلٹ نیچے گرا جس سے وہ آمنہ کو مار رہا تھا اور پھر دروازہ کھول کر وہ گھر

سے بھاگ گیا تھا۔ اس کے ماں باپ کو تب اس کی پروا نہیں تھی انہیں اندر گرے وجود کی فکر تھی۔

باوجود اس کے کہ ارسلان کی ماں نے انہیں آمنہ کو ہسپتال لے جانے سے منع کیا تھا اس سے پولیس کیس بن سکتا تھا پھر بھی وہ اسے ہسپتال لے کر گئے تھے۔ وہ اتنے بے رحم نہیں بن سکتے تھے ان کی بیوی کو اب بھی اپنے بیٹے کی فکر تھی وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔۔۔ اور یہی وہ غلط رویہ تھا جس نے ارسلان کو بگاڑا تھا۔

پولیس کیس بنا۔۔۔ وہ تو شکر تھا کہ آمنہ نے ان کے حق میں بیان دے دیا تھا ورنہ غیاث احمد جیل بھگت رہے ہوتے مگر آمنہ نے ارسلان کو معاف نہیں کیا تھا اور اس طرح ارسلان کے خلاف قتل کا مقدمہ بنا تھا۔ اسے مفرور قرار دیا گیا تھا اور آمنہ۔۔۔ وہ تو شاید اسی دن مر گئی تھی جب اس کی ارسلان احمد سے شادی ہوئی تھی۔ ہاں البتہ اس کی طبعی موت اب واقع ہوئی تھی وہ بھی بچی کی پیدائش کے دوران۔

ساری عمر انہوں نے بیٹیوں کو پالا تھا۔۔۔ شادیاں کی تھیں اور اب ایک اور بیٹی۔۔۔ وہ بھی اس بڑھاپے میں۔

ارسلان کی ماں کو غم کھائے جا رہا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا اور وہ بھی اس بڑھاپے میں انہیں چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ بعد میں انہوں نے ارسلان کے بارے میں کچھ افواہیں سنی تھیں مگر ان تمام افواہوں میں ایک بات مشترک تھی۔

"اس نے باہر جانے کے لیے اپنے پاسپورٹ پر مذہب کے خانے میں سیکولر لکھوا لیا تھا۔"

اس طرح اس کا باہر جانا، ویزا لگنا بہت آسان ہو گیا تھا لفظ "اسلام" اس کی زندگی میں یقیناً" بہت سی مشکلات لے کر آتا۔ سو اس نے اسی چیز کو بدل ڈالا تھا۔

تبھی غیاث احمد نے ایک فیصلہ کیا وہ اس بچی کو لوگوں کی باتوں اور ان زبانوں کے شر سے بچانے کے لیے اپنا شہر چھوڑ کر۔۔۔ سب کچھ بیچ کر مری آ گئے تھے یہ ایک مشکل فیصلہ تھا مگر انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا تھا۔ ان کی پانچوں بیٹیاں، رشتے دار سب لاہور میں تھے ایسے میں مری جا کر بسنا؟ ارسلان کی ماں سمیت سب نے ان کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی مگر انہوں نے فیصلہ نہیں بدلا تھا۔

لاہور اور مری کے درمیان جتنا فاصلہ تھا۔

وہ اس سے کہیں زیادہ فاصلے پہ اپنے تمام رشتے داروں کو روکنا چاہتے تھے اور وجہ تھی ان کی پوتی، جس کے باپ نے دنیاوی فائدے کے لیے بے دین ہونا قبول کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جا ملا تھا جو کہتے تھے کہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد بھی کوئی نبی آئے گا (معاذ اللہ) لاہور میں اس بچی کی زندگی کبھی آسان نہ ہوتی اور نہ ہی کبھی اس کی شخصیت مضبوط ہو پاتی اس لیے وہ مری میں آ بسے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنے پاس موجود سرمایہ سے ایک پرانی عمارت خریدی تھی اس عمارت کو انہوں نے ریسٹ ہاؤس میں بدلا تھا۔ پچپن سال کی عمر میں۔ جب لوگ پوتے پوتیوں کو کھلایا کرتے ہیں کرسی پہ بیٹھ کر عیش کیا کرتے ہیں انہیں ایک دفعہ پھر سے محنت کرنی تھی۔ اپنی پوتی کو پالنا تھا اسے پڑھانا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کی تربیت کرنی تھی اور اس معاملے میں وہ اب اپنی بیوی پہ مکمل اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔

بیٹے کے عمل نے پچپن سال کے اس شخص کے لیے زندگی کا مفہوم بدل ڈالا تھا۔ ان کی دنیا کو جیسے دوزخ میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا اس بات کے لیے وہ صرف اپنی بیوی کو ہی الزام نہیں دیتے تھے وہ خود کو بھی قصور وار سمجھتے تھے۔ باپ کا کام صرف کما کر کھلانا پلانا ہی نہیں ہوتا۔۔۔ اس کے کیا فرائض ہوتے ہیں یہ اب انہیں سمجھ آیا تھا۔

عائشہ۔۔۔

یہ نام انہوں نے خود اپنی پوتی کا رکھا تھا۔ وہ انہیں اتنی پیاری تھی کہ صرف اس کے لیے وہ اپنا سب کچھ لاہور دفن کر آئے تھے۔ وہ کوئی بزنس مین نہیں تھے اس عمر میں انہوں نے بزنس کے حوالے سے ڈپلوماز کیے تھے۔ کمپیوٹر چلانا سیکھا تھا انگلش لینگویج کورس کیا تھا اور ساتھ ساتھ اپنا ریسٹ ہاؤس بھی چلایا تھا

انہیں کوئی گزارے لائق بزنس نہیں کرنا تھا وہ اپنے ریسٹ ہاؤس کو ایک اعلا پائے کا ریسٹ ہاؤس بنانا چاہتے تھے اسی کے لیے انہوں نے یہ سب پاپڑ بیلے تھے اور ایسا کرنا مشکل تھا۔ اس عمر میں پڑھنا۔۔۔ سیکھنا جب آپ کو یادداشت کی کمزوری لاحق ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ محنت کرنا۔۔۔ جب آپ کے اعضاء جواب دینے لگتے ہیں گھونسلا بنانے کے لیے پھر سے ایک ایک تنکا اکٹھا کرنا۔۔۔ یقیناً" یہ مشکل تھا مگر نا ممکن نہیں تھا۔

جہاں تک عائشہ کا تعلق تھا شروع کے تین سال تک انہیں اس کے حوالے سے زیادہ مسائل کا سامنا نہیں تھا۔ مسئلہ تب بنا جب ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اس تین سال کی بچی کو سنبھالنا؟ لیکن انہوں نے اسے سنبھالا بھی۔۔۔ پالا بھی اور تربیت بھی کی ایسی تربیت جو کہ بہت کم لوگ اپنے بچوں کی کرتے ہیں۔ وہ تین سال کی عائشہ کو گھٹنے پہ بٹھا کر آنے جانے والوں کو ڈیل کیا کرتے تھے۔ ان کا ریسٹ ہاؤس آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا۔

عائشہ کی اسکولنگ بہترین ہوئی تھی۔ اسے غیاث احمد خود پڑھایا کرتے تھے۔ جہاں تک مذہبی تعلیم کا تعلق تھا تو وہ مسجد میں قرآن پڑھانے والے قاری اور کورس کی ایک اسلامیات کی کتاب پہ انحصار نہیں کر سکتے تھے اور وہ بھی ایسی اسلامیات کی کتاب جس میں اکثر واقعات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

شروع کے سالوں میں انہوں نے اپنے لیے اپنے بزنس کے لیے محنت کی تھی اور اب وہ عائشہ کے لیے محنت کر رہے تھے۔ غیاث احمد نے صحیح احادیث کا مطالعہ کرنا شروع کیا تھا۔ انہوں نے ترجمہ پڑھا۔ تفسیر پڑھی۔ ان کا ماننا تھا کہ پاکستان کا بچہ جو محض تین ' ساڑھے تین سال کی عمر میں تین مختلف زبانیں (اردو ' عربی انگلش) سیکھ سکتا ہے دین سیکھنے کے لیے بچے کو کسی ادارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چیز والدین سکھاتے اور پڑھاتے ہیں۔ اس کے لیے بچے کو نہیں ان کے ماں باپ کو Educate کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

غیاث احمد جانتے تھے کہ کھانا سیدھے ہاتھ اور پلیٹ میں اپنے آگے ــــــــــ سے کھایا جاتا ہے' پانی بیٹھ کر پیا جاتا ہے' ناخن جمعہ کے روز تراشے جاتے ہیں اور نماز میں کوئی چھوٹ نہیں جھوٹ بولنے سے کیا ہوتا ہے اور بددیانتی کا انجام کیا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کیا ہوتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے اور کس سے ناراض۔۔۔ عائشہ کے دادا پڑھے لکھے تھے سوائے کسی دینی ادارے کی ضرورت نہیں تھی۔

اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹر کرنے کے بعد غیاث احمد نے عائشہ کو سعودی عرب بھیجا تھا۔ حدیث میں Phd کرنے کے لیے اور اب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آچکی تھی۔

دین Way of life ہے۔۔۔ یہ کوئی بہت مشکل چیز نہیں ہے اور یہ ایسی چیز بھی نہیں ہے جو معاشرے کے ایک طبقے تک محدود کر دی جائے۔ دین اور دنیا دو الگ چیزوں کے نام نہیں ہیں بلکہ دین میں دنیا ہے۔ دنیا میں دین نہیں۔۔۔" عائشہ کو وہ سب کام کرنے سکھائے گئے تھے جس کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا اس سب کے باوجود غیاث احمد کے دل سے یہ خوف نہیں جاتا تھا کہ وہ ارسلان احمد کی بیٹی ہے۔ یہ انہی کا بیٹا تھا جس کا خون عائشہ کی رگوں میں تھا۔ اسی لیے وہ اسے ہر روز یہ بھولنے نہیں دیتے تھے کہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

یہ بات انہوں نے اس کی گھٹی میں شامل کر دی تھی مگر پھر بھی یہ خوف آج تک ان کے دل میں موجود تھا۔ باوجود اس کے عائشہ ایک اچھی بیٹی' اچھی مہمان اور اچھی عورت تھی۔ وہ اپنے دادا کی طرح ایک کامیاب بزنس ویمن بھی تھی۔

وہ چار کمروں پہ مشتمل ریسٹ ہاؤس اب کئی کمروں کے ریسٹ ہاؤس میں بدل چکا تھا۔ اس کے علاوہ مری میں غیاث احمد کے ہوٹلز بھی تھے۔ وہ محنت جو کہ عمر

کے بچپن سالوں میں شروع کی گئی تھی آج ستائیس سال بعد پھل دے رہی تھی۔ غیاث احمد نے عائشہ کو ہر چیز چاہے وہ دنیا کی ہو یا دین کی دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن۔۔۔

عائشہ میں بہت سی خوبیاں تھیں مگر پھر بھی وہ مکمل یا پھر کوئی جامع خوبیوں کا مرقع نہیں تھی۔ ہر انسان کی طرح اس میں بھی کچھ بشری کمزوریاں تھیں وہ بچپن سے اکیلی رہنے کی عادی تھی وہ لوگوں سے زیادہ گھل مل نہیں سکتی تھی مختصر یہ کہ اسے لوگوں کی عادت نہیں تھی۔ اسے شور برداشت نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اس نے گھر میں اپنے اور دادا کے علاوہ کسی کو نہیں پایا تھا۔ وہ ریزرووڈ تھی' خاموش رہنا پسند کرتی تھی۔ لوگوں سے ایک حد رکھ کر ملتی تھی اس لیے لوگ اسے روڈ کہتے تھے اس کی باتیں انہیں کسی اور دنیا کی لگتی تھیں۔ وہ اسے عجیب کہتے تھے۔ دنیا کا کیا ہے انہیں تو ہر وہ شخص عجیب اور ماورائی لگتا ہے جو اسلام کی بات کرتا ہے۔ وہ عجوبہ نہیں تھی مگر لوگ کم و بیش اس کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ مری میں ایک سرکاری میٹنگ اٹینڈ کرنے آیا تھا اور سرکاری ریسٹ ہاؤس میں اس کا ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں آیا تھا۔ گو کہ ان ریسٹ ہاؤسز میں سہولت اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہوتی تھی مگر پھر بھی اسے وہ صدیوں پرانے لگتے تھے۔ وہ مری کے سب سے مشہور ریسٹ ہاؤس میں سرکاری خرچ پہ ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا تھا آخر کو وہ ڈی او فوریسٹ تھا اتنا سا ہیر پھیر کرنا تو اس کا حق تھا۔

قدرے اونچائی پہ بنی وہ عمارت دیکھنے کے لائق تھی۔ اس کے ایک بازو پہ کوٹ دھرا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ سوٹ کیس کو گھسیٹ رہا تھا۔ سن گلاسز سر پہ لگے تھے اور وہاں کا منظر اسے بے حد متاثر کر رہا تھا سبزہ' پہاڑ' دھندلا سا موسم' فضا میں بسی خوشبو۔۔۔ نم سی ہوا اور پیروں کے نیچے آنے والے سوکھے پتوں کا شور۔۔۔

کیا پرسکون پرفضا اور رومانوی سی جگہ تھی۔ مری' وہ شہر جہاں آکر بندہ خوش کن خیالوں میں کھو جاتا ہے۔ اس پر بھی اس جگہ کا جادو چل گیا تھا۔

جیسے ہی وہ ریسٹ ہاؤس کے استقبالیہ پر پہنچا۔

واؤ۔۔۔ بے ساختہ اس کی منہ سے نکلا تھا۔

اتنا شاندار ریسٹ ہاؤس وہ بھی سرکار کے خرچ پہ۔۔۔ عیش تو اسے کہتے ہیں وہ بڑی ترنگ میں اندر آیا تھا۔ ریزرویشن ہو چکی تھی۔ ملازم اسے کمرہ دکھا کر جا چکا تھا اور اب وہ اپنے کمرے سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔

اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ فریش ہونے کے لیے باتھ روم گیا تھا اور جب وہ باہر آیا تو اس کے اچھے اور خوشگوار موڈ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ مری کی ٹھنڈ میں کوئی بھی ٹھنڈے پانی سے نہانا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کوئی آئرن مین نہیں تھا اور نہ ہی اس کا ارادہ خود کو نمونیہ کروانے کا تھا۔

نہایت ہی بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ وہ نیچے آیا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ Receptionist سے بات کرنے کا تھا پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو ایک آفیسر ہے ایک معمولی سے فرد سے کیوں بات کرے اور پھر جلد ہی اس نے CEO کا آفس ڈھونڈ نکالا۔ اس آفس کو دیکھتے ہوئے ایک دفعہ پھر سے اس کے دماغ کو گرمی چڑھنے لگی۔ اتنے اسٹینڈرڈ کا ریسٹ ہاؤس۔۔۔ اتنے زیادہ چارجز اور باتھ روم میں گرم پانی تک نہیں پیون کے روکنے کے باوجود اس نے دھاڑ سے دروازہ کھولا تھا۔

آفس میں موجود ہستی نے چونک کر سر اٹھایا اور اس ہستی کو دیکھ کر آفیسر صاحب کے ابلتے ہوئے دماغ پہ جیسے ٹھنڈا پانی گرا تھا۔

"میڈم! میں نے ان کو روکنا چاہا مگر۔۔۔" پیون بے چارگی سے بولا تھا۔

"کوئی بات نہیں بابا! اب لوگوں کو زبردستی تمیز تو سکھائی نہیں جا سکتی آپ جائیے۔" اس نے پیون کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

"مائے گاڈ!..... کس قدر روڈ تھی وہ لڑکی۔" اسے رہ رہ کر غصہ آیا تھا۔

وہ جو دروازہ کھلنے پہ CEO کے طور پر کسی بزرگ کی موجودگی متوقع کر رہا تھا..... ایک ینگ لڑکی کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مگر اب..... وہ دانت پیستے ہوئے اندر آیا تھا اور زور سے دروازہ بند کر کے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ واقعی لوگوں کو تمیز نہیں سکھائی جا سکتی تھی عائشہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی بلکہ وہ لیپ ٹاپ پہ مصروف تھی۔

"تشریف رکھیے!" اس کے ٹیبل کے پاس آکر رکنے پہ عائشہ نے دیکھے بغیر کہا تھا جواباً" اس نے زور سے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

"فرمائیے!" وہ اسی طرح سے لیپ ٹاپ پہ مصروف تھی۔

"اتنے زیادہ چارجز غالباً" آپ سہولیات مہیا کرنے کے لیتے ہیں۔" وہ کھا جانے والی نظروں سے اس کریم کلر کے عبایا اور ڈارک کلر کا اسکارف لیے لڑکی کو گھور رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سادہ تھا۔

"روم نمبر کیا ہے آپ کا؟" اس کی اتنی بدتمیزی پہ یقیناً" عائشہ کو بھی غصہ آرہا تھا مگر پھر بھی وہ تحمل سے بات کر رہی تھی۔

"302" اس کے بتانے پہ عائشہ کے ہاتھ تیزی سے لیپ ٹاپ پہ حرکت کرنے لگے تھے۔

"علی تبریز' ڈسٹرکٹ آفیسر (فارسٹ) لاہور....." ڈیٹا اس کے سامنے تھا اور مسئلہ بھی اسے سمجھ آگیا تھا۔

"کس بات کے چارجز لیتے ہیں آپ؟ جب ایک گرم پانی کی سہولت تک نہیں مہیا کر سکتے حد ہے ....." آفیسر صاحب اپنی آفیسری جھاڑنا شروع ہو چکے تھے۔

عائشہ نے بے ساختہ ٹھنڈا سانس بھرا اور بیل بجائی۔ چند لمحوں بعد علی کو محسوس ہوا کہ وہ پاگلوں کی طرح خود ہی بولے جا رہا تھا۔ جسے وہ سنا رہا تھا اس پہ تو کوئی اثر ہی نہیں تھا۔

بیل بجانے کے بعد عائشہ دونوں ہاتھوں ایک دوسرے میں پھنسائے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہمدانی صاحب کو بلائیے بابا!"

"ایکسکیوز می!" علی نے ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کیا تھا۔ بے ساختہ برہم ہو کر اس نے علی کو دیکھا تھا وہ بس اک نظر تھی لاشعوری سی..... اس کی آنکھیں' علی کو بے ساختہ پچھتاوا ہوا وہ آنکھیں جھکی ہوئی اچھی تھیں۔ عجیب سی کشش تھی ان آنکھوں میں۔

"آپ ہر ایک کو اتنے ہی برے طریقے سے ڈیل کرتی ہیں۔" وہ بولا تو اس کے لہجے میں اب پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔

اسی لمحے ہمدانی صاحب دستک دے کر اندر آئے تھے وہ اب بھی علی کی طرف متوجہ تھی اور نہ ہی اس نے جواب دیا تھا۔

"ہمدانی صاحب ڈی او صاحب کو کس نے روم نمبر 302 الاٹ کیا ہے۔ آپ کو معلوم بھی ہے اس روم کا سینٹری پرابلم ہے پھر بھی یہ روم الاٹ کر دیا گیا۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"سوری میڈم! مجھے لگتا ہے کہ یہ ریسپشنسٹ کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"آپ فوراً" سے پہلے آفیسر صاحب کا پرابلم حل کروائیے۔ ان کو دوسرا روم الاٹ کریں اور ان کا سامان اس روم میں خود اپنی نگرانی میں شفٹ کروائیے گا۔" علی مسلسل اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"اور ہاں ہمدانی صاحب!" ہمدانی صاحب جاتے جاتے مڑے تھے۔

"یہ تسلی کر لیجیے گا کہ اس کے واش روم میں گرم پانی آتا ہو آپ خود چیک کیجیے گا بلکہ ایسا کیجیے گا کہ سب کچھ اچھی طرح چیک کرنے کے بعد انہیں اس روم میں شفٹ کیجیے گا ورنہ پھر آفیسر صاحب کو (اپنی آفیسری جھاڑنے کے لیے) میرے آفس آنے کی زحمت ہو گی۔" آفیسری جھاڑنے والے الفاظ اس نے دل میں کہے تھے۔

"جی بالکل ٹھیک میڈم۔" ہمدانی صاحب کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

"تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہیں دراصل اس ہوٹل میں انسان کام کرتے ہیں اور انسانوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بے شک ہم چارجز زیادہ لیتے ہیں مگر پھر بھی ہم ایلینز یا پھر جنوں کو ہائیر نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ پھر بہت معذرت....." بات کرتے ہوئے وہ اب بھی اسے نہیں دیکھ رہی تھی اور یقیناً" وہ نرم لہجے میں ہی بات کر رہی تھی۔ یہ الگ بات کہ علی کو الفاظ کسی پتھر کی طرح ہٹ کر رہے تھے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اسے اندازا ہوا تھا کہ ہر کسی پہ اپنی آفیسری نہیں جھاڑی جا سکتی تھی۔ کیا کہے اب وہ.....

"شکریہ.....!" وہ اٹھ کر جانے کے لیے مڑا تھا۔

"ایکسکیوز می ڈی او صاحب۔" بے ساختہ وہ مڑا تھا۔

"ہر روم میں انٹرکام کی سہولت موجود ہے اگر آپ اسے استعمال کرتے تو یقیناً" آپ کا مسئلہ حل ہو جاتا اور آپ کو یہاں آنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی ہر کام کے لیے الگ الگ عملہ موجود ہوتا ہے۔ اب CEO کس کس مسئلے کو دیکھے؟"

"جی..... جی بہتر۔" اس نے چبا کر کہا تھا۔ اور جاتے ہوئے زور سے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

"ایڈیٹ۔" بے ساختہ عائشہ کے منہ سے نکلا تھا۔

اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس کے CEO کے طور پر کام کرنا عائشہ کے بس کی بات نہیں تھی وہ تو وہاں جنرل منیجر کے طور پر موجود ہوتی تھی۔ دادا کی صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ ان کے کمرے میں موجود تھی۔ اس جیسے کئی آفیسرز اکثر ان کے ریسٹ ہاؤس میں آتے رہتے تھے۔ اسے عادت تھی اس جیسے آفیسری جھاڑنے والوں آفیسرز کو ڈیل کرنے کی۔

اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان گورنمنٹ آفیسرز کی گردن میں سریا فٹ ہوتا ہے جو کہ ہر موقع پر انہیں اکڑ دکھانے پہ مجبور کرتا ہے۔ اور ان کی اکڑ کو چٹکیوں میں کس طرح اڑاتا ہے اسے یہ بھی معلوم تھا۔ عائشہ کا رویہ یقیناً" اس سے بہت بہتر ہوتا اگر وہ بدتمیزی نہ کرتا۔

☼ ☼ ☼

ایک روم سے دوسرے روم میں شفٹ ہونے تک وہ حد سے زیادہ بے زار ہو چکا تھا ہمدانی صاحب کئی مرتبہ اس سے معذرت کر چکے تھے۔ ریسپشن پہ موجود جس لڑکے نے اسے روم کی چابیاں دی تھیں دراصل اس نے غلطی سے اسے روم نمبر 302 کی چابیاں دے دی تھیں جس کی وجہ سے یہ سارا مسئلہ ہوا تھا۔ وہ لڑکا بھی آکر اس سے معذرت کر چکا تھا مگر اس کے موڈ کا بیڑہ غرق ہو چکا تھا۔

آج شام اسے بابا کے ایک دوست سے بھی ملنے جانا تھا۔ کل اس کی میٹنگ تھی اور کل شام کو بہرحال اسے واپس لاہور کے لیے نکلنا تھا۔

موڈ نہ ہونے کے باوجود اس نے پہلے کال کر کے بابا کے دوست کو اطلاع کی تھی اور اب وہ وہاں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں بابا مری آئے تھے یہیں پہ ان کی ملاقات اپنے کسی بہت پرانے اور اچھے دوست سے ہوئی تھی مسئلہ یہ تھا کہ اس دوست کی پوتی بابا کو بے حد پسند آئی تھی اور وہ اسے علی کے لیے پسند کر چکے تھے وہ اسی سلسلے میں وہاں جا رہا تھا۔ بابا نے اسے بتایا کہ ان کے دوست کے ہوٹلز تھے مری میں اور وہ کافی ویل آف تھے۔ ان کا تعلق بھی لاہور سے تھا مگر بابا نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا ریسٹ ہاؤس بھی تھا جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ عموماً" لوگ ریسٹ ہاؤس اور ہوٹلز میں زیادہ فرق نہیں کرتے۔ یہی بات تھی جو بابا نے بھی اسے ریسٹ ہاؤس کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

غیاث احمد سے ملاقات بہت اچھی رہی تھی ان کی طبیعت کچھ خراب تھی مگر پھر بھی وہ بہت اچھے طریقے سے ملے تھے۔ غیاث احمد کا انداز (یہ جاننے کے باوجود کہ وہ وہاں کس لیے آیا تھا) بالکل بھی روایتی نہیں تھا۔ وہ علی کا پورا انٹرویو کر چکے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے

کہ کوئی اپنی قیمتی چیز کسی کے حوالے کرنے سے پہلے پوری چھان بین کرتا ہے۔

"کہاں ٹھہرے ہو؟" چائے کے دوران غیاث احمد نے پوچھا تھا۔

"ایک پرائیوٹ ریسٹ ہاؤس ہے اس میں ٹھہرا ہوں۔" اسے بہرحال دادا کی پوتی سے ملنے کی جلدی تھی مگر یہاں پہ انٹرویو ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"گورنمنٹ کے تو اپنے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں اور سرکاری آفیسرز کی رہائش کا خرچہ بھی گورنمنٹ ہی برداشت کرتی ہے پھر تم کیوں نہیں ٹھہرے وہاں؟" باوجود اس کے کہ چائے زیادہ گرم نہیں تھی مگر اسے لگا کہ چائے نے اس کا منہ جلا دیا۔ اسے فوری طور پر کوئی جواب نہیں سوجھا۔

"لوگوں کو کیا ہے کہ اپنی حلال کی کمائی کو چند ہزار کے لیے حرام بنا لیتے ہیں۔" ان کا انداز منہ پہ بات مارنے جیسے تھا۔ وہ یقیناً" سمجھ چکے تھے کہ وہ کیوں پرائیوٹ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا اور وہ دیکھے بغیر دادا کی پوتی کو ریجیکٹ کر چکا تھا پتا نہیں کیوں مگر غیاث احمد کے انداز نے اسے آج دوپہر کا واقعہ یاد دلایا تھا۔ اس لڑکی کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"انکل کل صبح میری میٹنگ ہے اس کے بعد مجھے واپس بھی جانا ہے تو میرا خیال ہے اب میں چلتا ہوں۔" چائے کا کپ رکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"ایسے تو تم نہیں جا سکتے ..... کھانا تو کھا کر ہی جاؤ گے۔" علی کو جھٹکا لگا۔ کیا دھونس بھرا انداز تھا۔

"آؤ تمہیں میں گھر دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے تھے۔

"انکل مگر وہ....."

"کوئی اگر مگر نہیں.... کم آن ینگ مین....." آج کا دن ہی برا تھا۔ وہ یہاں سے جان چھڑانے کے چکر میں تھا اور وہ بوڑھا آدمی۔

"بوڑھے واقعی ۔ خبطی ہوتے ہیں۔" وہ بڑبڑایا اور اٹھ کر ان کے پیچھے چل دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور باوجود اس کے کہ اسے اب اس بوڑھے شخص کی پوتی سے کوئی غرض نہیں تھی وہ شام تک وہاں رکا تھا اور غیاث احمد کی باتیں..... وہ کافی دلچسپ تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ وہاں ٹھہرنے پہ مجبور ہوا تھا۔

گھر دکھانے کے بعد وہ اسے اپنی اسٹڈی میں لے گئے تھے۔ وہاں زیادہ تر اسلامی علوم' تفاسیر و احادیث کی کتابیں تھیں۔ اسے اپنے اور غیاث احمد کے درمیان جنریشن گیپ جیسی کوئی چیز محسوس ہوئی تھی اور نہ ہی ان کی باتوں سے اسے ایسا لگا تھا وہ اب اس سے اسی کے شعبے کے متعلق بات کر رہے تھے۔

"ماہرین کہتے ہیں کہ ہر ملک کا کم از کم 25٪ علاقہ جنگلات پہ مشتمل ہونا چاہیے کیوں ینگ مین ایسا ہی ہے نا؟" بولتے بولتے انہوں نے علی سے تصدیق چاہی تھی۔

"جی جی بالکل۔" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور اب چائے کا ایک اور دور چل رہا تھا۔

"جنگلات کی بہت اہمیت ہوتی ہے کسی بھی ملک کے لیے۔ جتنے درخت زیادہ ہوں گے' مٹی اتنی زیادہ زرخیز ہو گی' ایگریکلچر ترقی کرے گا نتیجتاً" اکانومی مضبوط ہو گی اس کے علاوہ ماحول کے لیے بھی درخت کتنے ضروری ہوتے ہیں یہ مجھے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ PTV پہ ایک اشتہار بھی چلا کرتا تھا درخت لگائیے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"جنگلات کی اہمیت سے ماہرین نے کتنا عرصہ پہلے آگاہ کیا ہو گا؟ مگر تم جانتے ہو یہی بات میرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔" وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا۔ ایسی کوئی بات اس کے علم میں نہیں تھی۔

"درخت لگانا صدقہ جاریہ قرار دیا گیا کیوں؟" علی کے پاس سوال کا جواب نہیں تھا۔ "اسی لیے کہا گیا تھا کہ درختوں کی بہت اہمیت ہے انسانوں کے لیے' جانوروں کے لیے' ماحول کے لیے' معیشت کے لیے' ملک کے لیے ..... اور آج ماحولیات والے روتے پھرتے ہیں کہ درخت لگاؤ' انہیں کاٹو نہیں وغیرہ وغیرہ وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ درخت لگاؤ اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صدقہ جاریہ قرار دیا ہے غور کرو ان لفظوں پہ ..... یہ وہ چیز ہے جو انسان کے مرنے کے بعد بھی کام آتی ہے۔

ہم میں سے کون ہے جو یہ جانتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم وہ کام اس زندگی میں ضرور کریں جو مرنے کے بعد بھی فائدہ دینے والا ہو۔

ماہرین لوگوں کو درختوں کے سائنسی فوائد بتاتے ہیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا فائدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ وہ بھی تب جب سائنس' جیسی کوئی چیز موجود نہیں تھی عرب میں' ایسی کوئی چیز نہیں جو اس وقت کام آتی ہے جب انسان قبر میں ہوتا ہے؟ مگر اعمال اور اگر ان اعمال میں صدقہ جاریہ بھی شامل ہو تو کیا یہ کافی نہیں ہے.....؟"

بسکٹ کی پلیٹ اس کے آگے کرتے ہوئے وہ بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں بول رہے تھے۔

"اس بات سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ درخت لگانا صدقہ جاریہ ہے مگر آج اس حدیث کا دوسرا رخ سمجھ میں آیا ہے۔" اس نے بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"رخ ..... نہیں حکمت ..... دین کی باتوں میں حکمت ہوتی ہے۔ لوگ اس حکمت کو تلاش نہیں کرتے۔"

"اتنا وقت کس کے پاس ہے کہ وہ ایسی حکمتوں کو تلاش کرتے پھریں ..... یہاں تو پانچ وقت نماز پڑھنا عذاب بنا ہوا ہے۔ سمیت میرے ....." علی نے برہنہ تبصرہ کیا۔

اسی وقت ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔

"عائشہ آ گئی؟" کھانے کی ٹیبل پہ بیٹھتے ہوئے انہوں نے ملازم سے پوچھا تھا۔

"جی! وہ تو کافی دیر ہوئی آ چکی ہیں۔"

"بلاؤ اسے بھی کھانے پہ۔"

اور ملازمہ اسے بلانے چلی گئی تھی تو بالآخر پوتی صاحبہ سے ملاقات کرنے کا وقت آ ہی گیا تھا۔ بے ساختہ وہ الرٹ ہوا تھا۔ غیاث احمد نے کھانا شروع نہیں کیا تھا غالباً" وہ عائشہ کا انتظار کر رہے تھے۔

ملازمہ دستک دے کے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی غیاث احمد کا پیغام اس نے عائشہ کو دیا تھا۔

"ہاں چلو!" وہ ملازمہ کے کہنے پہ شانوں پہ بلیک کلر کا دوپٹا پھیلا کر باہر جانے کے لیے بڑھی۔

"بیٹا! صاحب کے ساتھ مہمان بھی موجود ہے۔" ملازمہ نے کہا۔

"اچھا!" اسے حیرانی ہوئی۔ غیاث احمد اپنے مہمانوں کے سامنے اسے کم ہی بلایا کرتے تھے وہ مڑی اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کے سے انداز میں دوپٹا چہرے کے گرد لپیٹنے لگی۔ اس کا دوپٹا کافی بڑا تھا اور یوں لپیٹنے سے وہ اس کی آستینوں پہ گر رہا تھا گھر کی چپل اتار کر اس نے سوٹ سے میچنگ بلیک کلر کی سینڈل پہنی تھی اور پھر وہ ڈائننگ ٹیبل تک آئی تھی۔ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے مہمان کو سلام کیا تھا مگر سلام ادھورا ہی رہ گیا۔ اسے دھچکا لگا تھا اور بے ساختہ وہ حیران ہو کر علی کو دیکھنے لگی تھی۔

اور علی..... وہ سارا دن اس پوتی کے لیے خوار ہوا تھا۔ اس کا بے اختیار اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔

"وعلیکم السلام۔" کچھ لمحے کے توقف کے بعد اس طرح سے جواب آیا تھا جیسے کہ حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ غیاث احمد کی آواز آئی تھی۔ "کھانا شروع کریں۔"

علی ۔ کھانے کے ساتھ ساتھ پوتی صاحبہ کا بھی بھرپور جائزہ لے رہا تھا۔

کھانے کے دوران ڈشز اسے عائشہ نہیں ..... غیاث احمد سرو کر رہے تھے۔ وہ تو بس خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

"یہ جو اس ٹیبل پہ تم ڈشز دیکھ رہے ہو نا یہ سب ....." عائشہ کا سانس رکا تھا۔ اس نے ناراض اور تنبیہی نظروں سے دادا کو روکنا چاہا تھا مگر.....

"ملازمہ نے بنائی ہیں۔" قدرے توقف کے بعد وہ

بولے تھے۔ علی کو کسی اور جملے کی توقع تھی اس بات پہ وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

"بھئی ہماری پوتی صاحبہ کھانے پکانے کے معاملے میں بالکل کوری ہیں۔ اگر کبھی بنائے بھی تو۔۔۔"

"گرینڈ پا!" عائشہ کی ناراض آواز نے انہیں روکا تھا۔

غیاث احمد نے قہقہہ لگایا تھا علی نے اس کے خفا چہرے کو دیکھا عجیب پینڈو سی لڑکی تھی آج کل کی لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"کیا اب وہ ایسی دقیانوسی بیوی کو لے کر سرکاری تقریبات میں جائے گا ذرا سا کاجل تک نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔"

بے ساختہ اس کی نگاہ اب عائشہ کے ہاتھوں پہ پڑی تھی۔ وہ صاف رنگت کے حامل تراشیدہ ناخنوں والے ہاتھ تھے۔ جن پہ کیوٹکس تک نہیں تھی خود کو یوں دوپٹے میں چھپایا ہوا تھا کہ جیسے نظر لگنے کا اندیشہ ہو یوں دیکھنے سے پہ ہی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اگر وہ اسمارٹ ہے تو کتنی اسمارٹ ہے؟ اور پھر آج دوپہر کا واقعہ، یکدم ہی اس کا دل اچاٹ ہوا تھا۔

"ینگ مین، چائے لو گے کافی یا قہوہ۔" کھانا کھانے کے بعد غیاث احمد نے اس سے پوچھا تھا عائشہ اب ٹیبل سے برتن اٹھانے میں ملازمہ کی مدد کر رہی تھی۔

"نہیں انکل! کچھ بھی نہیں شام سے اتنی دفعہ چائے لے چکا ہوں کہ اب کسی چیز کی طلب نہیں۔" وہ اتنی تمیز سے بات کر رہا تھا کہ عائشہ کو حیرت ہوئی۔ کیا یہی وہ شخص تھا جو کہ اس کے آفس میں اپنی آفیسری جھاڑنے آیا تھا۔

دادا اسے سی آف کرنے گئے تھے وہ علی کے یہاں آنے کے مقصد سے آگاہ نہیں تھی۔ وہ اسے بس دادا کا کوئی جاننے والا سمجھ رہی تھی۔

وہ جب واپس آئے تو اس نے آج دوپہر کا واقعہ من و عن انہیں بتایا تھا۔

"عائشہ! تم ریسٹ ہاؤس کا امیج خراب کر دو گی۔ کچھ تو مارکیٹنگ کے اصول سیکھو۔ غلطی بہرحال تمہارے ملازم سے ہوئی۔۔۔ تمہیں سوری کرنا چاہیے تھا۔" وہ ناراض ہوئے تھے۔

"میں ضرور ایسا ہی کرتی اگر وہ اپنی آفیسری نہ جھاڑتا۔۔۔ وہ اگر انٹر کام پہ بھی اطلاع کر دیتا تو اس کا مسئلہ آرام سے حل ہو جاتا مگر نہیں ان گورنمنٹ آفیسرز کو بیماری لاحق ہوتی ہے ہر جگہ اپنی اکڑ دکھانے کی۔" وہ سر جھٹک کر بول رہی تھی۔

"تم جانتی ہو وہ یہاں کیوں آیا تھا اور میں نے تمہیں کیوں ملوایا اس سے؟"

"کیوں؟"

"تبریز کا بیٹا ہے وہ۔"

"اچھا تو؟"

"تو یہ کہ اس کا پرپوزل آیا ہے تمہارے لیے۔" اس بات پہ بے اختیار عائشہ خاموشی سے دادا کو دیکھنے لگی۔

"کیا تمہیں وہ پسند نہیں آیا؟" اس کی خموشی پہ غیاث احمد نے سوال کیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ گرینڈ پا کہ میں ایسا کوئی رشتہ نباہ سکتی ہوں۔"

"حادثے زندگی کا حصہ ہوتے ہیں عائشہ؟"

"اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ حادثہ کیوں پیش آیا تھا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ بے ساختہ غیاث احمد نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"تمہیں شادی تو بہرحال کرنی ہے عائشہ۔"

"ہاں! کرنی ہے مگر ابھی نہیں۔۔۔ میں تب کروں گی جب مجھے محسوس ہو گا کہ اب میں اس قابل ہوں۔" وہ سر جھکائے مدھم لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے کوئی زبردستی نہیں مگر روز روز ایسے پرپوزلز نہیں آتے بیٹا!"

"پھر جیسے آپ کی مرضی گرینڈ پا!" کچھ لمحوں کے توقف کے بعد جواب آیا تھا۔ غیاث احمد خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے تھے جس میں اس کی مرضی شامل نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

"آج۔۔۔ صبح سے اس کا موڈ جتنا خوش گوار تھا رات ہونے تک وہ اتنا ہی بدمزا ہو چکا تھا۔ پورے ڈھائی گھنٹے ایک بوڑھے شخص کی باتیں سننا وہ بھی ایک لڑکی کو دیکھنے کے چکر میں اور پھر۔

"اف۔۔۔ لیکن کیا وہ بور ہوا تھا؟۔۔۔" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ وہ بور نہیں ہوا تھا تو پھر کیا چیز تھی جو کہ اسے بے زار کر رہی تھی۔

انٹر کام سے اس نے کافی آرڈر کی اور پھر پردے ہٹا کر وہ مری میں اتری رات کو دیکھنے لگا۔

اس کے ذہن میں بیوی کے طور پر جس لڑکی کا خاکہ تھا غیاث احمد کی پوتی اس پہ پوری نہیں اتری تھی۔ اسے یہ چیز بے زار کر رہی تھی۔ ایک شعوری سی بات ۔۔۔ پہاڑ کھودنے کے بعد چوہا نکلنے والا احساب ہوا تھا۔

کافی آچکی تھی اور اب کافی کا بھاپ اڑاتا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

وہ۔۔۔ ڈی۔ او (فارسٹ)۔۔۔ اتنے ہینڈسم لکس کے ساتھ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کر لے جسے بولنا تک ۔۔۔ یہاں آکر جیسے اس کے خیالات کو اسٹاپ لگا تھا۔

"کیا واقعی اسے بولنا تک نہیں آتا تھا۔" اس نے رک کر جیسے خود سے سوال کیا تھا غلط تھا ایسی تو کوئی بات نہیں تھی دوپہر کا واقعہ پھر سے تازہ ہوا تو پھر کیا تھا جو علی نے اس لڑکی کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔

"آج دوپہر کا واقعہ؟"

"چلو اس بات کو سائیڈ پہ اٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔" کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی نظریں باہر کی روشنیوں کو فوکس کیے ہوئے تھیں۔

"تو پھر۔۔۔"

"شادی کرنے کے لیے ایک لڑکی میں کیا ہونا چاہیے یا پھر کیا دیکھنا چاہیے۔"

"کردار، تعلیم، حسب نسب، شکل و صورت، اٹھنا بیٹھنا، اعتماد۔"

اس نے جیسے لسٹ بنانی شروع کر دی تھی۔

"کردار؟۔۔۔ ایک ملاقات میں نہیں جانچا جا سکتا مگر اندازا ضرور لگایا جا سکتا ہے۔"

وہ یقیناً "ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس نے اندازا لگایا تھا۔

"تعلیم؟" وہ اس سے زیادہ تعلیم یافتہ تھی۔

"شکل و صورت۔۔۔ اگر وہ دوپٹا یوں لپیٹنے کی بجائے گلے میں ڈال لیتی تو یقیناً" زیادہ بہتر لگتی۔ بہرحال پھر بھی ایسی شکل و صورت نہیں تھی جسے رد کر دیا جاتا۔"

"اٹھنا بیٹھنا' ہاں یہی ایک بات اسے بے زار کر رہی تھی۔ وہ اسے کسی پچھلی صدی کی کوئی یادگار لگی تھی۔

حسب نسب اور اعتماد اسے چیک کرنے کی ضرورت نہیں تھی یہ دونوں چیزیں کسی اشتہار کی طرح اس کے ماتھے پہ چمکتی تھیں۔

تو وہ محض اسے اس کے دقیانوسی ہونے پہ ریجیکٹ کر رہا تھا۔ ہاں تو ٹھیک ہے نا! کئی ایسی تقریبات ہوتی ہیں جن میں وہ ایسی بیوی کو لے کر نہیں جا سکتا تھا جسے فیشن کی الف ب تک کا پتا نہ ہو اور جو ہر وقت یوں دوپٹا لپیٹ کر ماسیوں جیسا حلیہ بنائے رکھتی ہو تو باقی ساری خوبیوں پہ اس ایک واحد چیز نے پانی پھیرا تھا۔ کافی کے آخری گھونٹ کے ساتھ وہ اسے مکمل طور پر ریجیکٹ کر چکا تھا۔

اس نے اب لیپ ٹاپ آن کیا تھا اور کل کی میٹنگ کے لیے 'نوٹس بنانے لگا تھا اس ریسٹ ہاؤس میں Wi Fi کی سہولت موجود تھی انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے وہ فیس بک پہ بھی لاگ ان ہوا تھا۔ وہاں پہ اس کے کسی دوست نے ایک حدیث شیئر کی ہوئی تھی جس میں شادی کرتے وقت عورت کی دین داری کو فوقیت دینے کا کہا گیا تھا۔ بے اختیار وہ رک گیا۔

پتا نہیں کیوں مگر یکدم عائشہ کا چہرہ اس کے سامنے آیا تھا۔ "دین داری؟"

لیپ ٹاپ پر مصروف ہونے کے باوجود وہ الجھا ہوا تھا۔

اچھی بیوی کو دنیا کی بہترین نعمت کہا جاتا ہے۔

اسے ایک اور بات یاد آئی تھی۔

وہ ایک دفعہ پھر سے کھڑکی کی سامنے کھڑا تھا کون سی خوبی نہیں تھی عائشہ میں جو شادی کرنے کے لیے ایک لڑکی میں ہونی چاہیے ماسوائے اس کے وہ دین کو فالو کرتی تھی اور جس نے اس ایک چیز کو "خاص" بنا ڈالا

اور وہ حدیث؟ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پڑھی تھی۔
بے ساختہ اس نے اپنے منہ پہ ہاتھ پھیرا تھا وہ جیسا بھی تھا بہرحال مسلمان تھا اس کا اسلام جمعہ کی نماز تک ہی محدود تھا۔

"تو میرے نزدیک عورت کو پسند کرنے کا یہ معیار ہے کہ وہ گلے میں دوپٹا ڈال کر جسم کو نمایاں کرنے والے کپڑے پہن کر میرے ساتھ چلے؟ مجھے ایسی چیزیں پسند ہیں جو میرا دین میرے لیے پسند نہیں کرتا۔" تھوڑی دیر پہلے بنائی لسٹ میں محض ایک چیز کی بنیاد پہ اس نے عائشہ کو ریجیکٹ کیا تھا۔ دین داری کو خامی بنا ڈالا تھا اور جب وہ ــــ ایک حدیث پڑھتا ہے تو وہ ہی خامی ــــ خوبی میں بدل جاتی ہے۔

"یا اللہ ــــ کیا واقعی میں اتنا بے غیرت ہو چکا ہوں؟ یا پھر میرے لیے اسلام صرف اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ جس سے میں شادی کروں۔ وہ کلمہ گو ہو۔" کیا دین صرف کلمے کی حد تک ہے؟" سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور وہ تھا کہ الجھتا جا رہا تھا۔

"میں ایسے کیوں سوچ رہا ہوں؟" یکدم وہ چونکا تو کیا یہ آج دوپہر کی باتوں کا اثر تھا۔
باقی سوالوں کی طرح اس سوال کا جواب بھی اسے نہیں ملا صرف خالی پن تھا۔

☼ ☼ ☼

عائشہ کی پانچ پھوپھیاں تھیں اور پھر ان کے بچے وہ لوگ سالوں بعد مری کا چکر لگا لیا کرتے تھے اب لاہور سے مری آنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں تھا لیکن غیاث احمد کی بیٹیاں اتنی خوشحال نہیں تھیں جتنا کہ غیاث احمد تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کی پھوپھیوں اور کزنز کا آنا جانا بڑھ گیا تھا گو کہ وہ خاموش فطرت تھی شور اسے پسند نہیں تھا لیکن وہ اس کے رشتے دار تھے جنہیں بہرحال وہ برداشت کرتی تھی۔ دادا اور اس کا کام بری طرح سے متاثر ہوتا جب اس کے کزنز احمد ہاؤس میں موجود ہوتے تھے۔ ان ہی کزنز میں سے تیسری پھوپھو کا بڑا بیٹا نعمان اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرنے لگا تھا اور جلد ہی پھوپھو نے اس کا رشتہ بھی مانگ لیا تھا دادا جن رشتے داروں سے بچانے کے لیے اسے لاہور سے لے آئے تھے اور اب وہ ہی رشتے دار ــــ پاؤں کی زنجیر بنتے جا رہے تھے۔

انسان ہمیشہ ایسی ہی زنجیروں سے مجبور ہوتا ہے۔ وہ ان کی بیٹیاں تھیں۔ جن سے وہ کٹ نہیں سکتے تھے اور نہ ہی وہ اتنا عرصہ کٹ کر رہے تھے۔ وہ ہر موقع پر، ہر تہوار پہ انہیں یاد رکھتے تھے یہ الگ بات تھی کہ وہ خود یا پھر عائشہ بہت کم لاہور جاتے تھے۔ وہ بھی اس رشتے سے جو بیٹی کے باپ ہونے کے ناتے سے تھا مجبور ہوتے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی کا گھر عائشہ کے لیے بہتر رہے گا بجائے اس کے کہ وہ کسی غیر کے گھر جائے مگر ایسا کرتے وقت وہ صرف بیٹی کے باپ بن گئے تھے۔ وہ بھول گئے تھے کہ ان جیسے لوگوں سے بچانے کے لیے وہ عائشہ کو یہاں لے کر آئے تھے، وہ بھول گئے تھے کہ انہوں نے عائشہ کو اس کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

انہیں لگا ایسا کرنے سے رشتے اور مضبوط ہوں گے۔ عائشہ کا ایک خاندان ہے اسے اسی خاندان کا حصہ رہنا چاہیے اور نعمان ــــ اکثر و بیشتر مری آتا رہتا تھا۔ انہیں اس میں ایسی کوئی خامی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اچھا اور سلجھا ہوا بچہ تھا اور پھر اچھے عہدے پہ فائز بھی تھا۔

غیاث احمد نے عائشہ کی مرضی پوچھی تھی اس نے سارا اختیار انہیں سونپا تھا اور یوں عائشہ کی منگنی، نعمان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ خوش تھے ــــ بہت خوش اور عائشہ، اس کے لیے یہ منگنی ایک معاہدہ کی طرح تھی۔

عام لڑکیوں کی طرح اسے نعمان سے فون پہ لمبی لمبی باتیں کرنے کا کوئی شوق تھا اور نہ ہی اسے نعمان کے ساتھ گھومنا پھرنا پسند تھا۔ وہ اس کا منگیتر تھا، شوہر نہیں اس کے دین نے اس کے لیے کچھ حدود وضع کی تھیں اسے ان حدود کی پیروی کرنا سکھایا گیا تھا۔ وہ صرف کام کی بات کیا کرتی تھی وہ بھی اشد ضرورت میں۔ نعمان کا بار بار کال کرنا اسے مشکل میں ڈال دیتا تھا اور تنگ آکر وہ فون آف کر دیتی تھی اور نعمان ــــ وہ عائشہ کی طرح نہیں تھا وہ ایک عام لڑکا تھا جو کہ منگیتر کو ہی بیوی سمجھنا شروع کر دیا کرتے ہیں۔

عائشہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ ان فرمائشوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی اور ان اعتراضات کو دور نہیں کر سکتی تھی جو کہ نعمان کو اس سے تھے۔

اور نعمان کوئی (نعوذ باللہ) خدا تو نہیں تھا جس کے کہنے پہ وہ ــــ وہ سب کام کرتی جس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ تب اس نے نعمان کے سامنے ایک ایک بات کھول کر رکھ دی تھی۔

"ٹھیک ہے! تمہیں ابھی یہ سب کرنا اچھا نہیں لگتا جائز نہیں لگتا۔ تو کوئی بات نہیں شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔" دوسری طرف سے اس نے نعمان کی آواز سنی تھی۔

"شادی، ایسا سرٹیفکیٹ نہیں ہے نعمان جس سے حرام حلال ہو جائے۔" اسے بے ساختہ غصہ آیا تھا۔

"میں جواب ہوں کل ــــ شادی کے بعد بھی ایسی ہی رہوں گی تم مجھ سے ایسی کوئی توقع مت رکھنا اور اگر ایسی کوئی توقع تمہیں ہے تو بہتر یہی ہے کہ اس بات کو آج یہیں پہ ختم کر دو۔" نعمان اس کے منہ سے ایسی بات سن کر ششدر رہ گیا تھا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔" اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں نے اپنی بات تم تک پہنچا دی ہے آگے تمہاری مرضی۔ میں آج تمہارے کہنے پہ خود کو نہیں بدل رہی تو کل کو شوہر کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی نہیں بدلوں گی۔" عائشہ نے جیسے اسے باور کرایا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"تم! ــــ" نعمان کو بے ساختہ تاؤ آیا تھا۔

"ہو کیا تم؟ اسی باپ کی اولاد جس نے صرف ملک سے باہر جانے کے لیے اپنا دین بدل لیا تھا اور آج تم بڑی دین دار بن رہی ہو۔ تمہیں لگتا ہے اس طرح کرنے سے تمہاری شناخت بدل جائے گی ارے ہو گی تو تم مرتد کی بیٹی۔

عائشہ ارسلان احمد۔" اس لڑکی کو نہیں معلوم تھا کہ دکھ کیا ہے غم کیا ہوتا ہے اور دل پہ چوٹ پڑے تو کیسے سہی جاتی ہے۔

کیا ــــ کہا تم نے؟" وہ ٹھہری ــــ جیسے سانس ہی ٹھہر گیا ہو اور پھر بڑی تیزی سے اس نے سوال کیا تھا۔

"وہی کہا جو تم نے سنا ــــ تمہارا باپ مرتد تھا کافر تھا اور تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے کوئی رشتہ بنایا جا سکے۔

کون سی لڑکی ایسے زندگی گزارتی ہے؟ تم سائیکک ہو ــــ ساری عمر اکیلے رہ رہ کر تمہیں معلوم ہی نہیں رشتے بنائے کیسے جاتے ہیں اور انہیں نبھایا کیسے جاتا ہے۔"

اور اس نے جیسے "تمہارا باپ مرتد تھا" کے الفاظ کے بعد کچھ سنا ہی نہیں تھا کچھ تھا جو کہ پگھل کر اس کی آنکھوں سے باہر آیا تھا۔ سیل اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور اس نے اپنے گالوں کو انگلی سے چھوا تھا۔ انگلی کی پور نم ہو گئی۔

"دادا ــــ" وہ جیسے چیخی ــــ اور پھر وہ چیخ چیخ کر روئی تھی اور روتے روتے بتایا تھا دادا سکتے میں آ گئے تھے ساری عمر جس چیز سے انہوں نے عائشہ کو بچایا تھا وہ سامنے آ گئی تھی۔

"کیا لوگ اتنے ظالم ہوتے ہیں ــــ؟
لیکن وہ لوگ تو نہیں تھے ان کے اپنے تھے۔"
عائشہ کا سر سینے سے لگاتے ہوئے وہ اسے آہستہ آہستہ تھپک رہے تھے۔
"بس بچے صبر کرتے ہیں اس طرح روتے نہیں۔"

گرینڈ پا۔۔۔ میرا باپ۔۔۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں۔" وہ ان سے الگ ہوئی اسے شکوہ تھا، غم تھا۔ دادا نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

یکدم ملنے والی خوشی ہی انسان کو پاگل نہیں کرتی یکدم ملنے والے دکھ بھی ہوش و حواس قائم نہیں رہنے دیتے۔

"میں ایک مرتد کی بیٹی ہوں۔۔۔ میں ایک۔۔۔ یا اللہ میں مر کیوں نہیں گئی۔۔۔ یا اللہ یہ کیسا عذاب ہے؟"

عائشہ ارسلان احمد ہوش و حواس میں نہیں تھی۔

"عائشہ۔" انہوں نے نرمی سے پکارا مگر وہ سن ہی کب رہی تھی۔۔۔ وہ اونچی آواز سے روئے جا رہی تھی اور بولے جا رہی تھی۔

"عائشہ!" آواز پہلے سے ذرا اونچی ہوئی تھی۔

کندھوں سے پکڑ کر انہوں نے اسے زور کا جھٹکا دیا تھا۔

وہ سہم کر چپ ہوئی تھی مگر آنسو بہہ رہے تھے۔ غیاث احمد خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا باپ کافر نہیں تھا؟" انہوں نے سوال کیا۔

"باپ کے مرتد ہونے کا ٹیگ بیٹی پہ نہیں لگ سکتا اس کے اعمال اس کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم اپنے باپ کے کسی بھی عمل کی ذمہ دار نہیں ہو بس بات ختم آج کے بعد میں تمہیں اس بات کے لیے روتا نہ دیکھوں۔" ان کا لہجہ سخت اور حتمی تھا۔

وہ اسے یوں ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ خاموشی سے انہیں جاتا دیکھتی رہی اس کے بعد وہ روئی تو نہیں تھی مگر خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کون تھا جو یہ جاننے کے بعد کہ اس کا باپ مرتد تھا اسے اپناتا؟۔۔۔

غیاث احمد نے اسے تو رونے سے منع کر دیا تھا مگر وہ خود کو نہ روک سکے تھے۔ اس عمر میں ملنے والا دکھ۔۔۔ تبھی انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

ان حالات میں عائشہ اکیلی نہیں تھی اس کی پھوپھیاں تھیں اس کے پاس مگر پھر بھی۔۔۔ اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں۔۔۔ اتنی ساری تسلیوں کے درمیان میں بھی اس نے خود کو یوں اکیلا محسوس کیا تھا جیسے کہ وہ لاوارث ہو اسے ان ڈاکٹرز پہ بھروسہ نہیں تھا جو کہ اس کے دادا کا علاج کر رہے تھے، نہ ہی اسے ان مشینوں پہ اعتبار تھا جو کہ اس کے دادا کے جسم کے ساتھ منسلک تھیں۔ اس کا اعتبار۔۔۔ اس کا یقین صرف ایک ذات پہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ اسے یوں کبھی تنہا چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ اسے معلوم تھا کہ اللہ جانتا ہے اسے دادا کی کتنی ضرورت ہے۔ اور اللہ انسان کو وہ ہی دیتا ہے جیسا بندہ اس سے گمان کرتا ہے۔

غیاث احمد کی صحت بحال ہو گئی تھی وہ آہستہ آہستہ ہی سہی مگر روبصحت تھے۔ بیماری سے تو انسان گزر ہی جاتا ہے مگر غم۔۔۔ یہ کسی بیماری کی طرح انسان کو لگ جاتا ہے۔۔۔ اب اسے کیسے جھیلا جائے۔۔۔

☆ ☆ ☆

"کیسی لگی تمہیں عائشہ؟" وہ جس دن سے مری سے واپس آیا تھا اس سوال کی توقع کر رہا تھا۔ عجیب بات تھی وہ اس سوال سے بچنا چاہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اسے اپنانے یا رد کرنے میں متامل تھا۔ وہ الجھا ہوا تھا۔۔۔

ابھی بھی وہ تبریز صاحب کے سوال کرنے پہ خاموش ہوا تھا۔

"کیا بات ہے علی؟" اور اس سوال پہ بے ساختہ علی نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"ابو ابھی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔۔۔ میں تھوڑا کنفیوژ ہوں۔"

"کیا کنفیوژن ہے؟"

"باقی سب تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر وہ کچھ دقیانوسی ہے۔ جیسا طرز زندگی اس کا ہے۔۔۔ ایسے تو زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔" اس کی بات سن کر تبریز صاحب خاموش ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے علی تبریز۔۔۔ تم اس نعمت کے قابل ہی نہیں تھے۔" انہیں جیسے بے حد افسوس ہوا تھا۔ اور علی۔۔۔ اسے ان کی بات کسی کوڑے کی طرح لگی۔

"کیا بات کر رہے ہیں ابو؟ میں آج اگر شادی کے لیے باہر نکلوں تو لڑکیوں کی لائن لگ جائے۔۔۔ جس لڑکی پہ ہاتھ رکھوں وہ اسے اعزاز سے کم نہ سمجھے اور آپ کہتے ہیں میں اس کے قابل نہیں۔۔۔" اسے تاؤ ہی آگیا۔

"ہاں! لگ جائے گی لڑکیوں کی لائن۔۔۔ کیونکہ وہ سب بھی تمہارے جیسی لڑکیاں ہوں گی۔"

"میرے جیسی؟" اسے باپ کی بات نے حیران کیا۔

"وہ آیت کبھی سنی ہے نیک عورتیں، نیک مردوں کے لیے۔۔۔" انہوں نے سوال کیا مگر وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

عائشہ ایک نیک عورت ہے علی تبریز۔۔۔" اور پھر جیسے اسے اطلاع دی گئی تھی اسے ایک دھچکا لگا۔ تو کیا اس کا باپ اسے اچھا نہیں سمجھتا؟ اس نے تاسف سے اپنے باپ کو جاتے دیکھا الفیئرز چلاتا۔۔۔ چھوٹا موٹا ہیر پھیر کرتا۔ کسی کا کوئی کام کرواتا اور بدلے میں تحائف لینے کو رشوت نہ سمجھتا۔۔۔ سرکاری فون سے لمبی لمبی پرائیویٹ کالز کرتا۔ کبھی کبھی جمعہ کی نماز پڑھ لیتا اور قرآن کو تو ہاتھ لگاتا وہ ایسے سمجھتا تھا جیسے کہ قرآن کا ادب مجروح ہو جائے گا۔

سرکاری گاڑی کا پرائیویٹ استعمال اور پھر لاگ بک میں ہیرا پھیری۔۔۔ اور جھوٹ بولنا تو جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اپنے برابر کے گورنمنٹ آفیسرز کی ٹانگ کھینچنا۔ یہ سب اور ان جیسے دوسرے معاملات۔۔۔ یہ تو زندگی کا حصہ تھے اور انہیں ہر کوئی۔۔۔ کسی نہ کسی طریقے سے اپنی زندگی میں شامل رکھتا ہے۔

اب اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو گیا تھا کہ وہ نیک نہیں رہا تھا۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔

اس کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔ اس کا باپ اسے ایک عام سی لڑکی کے قابل ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی انا بلبلا اٹھی۔ اور پھر جیسے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ ہو گیا تھا۔ اسے صرف عائشہ احمد سے شادی کرنا تھی۔

"تبریز! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ عائشہ ابھی راضی نہیں۔" غیاث احمد نے تبریز کے فون کرنے پہ جواب دیا تھا۔

"مسئلہ کیا ہے؟" تبریز صاحب کو اس انکار سے افسوس ہوا تھا۔

"اتنا خاص نہیں ہے۔۔۔ بس اسے کچھ وقت چاہیے۔"

"اچھا! میں تو۔۔۔"

"تبریز! تم علی کو کہنا کہ جب کبھی مری آئے تو مجھ سے ضرور ملے۔۔۔ میں اس سے کچھ باتیں ڈسکس کرنا چاہتا ہوں ہو سکتا ہے بہتری کی کچھ گنجائش نکل آئے۔"

وہ تبریز صاحب کی بات کاٹ کر بولے تھے۔

"غیاث احمد۔۔۔ میری خوش قسمتی ہو گی کہ عائشہ میری بہو ہے میں ضرور کہوں گا علی سے۔"

"بہت شکریہ!"

"یہ تو اب شرمندہ کرنے والی بات ہوئی نا غیاث احمد۔" انہوں نے فون کے دوسری طرف تبریز کی ناراض آواز سنی تھی۔ وہ ہلکا سا ہنسے تھے اور پھر رسمی کلمات کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اف! یہ بجلی کا مسئلہ پتا نہیں کب حل ہو گا۔" بجلی جانے پہ وہ تپا تھا۔ عائشہ مسکرائی۔ اس کے بات ختم کرنے کی دیر تھی کہ ساتھ ہی جنریٹر آن ہو گیا اور اب یہ جنریٹر کا شور۔۔۔ اسے اب اس پہ بھی اعتراض تھا عائشہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"تمہیں غصہ نہیں آتا کیا؟" علی نے اس کے سکون کو دیکھ کر سوال کیا۔

"غصہ کرنے سے کیا ہو گا؟ ہمارے مسئلے ختم ہو جائیں گے کیا؟" الٹا سوال آیا تھا۔ علی ایک لمحے کے لیے چپ ہوا۔

"ہاں! اب تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ اس ملک کے

حالات بہتر کرے۔۔۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ۔۔۔ علی کی بات پہ چونکی تھی۔ اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔

"آپ کو پتا ہے انرجی کی کتنی فارمز ہیں علی؟" علی نے اس سوال پہ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ کیا اس کا ٹیسٹ لے رہی تھی یا پھر وہ کوئی ففتھ گریڈ کا بچہ تھا جس سے ایسا سوال کیا جائے۔۔۔

"کیا مطلب؟"

"آپ جواب دیں۔۔۔ مطلب بعد میں سمجھاؤں گی۔"

"یہی الیکٹریکل، کیمیکل وغیرہ۔"

"آپ کو معلوم ہے انرجی کی ایک فارم ایسی بھی ہوتی ہے جسے کوئی ٹیچر پڑھاتا ہے نہ لکھواتا ہے۔" اسے عائشہ کی باتیں الجھا رہی تھیں۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتی ہو۔۔۔" اس نے فوراً کچھ کہنا چاہا تھا مگر یکدم وہ چپ ہو گئی تھی۔

"آپ بور ہوں گے!"

"نہیں میں بور نہیں ہوں گا۔"

"شیور؟"

"شیور! بلکہ میں تو دنیا کا واحد شخص ہوں گا جو کہ کسی عورت کے بولنے پہ خوش ہو گا۔"

عائشہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولی۔

"جب میں چھوٹی تھی تو دادا نے مجھے بہت سی چیزیں سکھائیں۔۔۔ اصل میں انہوں نے مجھے دین کے مطابق چلنا سکھایا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے مشکل مشکل باتیں کیا کرتے تھے جو تب تو مجھے سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر آج میں ان کو سمجھنے کے قابل ہوں۔" وہ مدھم آواز میں بول رہی تھی اور علی بازو صوفے پہ ٹکائے، بند مٹھی پہ چہرہ ٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دادا کہا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے دین کی باتوں کی سائنٹیفک طریقے سے تصدیق کرنی چاہیے۔۔۔ حکمت! جسے مومن کی گمشدہ میراث کہا گیا ہے وہ دراصل وہ لاجک ہی ہے جو کہ اسلام کی باتوں۔۔۔ اس کے احکامات میں ہے۔ جس طرح آج میں نے آپ سے انرجی کی فارمز پوچھیں اس طرح دادا نے بھی مجھ سے سوال کیا تھا اور میں نے بھی وہ ہی کہا تھا جو آج آپ نے کہا۔ اس نے ذرا سا سر جھٹکا تھا۔

"اور پھر دادا نے مجھے بتایا کہ انرجی کی ایک اور فارم بھی ہوتی ہے اور اس فارم سے ہمیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آگاہ کیا جو چودہ سو سال پہلے ایک عرب قوم کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ مجھے دادا کی بات عجیب لگی۔ اور آج یہ بات کسی بھی دوسرے شخص کے لیے عجیب ہو سکتی ہے مگر میرے لیے نہیں۔۔۔ آپ جانتے ہیں انرجی کی وہ فارم کیا ہے؟" اس نے سر اٹھا کر علی کو دیکھا علی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دعا!" اور پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولی تھی۔ علی چونکا تھا۔

"دعا؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں! دعا۔۔۔ دادا کہتے ہیں کہ دعا بھی انرجی کی ایک فارم ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ دعا تو اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کا نام ہے اور بس۔۔۔"

"اور آپ جانتے ہیں یہ تعلق کیسے بنتا ہے؟ دعا کیسے اللہ تک پہنچتی ہے۔" ظاہر ہے علی کے پاس جواب نہیں تھا۔

"آپ ذرا دعا کے فلسفے کو کچھ لمحوں کے لیے دین سے الگ کریں اور اس کا سائنسی پہلو دیکھیں۔۔۔ سائنس کہتی ہے ہر وہ چیز جسے زمین سے فضا میں جانا ہے اسے انرجی چاہیے جیسے کہ جہاز۔۔۔ اسے اڑنے کے لیے فیول چاہیے ہوتا ہے۔ جس سے وہ اتنی پاور حاصل کرتا ہے کہ وہ اڑ سکے جیسے کہ راکٹ۔۔۔ شٹل وغیرہ۔ سب کو پاور چاہیے۔۔۔ انرجی چاہیے وہ طاقت کے بل بر زمین سے فضا تک اور پھر خلا تک پہنچ سکتے ہیں تو پھر آپ اس بات کو کیسے صحیح ثابت کریں گے کہ آپ کی دعا 'بغیر کسی قوت کے' بنا کسی طاقت کے ساتویں آسمان تک جا پہنچتی ہے؟ اور سائنس وہ روحانیت کو نہیں مانتی وہ ہر چیز کے ہونے کا جواز۔۔۔ لاجک مانگتی ہے۔۔۔

تب آپ کیسے ثابت کریں گے اپنے دین کو۔۔۔ اس کی باتوں کو۔۔۔ مان لیں کہ دعا بھی ایک قسم کی انرجی ہے تبھی تو یہ سفر کرتی ہے زمین سے آسمان تک۔۔۔ اس کے علاوہ کیا دلیل دیں گے آپ دعا کے زمین سے آسمان تک جانے کی؟۔۔۔"

"مشکل ہے۔۔۔ بہت مشکل۔" علی تبریز نے سر جھٹکا تھا۔

"چلیں ہم! ایک اور طرح سے دیکھتے ہیں۔ بہت پہلے سمندر پار لوگوں سے کمیونیکیشن کا ذریعہ خط تھا' ڈاک خانے بنائے گئے چست و تیز رفتار گھوڑے مہیا کیے گئے تاکہ فاصلے کو کم وقت میں جلدی طے کیا جا سکے پھر انسان نے ترقی کی اور تار آیا۔۔۔ پھر ٹیلی فون اور اب یہ سیل۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا سیل علی کو دکھایا۔

"ٹیلی فون سے کمیونیکیٹ کرنے کے لیے تار کی ضرورت ہے اور موبائل نے اس کا جھنجھٹ بھی ختم کر دیا۔ آپ غور کریں علی! گھوڑے ہوں، ٹیلی فون ہو یا سیل ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے تیز رفتاری۔۔۔ آپ اپنے سیل سے ایک نمبر ڈائل کرتے ہیں سات سمندر پار دنیا کے ساتویں کونے میں موجود دوسرا شخص دوسری ہی بیل پہ کال ریسیو کرتا ہے وہ ہیلو کہتا ہے تو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آواز آپ کو سنائی دیتی ہے۔۔۔ آپ اسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں میں اسے اللہ کے مخفی اسرار کہتی ہوں جسے انسان دن بہ دن کھوجتا جا رہا اور اسے ہم کہتے ہیں ٹیکنالوجی کی ترقی۔۔۔ فون کے اسپیکر میں آپ بولتے ہیں۔۔۔ آواز الیکٹریکل سگنل میں بدلتی ہے یہ سگنلز سفر کرتے ہوئے دوسرے شخص تک جب پہنچتے ہیں تو ریسیور کے ذریعے پھر آواز میں بدل جاتے ہیں۔ بنیادی طور پہ آپ کا پیغام الیکٹریکل سگنلز کی شکل میں سفر کرتا ہے۔۔۔ الیکٹریکل انرجی کی فارم ہے۔

دعا کا بھی یہی حساب ہے آپ کے منہ سے نکلے لفظ کسی انرجی میں بدلتے ہیں اور پھر وہ تیزی سے سفر کرتے ہوئے ساتویں آسمان تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ الگ بات نہ آپ کو اسپیکر کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اللہ کو ریسیور کی۔۔۔ یہ تیز ترین اور براہ راست رابطے جیسا ہے۔۔۔ انسان دن بہ دن تیز سے تیز ترین ٹیکنالوجی کی تلاش میں ہے اور اس دنیا میں سب سے تیز چیز جو سفر کرتی ہے وہ لائٹ ہے جو کہ بذات خود انرجی ہے۔

دنیا میں کوئی چیز نہیں جو کہ روشنی جیسی تیز رفتار ہو بجز دعا کے اور یقیناً" یہ انرجی ہی ہے اور یہ اس سے کہیں زیادہ رفتار سے سفر کرتی ہے جتنا کہ روشنی، معراج کا واقعہ سنا ہو گا آپ نے۔" اس نے رک کر سامنے ٹیبل پہ پڑے جگ میں سے پانی انڈیلتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں!"

"براق کا نام بھی سنا ہو گا؟" اس نے ایک گھونٹ پانی پینے کے بعد پوچھا تھا۔

"سنا ہے۔"

"وہ کتنا تیز رفتار تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پلک جھپکنے میں آسمان تک لے گیا۔ براق جیسی تیز رفتاری اس دنیا کی کسی بھی چیز میں نہیں ہے مجھے لگتا ہے اس جانور کی تیز رفتاری بھی کوئی ٹیکنالوجی ہے آنے والی صدیوں میں ہو سکتا ہے انسان اس ٹیکنالوجی اس اسرار کا راز بھی پا لے۔ پھر اسے دعا کے انرجی ہونے والی بات بھی سمجھ آ جائے گی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (مفہوم) کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قسمت کو بدل سکے، بجز دعا کے۔ دعا ایسی چیز ہے جو قسمت کو بدل دیتی ہے تو پھر یقیناً" یہ طاقت کا ایک خزانہ ہی ہو گی جو کہ قسمت جیسی چیز کو بھی بدل دیتی ہے۔

اللہ پھر کیسے اس مانگی جانے والی دعا کو رد کر سکتا ہے جس میں اتنی پاور ہو۔ اور پتا ہے دعا کا فیول کیا ہے، جو اسے اتنی پاور دیتا ہے؟" اس نے ایک بار پھر علی سے سوال کیا تھا اور علی پھر لاجواب ہوا تھا۔

"دعا اگر ٹریول کرتی ہے تو اسے فیول چاہیے اور یہ فیول ہوتا ہے آپ کا یقین۔۔۔ جتنا یقین زیادہ ہو گا۔۔۔ دعا اتنی ہی تیزی سے ٹریول کرے گی اور پھر اتنی ہی

جلدی قبول ہو جائے گی۔۔۔ علامہ اقبال نے بہت پہلے شعر کی شکل میں کہا تھا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

"دل سے۔۔۔ مطلب۔۔۔ یقین۔
طاقت پرواز۔۔۔ مطلب "اڑنے کی سکت۔۔۔
اور طاقت کسے کہتے ہیں علی تبریز؟" چند لمحوں کی خاموشی ان دونوں کے درمیان آئی تھی۔ ایسی خاموشی جس میں انسان سانس بھی نہیں لینا چاہتا۔

"انرجی کو۔" اور پھر مسکرا کر اس نے کہا تھا۔

وہ خاموش تھا اس کے لیے عائشہ کی باتوں کو سمجھنا مشکل تھا۔ البتہ ایک بات ضرور اسے سمجھ آئی تھی۔ واقعی قسمت کو بدلنے والی چیز دعا کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

تمام انسانوں کی قسمت یا تقدیر کا فیصلہ تب سے ہو چکا ہے جب اللہ نے یہ دنیا بنائی جو کچھ ہو گیا، ہو رہا ہے اور جو ہوتا ہے اسے بدلنے کے لیے کوئی بھرپور طاقت جیسی چیز ہی ہونی چاہیے جو کہ ازل سے طے ہوئے فیصلے کو بدل دے اور وہ دعا کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے؟ وہ سوچ رہا تھا اس کے دماغ میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"مگر عائشہ بہت سی ایسی دعائیں ہیں جو کہ قبول نہیں ہوتیں۔" اچانک اس نے سوال کیا۔

"نہیں علی، کوئی دعا ایسی نہیں ہوتی جسے ہم کہہ سکیں کہ وہ قبول نہیں ہوئی بعض اوقات ہم اپنی دعاؤں میں ایسی چیز مانگ لیتے ہیں جو ان حالات اور وقت میں مناسب نہیں ہوتی تو پھر اس دعا کو مناسب وقت تک ٹال دیا جاتا ہے اور کبھی ہم ایسی چیز مانگ لیتے ہیں جو کہ سراسر ہمارے لیے غلط ہوتی ہے تو پھر کیا اللہ سے آپ کو توقع ہے کہ وہ آپ کے لیے کچھ غلط ہونے دے گا اور آپ شکوہ کرتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوئی اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ وہ بھی مانگ لیتے ہیں جس کے آپ اہل نہیں ہوتے تو تب اللہ آپ کو پہلے اس چیز کے قابل بناتا ہے اور پھر عطا کرتا ہے۔ اور انسان کا وہ ہی شکوہ۔۔۔ دعا کی مقبولیت اس بات پہ بھی منحصر ہے کہ آپ کی دعا میں کتنی طاقت ہے؟ مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ ۔۔۔ کم انرجی والی دعائیں کہیں آسمان اور زمین کے درمیان ہی اٹکی رہتی ہیں اللہ تک پہنچ ہی نہیں پاتیں اور انسان روتا ہے اللہ سنتا نہیں۔۔۔" وہ خاموش ہوئی۔ علی اسے دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے گہرا سانس بھرا۔

"بہرحال ایک عام انسان ان باتوں سے قائل نہیں ہو گا وہ مذہب یا دینی احکام کو ماورائی تصور کرتا ہے مگر ایسا نہیں ہے یہ بات تم سمجھ سکتی ہو میں سمجھ سکتا ہوں مگر عام انسان۔۔۔ اس کے لیے یہ ماننا مشکل ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایسی سوچ کو گستاخی بھی قرار دے۔" علی نے جیسے تبصرہ کیا تھا۔ وہ جواب میں کندھے اچکا کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔ وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی ایسے معاشرے میں جس میں اندھی عقیدت اور تقلید کا راج ہو۔۔۔

☼ ☼ ☼
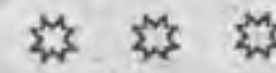
اسے عائشہ احمد کا انکار سن کر حیرانی ہوئی تھی۔

تو کیا واقعی وہ اس کے قابل نہیں تھا؟ وہ اس پہ چار کی بجائے آٹھ حرف بھیج کر اس قصے کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر تبھی تبریز صاحب نے اسے غیاث احمد کی ملاقات والی بات بتائی تھی اور تاکید کی تھی کہ جب کبھی وہ مری جائے تو ان سے ضرور ملاقات کرے۔

وہ اس بات کو بھی نظر انداز کر دینا چاہ رہا تھا مگر عائشہ کا انکار اور باپ کی بات۔۔۔ وہ اسے کسی کانچ کے ٹکڑے جیسی چبھ رہی تھی۔ یہ بہت تکلیف دہ تھا۔ کوئی لڑکی مجھے ریجیکٹ بھی کر سکتی ہے اور میرا باپ اپنے لائق فائق بیٹے کو ایک عام سی لڑکی کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ اسے غصہ آنے لگتا وہ خوامخواہ اپنے ماتحتوں سے بد مزاج ہونے لگتا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنا چاہ رہا تھا وہ اتنی ہی دماغ پہ حاوی ہو رہی تھی۔

پھر غور کرنے پہ پتا چلا کہ غصہ، بے زاری، چڑچڑا پن یہ سب دور ہو سکتا تھا اگر وہ۔۔۔ وہ وجہ جان لے جس کی بنا پہ اسے ریجیکٹ کیا گیا تھا۔

وہ ہی انسان کی متجسس فطرت۔۔۔ اور وہ اتنے فوری فیصلے لینے والا شخص تھا کہ اگلے ہی روز مری جا پہنچا۔ بہانہ بھی معقول تھا یہ وہ نہیں تھا جسے غیاث احمد سے ملنا تھا یہ غیاث احمد تھے جنہیں اس سے ملاقات کرنی تھی اور وہ اتنا سعادت مند اور خوش اخلاق تو تھا ہی کہ کسی بوڑھے شخص کو سفر کی زحمت سے بچالے وہ بھی مری سے لاہور تک کا۔۔۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی علی تبریز کہ تم دوبارہ یہاں آئے۔" انہوں نے اس سے ملتے ہوئے کہا تھا۔

بدلے میں وہ کوئی اخلاق نہیں نبھا پایا بس خموشی سے بیٹھ گیا۔

چائے آ چکی تھی اور غیاث احمد ادھر ادھر کی باتیں کیے جا رہے تھے اور اسے مطلب کی بات سے غرض تھی۔

"انکل! کیا میں وجہ جان سکتا ہے محترمہ کے انکار کی!" وہ بلا ارادہ، لاشعوری طور پر بہت اچانک بول پڑا تھا۔ دماغ میں چھڑی ہوئی جنگ کا نتیجہ۔۔۔

غیاث احمد رکے۔۔۔ اسے غور سے دیکھا اور پھر حیران ہوئے۔

"تمہیں کس نے کہا اس نے انکار کیا ہے؟" اب کے حیرت کا شکار علی ہوا تھا۔

"ابو نے تو مجھ سے یہ ہی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں اسے غلط فہمی ہوئی ہو گی میری بات کا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں نے کہا تھا کہ عائشہ کے کچھ تحفظات ہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولے تھے۔

اور جیسے چبھا ہوا کانچ بنا زخم لگائے نکلا تھا۔ وہ یکدم پر سکون ہوا اور اب اس کا ارادہ خود انکار کرنے کا تھا۔ وہ ہی مرد کی پرانی فطرت۔۔۔

"کیسے تحفظات؟" وہ اب یکدم انکار نہیں کر سکتا تھا سو بات آگے بڑھائی گئی۔

"اسے لگتا ہے کہ وہ رشتوں کو نبھانے میں بالکل ناکام ہے۔"

"ہائیں۔" جواب سن کر اسے وہ لڑکی سائیکو کیس لگی تھی۔ مگر اس نے ابھی جواب سنا تھا وجہ نہیں۔۔۔ اور پھر غیاث احمد نے اسے وجہ بھی بتا دی تھی۔ باپ کے عمل سے لے کر نعمان کے رد عمل تک۔

"ابو یہ جانتے ہیں؟"

"ہاں! اسے معلوم ہے۔"

"اور پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ میں اس لڑکی کے قابل نہیں۔" اسے دھچکا لگا تھا۔ ایک مرتد کی بیٹی کے قابل نہیں سمجھتے کانچ کا کوئی حصہ ابھی بھی کہیں اندر ہی تھا۔

"علی تبریز! کچھ باتیں میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں اس کے بعد جو چاہے فیصلہ کرنا۔" چائے کا خالی کپ واپس رکھتے ہوئے انہوں نے خاموش بیٹھے علی سے کہا تھا۔

"تم ماڈرن ازم یا اپ ٹو ڈیٹ ہونا یا پھر روشن خیالی کسے کہتے ہو؟" پتا نہیں کیوں مگر وہ ہر بار ایسے سوال پوچھتے تھے جس کے لیے انسان کو اپنے دماغ پہ زور دینا پڑے۔ بے اختیار وہ جھنجھلایا اور ابھی وہ ماڈرن ازم کی کوئی جامع تعریف سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دوبارہ بول پڑے تھے۔

"تم اگر بز 90 لوگوں کی طرح روشن خیالی یا پھر ماڈرن ازم گلے میں دوپٹے ڈالنے کو یا پھر بے ہودہ لباس پہننے کو یا مردوں سے بلاوجہ بے تکلف ہونے کو اور ہر اس کام کرنے کو کہتے ہو جس سے دین منع کرتا ہے تو الحمد للہ میری پوتی ایسی ماڈرن نہیں ہے اور اگر تم ماڈرن ازم سوچ کے وسیع ہونے کو کہتے ہو اور اپ ٹو ڈیٹ ہونا اس بات کو سمجھتے ہو کہ انسان زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلے تو میری بیٹی ماڈرن بھی ہے اور اپ ٹو ڈیٹ بھی۔"

انہوں نے جیسے اسے باور کرایا تھا کہ وہ اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس کی جنرل منیجر ہے۔

"وہ جانتی ہے کس بندے سے کب اور کیسے بات کرنی چاہیے۔۔۔ کیا تم ایک PHD ہولڈر سے توقع کرتے ہو کہ اسے سلیقہ نہیں ہو گا نشست و برخاست گفتگو کا، اسے زندگی برتنے کا ڈھنگ نہیں ہو گا؟" وہ

اسے دیکھ رہے تھے اور علی نے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

"اور اب تم دیکھ لو کہ عائشہ تمہاری ماڈرن ازم کی تعریف پہ پوری اترتی ہے یا نہیں۔"

"ایک اور بات میں واضح کردوں آج اگر تم عائشہ سے شادی کا فیصلہ محض اس مفروضے پر کرتے ہو کہ کل وہ بدل جائے تو یہ بات اپنے ذہن میں رکھو علی تبریز ـــ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ شوہر کے کہنے پہ وہ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکامات کو پس پشت نہیں ڈال سکتی۔ شوہر بے شک عورت کی زندگی میں سب سے زیادہ مقام رکھتا ہے مگر پھر بھی وہ (خدا) (نعوذ باللہ) نہیں ہوتا عورتوں کو بھی اللہ کو جان دینی ہے شوہروں کو نہیں۔"

ان کی اتنی سخت بات پہ وہ محض ان کا منہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان سے اجازت لے کر اٹھ چکا تھا اور پھر ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ہمیشہ غیاث احمد کے پاس آکر اسے ایسا کیوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ وہ کوئی احمق ہو جو کوئی بات جانتا ہی نہیں۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ غیاث احمد کی باتیں اس کے دماغ کی کوئی کھڑکی کھول دیا کرتی تھیں۔ ایسی کھڑکی جس سے روشنی اندر آکر سوئے ہوئے شخص کو بے دار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

بے ساختہ اس نے پیشانی مسلی تھی وہ الجھ چکا تھا ـــ وہ انہیں انکار بھی نہیں کرسکا ـــ وہ نہیں جانتا تھا کہ کس چیز نے اس کی زبان باندھی تھی ـــ وہ ہوٹل پہنچ چکا تھا مگر سوچیں ـــ ان کا سفر جاری تھا۔ مری آکر اسے بہت سی باتیں یاد آئی تھیں۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور اسے یاد آیا تھا عورت کی دین داری کو فوقیت دینے والی حدیث۔

اسے یاد آیا کہ بہترین نعمت کیا تھی اس دنیا کی۔

اور اسے یہ بھی یاد آیا آج جب غیاث احمد عائشہ کے باپ کے بارے میں بات کر رہے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ "وہ ارسلان احمد کی اچھی تربیت نہیں کرسکے تھے مگر عائشہ ـــ اس کی تربیت میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ بچوں کی تربیت ماں باپ پہ فرض نہیں قرض کی طرح ہوتی ہے، جو بہرحال انہیں چکانا ہوتا ہے۔"

"تربیت۔" اس نے رک کر اس لفظ پہ غور کیا۔

"بچوں کو اچھی انگریزی بولنی آجائے تم اچھے اسکولز میں تعلیم حاصل کریں، چھری کانٹے سے کھانا کھانا آجائے اور اسی جیسی دوسری بہت سی اہم چیزیں ـــ"

وہ اسے تربیت سمجھتا تھا کیونکہ اس کی ایسی ہی تربیت ہوئی تھی اور وہ بھی ایسی ہی کسی لڑکی سے شادی کرے گا جو کہ کل کو اس کے بچوں کی ایسی ہی تربیت کرسکے۔ بس زندگی یہ ہے اور کیا یہی ہے اس کا مقصد؟ تو پھر مذہب کی جنگ کیوں؟" لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پہ انگلی پھیرتے ہوئے وہ سوچے جا رہا تھا۔

اور پھر یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا تھا یا پھر اسے یہ احساس ہوا کہ اپنے لیے وہ خود کوئی بہترین فیصلہ نہیں کرسکتا ـــ وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے بہترین فیصلہ، کس کا ہوسکتا ہے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر لیپ ٹاپ آف کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ سوچیں اب بھی اس کے دماغ کو تنگ کیے جا رہی تھیں ـــ اور پھر نیند نے ان سوچوں پہ غلبہ پالیا۔

☼ ☼ ☼

جب اس کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس نے دادا کے وکیل کی گاڑی وہاں کھڑی دیکھی تھی۔

پتا نہیں کیوں مگر اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دادا نے وکیل کو اپنی وصیت تیار کرنے کے لیے بلایا ہوگا۔

وہ آج کل بیمار تھے اور عائشہ کو ہی سارے انتظامات کو دیکھنا پڑ رہا تھا ہوٹلز، ریسٹ ہاؤس ـــ یہ کام اس اکیلی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لائر کے جانے کے بعد وہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔

"آپ ایسے کام کیوں کرتے ہیں گرینڈپا! جس سے

مجھے تکلیف ہو۔" کوشش کے باوجود آنکھوں کی نمی کو وہ قابو نہیں کرپائی۔ وہ ان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ وہ مسکرائے۔

"جانا تو ہر ایک کو ہے عائشہ!" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے۔ عائشہ کے دل کے جیسے ٹکڑے ہوئے تھے۔

"دادا پلیز ـــ ایسی بات نہ کیا کریں میں نے ماں دیکھی ہے نہ باپ ـــ سوائے آپ کے آپ کو میرے لیے ٹھیک ہونا ہے ـــ" وہ رو پڑی تھی حالانکہ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

"نہیں عائشہ بچے! روتے نہیں ـــ صبر کرتے ہیں۔" اس نے سر ہلایا مگر پھر بھی آنسوؤں کو پینے میں ناکامی ہو رہی تھی۔

"تم نے رپورٹس دیکھی ہیں نا! میں پہلے سے بہتر ہو رہا ہوں نا صرف اپنے بچے کے لیے ـــ" کمزور سی آواز میں کہتے ہوئے انہوں نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"تو پھر لائر کو کیوں بلایا تھا؟"

"ارے ـــ" وہ ہنس پڑے۔

"کچھ کام ضروری ہوتے ہیں عائشہ!" انہوں نے اس کا سر تھپتھپایا اور پھر انہوں نے عائشہ کو وصیت کی ایک کاپی دی اور ساتھ ہی اسے وصیت سے آگاہ بھی کیا۔

"مجھے کسی چیز کی ضرورت اتنی محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ آپ کی ـــ" ان کی بات ختم کرنے کے بعد وہ نم آواز میں بولی۔

"میں فش بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے ـــ" چند لمحوں بعد اس نے کہا تھا۔ دراصل وہ ـــ وہاں سے دور ہونا چاہتی تھی۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھی۔ دادا کی طبیعت بہت خراب تھی اور ڈاکٹرز اندیشہ ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں پھر سے اٹیک ہوسکتا تھا۔ ان کے پاس بائی پاس کا بھی آپشن تھا مگر ابھی غیاث احمد کا بی پی مسئلہ بنا ہوا تھا۔

عائشہ نے علی کو ساری صورت حال بتائی تھی اس نے کہا تھا آف لے کر وہ چند دنوں بعد آجائے گا۔

☼ ☼ ☼

"تو تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے فیصلہ کروں؟" علی کے بات کرنے پہ تبریز صاحب نے سوال پوچھا تھا۔

"ظاہر ہے اور میں نے کس لیے آپ کو ساری بات سمجھائی ہے۔" وہ بے ساختہ چڑا تھا۔

"بعد میں اگر کبھی تم نے مجھے الزام دیا تو ـــ" اس نے زچ ہو کر باپ کی شکل دیکھی تھی۔

"سوچ لو وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے ـــ"

"میں آپ سے فیصلہ چاہتا ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے ڈرائے جا رہے ہیں۔ عجیب الجھن میں پڑا ہوں آپ کے دوست کے پاس ہوتا ہوں تو لگتا ہے کہ عائشہ کسی نعمت کی طرح ہے اور جب ادھر واپس آتا ہوں تو لگتا ہے کہ مجھے ویسی لڑکی سوٹ نہیں کرتی اور آپ ہیں کہ ـــ" غصے سے بولتے بولتے اس نے ایک ناراض نظر ان پہ ڈالی تھی۔ وہ مسکرائے تھے۔

"جاؤ جا کر ریسٹ کرو ـــ دیکھا جائے گا۔"

وہ چاہتا تھا کہ اس کا باپ فوری فیصلہ کرے مگر وہ ـــ اس نے گھور کر انہیں دیکھا اور پھر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ علی کی فیملی مختصر سی تھی۔ والدہ کی وفات ہوچکی تھی اور وہ تین بھائی تھے۔ دونوں بڑے بھائی شادی شدہ تھے اور وہ اپنے اپنے گھروں میں سیٹل تھے۔ اب تبریز صاحب تھے اور وہ تھا۔

پچھلے دو ہفتوں سے وہ تبریز صاحب کے فیصلے کا منتظر تھا اور راوی اتنا چین میں تھا کہ لکھنا ہی چھوڑ چکا تھا۔

تبریز صاحب نے اس مسئلے پہ غیاث احمد سے لمبی بات کی تھی اور دونوں مشورے سے نتیجے پہ پہنچ چکے تھے۔

اور پھر ـــ اپنے نکاح والے دن اس نے کوئی ایک معقول وجہ ڈھونڈنی چاہی تھی اس فیصلے کے بارے میں ـــ افسوس کہ وہ ناکام رہا۔ یہ خالصتاً "اس کے باپ کا اس کے لیے فیصلہ تھا اچھا یا برا ـــ یہ تو وقت نے ہی

جتاناتھا۔

عائشہ کو نکاح کے بعد اس کے ساتھ لاکر نہیں بٹھایا گیا اور اس پہلی چیز نے ہی اسے تکلیف دی تھی۔

"حد ہے دقیانوسیت کی۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا مگر چند ہی لمحوں بعد اسے عائشہ کے کمرے میں جانے کا عندیہ ملا تھا۔ وہ حیران ہوا یا خوش۔۔۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔

عائشہ کی کسی رشتے دار خاتون نے اسے کمرے تک پہنچایا تھا۔ دروازہ کھولتے وقت اس کے دماغ میں جو عائشہ کی تصویر تھی وہ۔۔۔ وہی تھی کالا دوپٹا لپیٹے ہوئے۔۔۔ عام سے حلیے میں میک اپ کے بغیر۔۔۔

مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو جیسے وہ اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ وہ وہیں چپک سا گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے بت بنا سامنے موجود لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ سرخ رنگ اتنا دلکش تھا کہ اسے بھی حسین بنا دیا تھا یا پھر وہ اتنی خوب صورت تھی کہ اس کے حسن سے وہ سرخ رنگ اپنی قیمت بڑھا گیا تھا۔ لمحوں بعد سحر ٹوٹا۔۔۔ اسے ہوش آیا اور وہ دروازہ بند کرکے اندر آیا۔

وہ نروس تھی یا نہیں البتہ اس کی نظریں اور سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھا مگر یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اسے عائشہ سے کیا کہنا تھا۔ بے ساختہ علی نے گہرا سانس بھرا۔ وہ چند لمحے اور خاموشی کے گزرے تھے۔

وہاں صرف ان دونوں کے سانسوں کا ارتعاش تھا اور پھر خاموشی کو توڑتا ہوا سلام 'عائشہ کی طرف سے آیا تھا۔ وہ گڑبڑایا اور پھر جواب دیا تھا۔

"میں سوچ کر آیا تھا کہ تم ابھی بھی دوپٹے میں لپٹی بیٹھی ہوگی' ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ۔۔۔" وہ بولا اسے لگا وہ مسکرائی ہے۔

اس نے عائشہ کا ہاتھ پکڑا مہندی سے سجا ہاتھ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ چہرہ دیکھنے کی خواہش میں وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے آبیٹھا تھا مگر ہاتھ تو اس نے ابھی بھی نہیں چھوڑا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔۔۔ بنا پلک جھپکائے عائشہ نے نروس ہوکر اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا

۔ اس نے گرفت اور سخت کرلی۔۔۔ اور پھر اس نے عائشہ کو گھبراتے دیکھا تھا اور بے ساختہ وہ ہنسا تھا۔

کیا یہ وہ ہی لڑکی تھی جس نے اپنے آفس میں اسے اچھی خاصی سنائی تھیں؟ اور ابھی وہ کیسے نروس ہو رہی تھی۔

اچانک اسے یاد آیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"عائشہ! کوئی وعدہ نہیں۔۔۔ کوئی دعوا نہیں ہاں البتہ کوشش ہوگی ایک اچھی اور پرسکون زندگی تمہیں دینے اور تمہارے ساتھ گزارنے کی۔" عائشہ کے ہاتھ پہ اس کی گرفت جذبے کی سچائی بتا رہی تھی پھر رک کر اپنی جیب سے ایک کیس نکالا اور ایک خوب صورت سا بریسلیٹ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

"میں یہ کہاں پہناؤں؟" سادگی سے سوال آیا۔ عائشہ نے نا سمجھی سے بے اختیار سر اٹھایا تھا اور اس کی آنکھوں میں شرارت دیکھ کر فوراً" جھکا دیا۔ اس کی دونوں کلائیاں چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں اور پھر خود علی نے اس کا دایاں ہاتھ چوڑیوں سے خالی کیا۔ اور اب اس میں وہ بریسلیٹ پہنا رہا تھا۔

"تم اتنی خوب صورت لگ رہی ہو عائشہ! کہ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ وہ لڑکی نہیں جسے میں پہلے دیکھ چکا ہوں۔" بریسلیٹ پہنانے کے بعد اس نے کہا تھا۔ عائشہ اس دفعہ مسکراہٹ نہیں روک سکی۔ وہ چند لمحے اور اسے دیکھتا رہا اور پھر اسے احساس ہوا کہ اسے کمرے میں آئے کافی وقت ہو چکا ہے اور یہ خاصی بدتمیزی کا مظاہرہ تھا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی جو وہ یوں کمرے میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ اٹھا۔ دروازے پہ رک کر یکدم پلٹا۔ عائشہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے یوں پلٹنے پہ یکدم گڑبڑائی تھی۔

علی نے دل کھول کر قہقہہ لگایا تھوڑی دیر اور اسے دیکھنے کے بعد وہ چلا گیا اور عائشہ نے بے ساختہ اپنے گالوں پہ ہاتھ رکھے۔ اس کے گال تپ رہے تھے۔

اور کمرے سے باہر نکلتے وقت علی تبریز کو سمجھ آیا تھا کہ کیوں وہ یہ مسئلہ لے کر اپنے باپ کے پاس گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ عائشہ کے حق میں فیصلہ دے گا وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ تب وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اس الجھن سے اسے نکال لے۔ تب اسے یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اب آگئی تھی ایک حدیث کی طرح اس کے سینے میں گڑ گئی تھی۔

غیاث احمد نے نکاح صرف اس لیے کیا تھا تاکہ عائشہ کو اس رشتے اور اس کے تقاضے سمجھنے کے لیے تھوڑا وقت مل سکے۔ اس کے تحفظات دور ہو سکیں اسی لیے رخصتی بھی نہیں کی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کا سیل فون متواتر بج رہا تھا مگر وہ اسے مل ہی نہیں رہا تھا۔ سامنے فائلز کا ڈھیر کھلا پڑا تھا اور سیل فون ان فائلز کے ڈھیر کے نیچے۔۔۔ وہ بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔

اس نے فائلز کے اندر پیپرز لگا کر انہیں ترتیب سے رکھنا شروع کیا تبھی سیل پھر سے بج اٹھا۔

اب کی بار وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی۔ گھر سے کال آئی تھی۔

"یا اللہ خیر۔۔۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ریسیو کرنے کے بعد جو خبر اس نے سنی اسے سن کر عائشہ کے منہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل سکی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔۔۔ چند لمحے وہ یوں ہی بت بنی۔۔۔ ساکت بیٹھی رہی اور پھر جیسے دماغ نے کام کرنا شروع کیا غیاث احمد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہیں ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھایا۔۔۔ بدحواس ہو کر وہ آفس سے باہر نکلی۔ باہر اس کی گاڑی اور ڈرائیور موجود تھا۔ اس نے چیخ کر ڈرائیور سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کو کہا۔ ہسپتال پہنچنے پہ پہلے سے بھی زیادہ بری خبر اس کی منتظر تھی۔

غیاث احمد کو دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تھا ڈاکٹر نے اسے بتایا اور وہ خبر سننے کے بعد یک ٹک ڈاکٹر کو دیکھنے لگی اس کا رنگ فق ہوا اور اس کے چہرے سے جیسے کسی نے یکدم سرخی نچوڑلی۔

عائشہ! آپ ٹھیک ہیں۔" ڈاکٹر اپنی جگہ چھوڑ کر اس تک آیا تھا۔

اس کے دل کی دھڑکن اچانک اتنی تیز ہوئی کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"پانی!" اس نے خود کو کہتے سنا۔ ڈاکٹر نے فوراً" پانی کا گلاس اسے دیا۔

پانی پینے کے بعد اس نے گلاس کو یوں مضبوطی سے پکڑے رکھا جیسے کہ شدید خوف کی حالت میں کوئی کسی سہارے کو پکڑتا ہے۔

بے اختیار ڈاکٹر کو اس پہ ترس آیا تھا۔ وہ غیاث احمد کا فزیشن تھا وہ سمجھ سکتا تھا کہ عائشہ کی اس وقت کیا حالت ہو رہی ہوگی۔

اس نے نرمی سے عائشہ کے ہاتھوں سے گلاس لینا چاہا وہ چونکی اور پھر انہیں غائب دماغی سے گلاس پکڑا دیا تھا۔

"تم! کال کرکے کسی مرد رشتے دار کو بلا لو عائشہ!" ڈاکٹر کے کہنے پہ اسے بے اختیار علی کا خیال آیا اور پھر اس نے سب سے پہلے علی کو ہی کال کی تھی۔ اس کے بار بار پوچھنے پر بھی ڈاکٹر زاسے غیاث احمد کی حالت کے بارے میں صحیح سے نہیں بتا رہے تھے۔ وہ کسی مرد سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

کیونکہ وہ تو۔۔۔ ابھی تک اتنی ہمت نہیں کر سکتی تھی کہ دادا کو ہی دیکھ سکے۔ ابھی تو اس نے خوش رہنا سیکھا تھا اور۔۔۔ وہ انہیں پھر سے مشینوں میں جکڑا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ انہیں دادا' کہہ کر پکارے اور غیاث احمد کی سانسوں کا جواب آئے۔

وہ ایک کام کر سکتی تھی۔۔۔ وہ دعا' کر سکتی تھی۔ سو علی کو وہ ہسپتال کے اس ایریے میں ملی تھی جو کہ نماز پڑھنے کے لیے مخصوص تھا۔

علی نے ایک کونے میں اسے دونوں ٹانگیں سینے سے لگائے اور بازوؤں کو ٹانگوں کے گرد لپیٹے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا۔ اسے عائشہ کے دکھ پہ دکھ ہوا تھا۔ اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے علی نے اس کے

کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ وہ چونکی اور پلٹ کر دیکھا اور پھر کتنی کوشش کی تھی اس نے کہ وہ ضبط کر سکے۔۔۔۔ اس کا چہرہ سیکنڈز میں سرخ ہو گیا تھا۔

"علی!" کپکپاتی ہوئی نم آواز علی کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے بے اختیار عائشہ کو ساتھ لگایا تھا اور ضبط قائم نہیں رہ سکا۔ وہ علی کی شرٹ کو مٹھیوں میں جکڑے سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"بس! عائشہ۔۔۔ بس۔" اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے علی نے اسے چپ کروایا تھا۔

"اٹھو، آؤ میرے ساتھ دادا کو دیکھ لو۔"

"نہیں!۔۔۔ میں نہیں اٹھوں گی یہاں سے جب تک گرینڈ پا ٹھیک نہیں ہو جاتے۔" وہ کسی ضدی بچے کی طرح بولی۔ بے ساختہ علی زچ ہوا وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ دادا کو دیکھ لے کیونکہ ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ ڈاکٹرز اسے ساری باتیں بتا چکے تھے۔ چند لمحے بے بسی سے وہ اسے دیکھتا رہا۔

"عائشہ! دادا کتنے ہرٹ ہوں گے جب انہیں پتا چلے گا کہ تم انہیں دیکھنے نہیں آئی تھیں۔" اس کے دونوں ہاتھوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے کسی بچی کی طرح پچکارتے ہوئے وہ بولا تھا۔ جواباً وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میں چلی گئی تو دادا کے لیے دعا کون کرے گا۔"

"دعا تو تم ان کے پاس بیٹھ کر بھی کر سکتی ہو۔"

"مگر۔۔۔۔"

اور وہ اٹھ گئی تھی۔

پہلے تو وہ وہاں سے آنے کے لیے راضی نہیں ہو رہی تھی اور اب دادا کے پاس سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی ان کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگائے وہ مسلسل مگر بے آواز رو رہی تھی۔ غیاث احمد بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ انہیں سویئر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے غیاث احمد کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پہلو میں رکھا اور قرآن کھول کر پڑھنے لگی تھی۔

پڑھتے پڑھتے یکدم اسے پتا نہیں کیسی بے چینی ہوتی وہ رک کر غیاث احمد کا چہرہ دیکھنے لگتی اور پھر جب چہرہ دیکھتے دیکھتے اچانک اسے کوئی خیال آتا تو پھر سے قرآن کھول کر پڑھنا شروع کر دیتی۔ عجیب پاگلوں جیسی حالت تھی اس کی۔

I.C.U میں زیادہ دیر تک مریضوں کے احباب کو رکنے نہیں دیا جاتا تھا سو اسے بھی باہر بھیج دیا گیا تھا۔ جب وہ باہر آئی تو علی ڈاکٹر سے غیاث احمد کو اسلام آباد کے اسپتال شفٹ کرنے کی بات کر رہا تھا۔ وہ رکی نہیں بلکہ پھر سے نماز والے ایریے میں جا بیٹھی۔ اسے نہیں معلوم کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے۔ لاہور میں بھی اس کے رشتے داروں کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ اس کے چند ایک رشتے دار پہنچ بھی چکے تھے۔ علی ہی سب سے مل رہا تھا۔

وہ کمزور تھی۔۔۔ اتنی بڑی جنگ نہیں لڑ سکتی تھی۔ وہ رو سکتی تھی سو رو رہی تھی۔۔۔ دعا مانگ سکتی تھی سو مانگ رہی تھی۔۔۔ وہ کسی سے ملنا۔۔۔ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دادا کے حوالے سے ر کبھی کلمات سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ کسی چوزے کی طرح چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔

نوافل پڑھ کر دعا مانگتے مانگتے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تبھی اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسی جگہ پہ کھڑی تھی جہاں پہ پس منظر میں سفید روشنی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور ہوا نرمی سے انہیں اڑا رہی تھی اچانک کھٹکا ہوا اور اس نے چونک کر دیکھا وہ دادا تھے۔ بے اختیار وہ خوش ہوئی کیونکہ دادا بالکل ٹھیک لگ رہے تھے اور اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ کھٹکے کی آواز اسی چھڑی کی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر دادا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"روتے نہیں بچے۔۔۔ صبر کرتے ہیں۔" اور پھر انہوں نے اپنا مخصوص جملہ کہا تھا یہ جملہ وہ تب کہا کرتے تھے جب وہ بہت رویا کرتی تھی اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

وہ بہت کم خواب دیکھتی تھی اور جب بھی دیکھتی با

معنی دیکھتی اس نے اس خواب کے معنی سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اسے سمجھ آیا کہ دادا ٹھیک ہو جائیں گے ان کا سر پہ ہاتھ رکھنا۔۔۔ اس ایک بات نے اسے پرسکون کیا اور وہ اٹھ کر دادا کو دیکھنے کے لیے جانے لگی راستے میں ہی اس نے علی کو سامنے سے آتے دیکھا وہ اسے آتے دیکھ کر بے اختیار رکی علی کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کے دل کو کچھ ہوا وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکی تھی۔ بلکہ وہ حرکت ہی نہیں کر سکی اور پھر علی اس کے پاس آیا چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اس نے سر جھکایا۔

"عائشہ! تمہارا دعائے انرجی والا فلسفہ فیل ہو گیا۔" اور پھر اس نے علی کو کہتے سنا تھا اسے سمجھنے میں تاخیر نہیں لگی اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا۔ وہ خواب۔۔۔ وہ جملہ "روتے نہیں بچے۔۔۔ صبر کرتے ہیں۔" تو اسے اب صبر کرنا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ صبر کرے۔۔۔ اچانک دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے اپنے منہ پہ پھیرے تھے یوں جیسے خود پہ قابو پانا چاہا ہو اٹک اٹک کر اس نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا تھا۔

وہ اپنے پیروں پہ کھڑا رہنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یکدم ہاتھوں اور پیروں میں اترنے والی لرزش سے وہ گرے نہیں مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ صبر کرنے کی۔۔۔ ضبط کرنے کی اور سیدھا کھڑا رہنے کی، سو اس کا توازن بگڑا تھا۔۔۔ بے اختیار اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

"تو کیا آج کے بعد اسے گرینڈ پا! دیکھنے کو بھی نہیں ملیں گے۔" سینے میں سانس پھنسنے جیسی تکلیف ہوئی تھی۔

"28 سال جس کی شفقت اور محبت کے سائے میں گزارے اب باقی زندگی اس کے بغیر کیسے گزرے گی؟" اس نے خود کو ٹھنڈا پڑتے محسوس کیا وہ وہیں دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

حیرت کی بات تھی مگر وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ علی کو اس کے رد عمل پہ حیرانی ہوئی۔ اس کے خیال میں تو اس خبر کے سننے کے بعد عائشہ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا مگر وہ۔۔۔ صدمے نے اسے اتنا تھکا دیا تھا کہ آنسو بہانے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔

علی نے اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے وہ اس ہجوم کی طرف آیا تھا جو کہ اس کے رشتے داروں نے I.C.U کے باہر لگا رکھا تھا۔

اس کی پھوپھیاں رو رہی تھیں بین کر رہی تھیں عائشہ کو وہ آوازیں سخت کریہہ لگیں۔۔۔ وہ ایسی آوازیں نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے اتنی بے بسی سے علی کو دیکھا تھا کہ علی سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا اور پھر I.C.U سے باہر آتا اسٹریچر۔۔۔ سفید چادر سے ڈھکا وہ مشفق وجود جو اس کی کل کائنات تھا۔

عائشہ نے دیکھا اور وہ علی تبریز کے بازوؤں سے پھسلنے لگی۔۔۔ اس کی کمر پہ وہ چوٹ پڑی تھی جس نے اسے سیدھا کھڑا رہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا 28 سالوں سے وہ اس شخص کا چہرہ دیکھتی آئی تھی اور اب اگلے کئی سال اس شخص کے بغیر گزارنے تھے۔ وہ چہرہ اب کبھی دیکھ نہیں پائے گی۔ یہ غم وہ ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی۔ اس دکھ نے جیسے اسے اپاہج کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

غیاث احمد کی وفات کے تین دن بعد اس نے سب پھوپھیوں کو جمع کیا اور وکیل کو بلوایا تھا۔

اس کے عزیز و اقارب کے خیال میں وہ اس تمام پراپرٹی کی اکلوتی وارث تھی مگر ان کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ غیاث احمد جیسا آدمی کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا تھا۔

ساری جائیداد کی تقسیم شریعت کے مطابق ہوئی تھی ماسوائے اس ریسٹ ہاؤس کے وہ ریسٹ ہاؤس غیاث احمد کی طرف سے عائشہ کے لیے شادی کا تحفہ تھا وہ گھر جہاں پہ اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک کا عرصہ گزارا تھا۔ مادی چیزوں میں وہ اسے سب سے زیادہ قیمتی تھا مگر وصیت کے مطابق اس گھر کو بیچنے کے بعد برابر کا تقسیم کرنے کو کہا گیا تھا۔ باقی سب افراد کے لیے تو غیاث احمد مرے ہوئے ہاتھی جیسے ثابت ہوئے تھے

ان کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی اور عائشہ۔ علی نے اسے گھر کے لان میں اندھیرے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ رات ایک بجے کا وقت ہو رہا تھا اور جب سے وکیل گیا تھا وہ۔۔۔ وہیں سنگی بینچ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ علی کے آنے پہ وہ چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔

وہ خاموشی سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تم کل ریسٹ ہاؤس شفٹ ہو رہی ہو؟" اندھیرے میں علی کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں! اور پھر وہ لوگ اس گھر کو بیچ دیں گے' اپنا اپنا حصہ لے کر اپنی اپنی زندگیوں میں واپس چلے جائیں گے انہیں کون سمجھائے گا علی تبریز۔۔۔ اس گھر کی یادوں میں میرا بھی حصہ ہے۔۔۔ اور وہ یہ حصہ مجھ سے چھین رہے ہیں۔" علی تبریز کو اس کی آواز روتی ہوئی لگی۔

اس نے اپنا ہاتھ عائشہ کے ہاتھ پہ رکھا۔ اس کے پاس لفظ ختم تھے جس سے وہ اسے تسلی دیتا۔

"میں صبر کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ اسی طرح جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے فوت ہوئے۔۔۔ مگر مجھ سے نہیں ہوتا میرا دل چاہتا ہے کہ میں اتنا چیخ چیخ کر روؤں کہ آسمان پھٹ پڑے۔ اللہ سے شکوہ کروں کہ کیوں اس نے میرے دادا کو مجھ سے چھین لیا۔۔۔ مگر کیا عذاب ہے علی تبریز۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔ مجھے ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔" وہ کبھی اتنا نہیں بولتی تھی اور کبھی اس طرح سے اظہار نہیں کیا تھا جس طرح آج کر رہی تھی۔

آواز مدھم مگر دکھ سے بھرائی ہوئی تھی۔

"صبر کیسے کرتے ہیں علی؟" پھر سوال آیا۔

علی کے لیے ہمیشہ اس کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا اب بھی وہ لاجواب ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنا بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلایا تھا اور عائشہ نے چند لمحوں بعد اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکایا اور رات عائشہ احمد کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ کر کے پھسلتی رہی۔۔۔ اور کسی کی ہتھیلیوں کو جلاتی رہی۔۔۔

☆ ☆ ☆

غیاث احمد کی وفات کے چوتھے دن وہ ریسٹ ہاؤس شفٹ ہوئی اور پانچویں دن وہ اپنے آفس میں موجود تھی۔

علی تبریز اور اس کے والد بھی واپس جا چکے تھے۔ علی کی اب پہلی کوشش یہ تھی کہ وہ اپنا ٹرانسفر مری کروا سکے۔ ایک دفعہ اس کا ٹرانسفر ہو جاتا تو پھر گورنمنٹ کی طرف سے رہائش بھی مل جاتی اور یوں عائشہ مری میں اکیلی نہ رہتی اس کی پانچوں پھوپھیاں گھر بیچ کر جا چکی تھیں اور جہاں تک ہوٹلز کا معاملہ تھا تو عائشہ نے ان کے سامنے ایک حل رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دادا کی اتنی محنت کو بیچ کر ضائع کر دیا جائے سو اس نے ان ہوٹلز کی نگرانی اور دیکھ بھال کا ذمہ لیا تھا اور پرافٹ میں پچاس فیصد کی شراکت کی شرط رکھی تھی۔

تب تو اس کے رشتے داروں کو اس ڈیل میں نقصان نظر آیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد وہ سب راضی ہو گئے تھے۔ سو سب کچھ ویسا ہی رہا تھا جیسا کہ دادا کی زندگی میں تھا ماسوائے اس گھر کے۔۔۔

ایک گھر سے۔۔۔ ایک کمرے میں شفٹ ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا اس گھر کو چھوڑنا۔۔۔ اس کی ملکیت سے دستبردار ہونا بہرحال زندگی کا کام چلنا ہے سو وہ اپنے گزارنے والوں کو بھی رکنے نہیں دیتی۔۔۔ جیسی بھی تھی زندگی مگر چل رہی تھی۔

پھر علی تبریز کا ٹرانسفر بھی مری میں ہو گیا۔ تبریز صاحب فی الحال اس کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ انہیں لاہور میں موجود گھر کے کچھ معاملات نبٹانے تھے علی نے ابھی رخصتی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ وہ عائشہ کو وقت دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عائشہ غم اور دکھ کے فیز سے باہر آ جائے تو رخصتی بھی ہو جائے گی۔ اور پھر غیاث احمد کے جانے کے دو ماہ بعد علی نے اس سے بات کی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا اگر وہ اور وقت لینا چاہتی ہے تو لے سکتی ہے اور اس نے کہا۔ "آپ اگر بیس سال بعد بھی مجھ سے یہ بات کرتے تو تب بھی اس

خوشی کے موقع پر میں ایسے ہی غم زدہ ہوتی جیسی کہ آج ہوئی ہوں۔" علی تبریز سمجھ سکتا تھا۔ اس کو.... اس کی حالت کو.... وہ اسے یوں اکیلا بھی تو نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

وہ رخصت ہو کر علی کی سرکاری رہائش گاہ پہ آئی تھی۔ آج جب وہ کمرے میں آیا تو بے اختیار اسے نکاح یاد آیا تھا۔ وہ آج اس دن سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی ہاں آج وہ نروس نہیں تھی مگر وہ علی کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اندر داخل ہو کر علی نے اسے سلام کیا تھا۔

اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ سر ہلانے سے اس کے زیورات بج اٹھے۔ اس نے رک کر اس کے بناؤ سنگھار کو دیکھا تھا۔

علی نے کبھی بھی اسے اتنا بنا سنورا نہیں دیکھا تھا ماسوائے نکاح کے دن یا پھر آج.... اور وہ علی ہی تھا جس نے اسے اتنا سجا سنورا دیکھا تھا۔

عموماً" وہ گھر سے باہر عبایا میں رہتی تھی وہ اکثر اس سے گھر سے باہر ہی ملا کرتا تھا۔ اس لیے اس کا یہ روپ اسے مسحور کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ الماری کی طرف مڑا" الماری سے اس نے ایک فائل نکالی اور فائل لے کر اس تک آیا۔ بلیو کلر کی فائل کے اوپر ریڈ کلر کا خوب صورت فیتا بندھا ہوا تھا۔ اس نے فائل عائشہ کے آگے رکھی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" حسب توقع حیرانی سے پوچھا گیا تھا۔

"پڑھی لکھی ہو کھول کر دیکھ لو۔" شرٹ کے کف کھولتے ہوئے وہ انہیں اوپر کرتے ہوئے عام سے لہجے میں بولا تھا۔ عائشہ جواب پہ اور حیران ہوئی تھی لیکن پھر وہ فائل کو کھولنے لگی تھی۔ اس فائل کو کھولنے کے بعد جیسے اسے سکتہ ہوا تھا۔ وہ غیاث احمد والے گھر کے پیپرز تھے تو وہ گھر علی نے خرید اتھا۔

علی اب اس کے سامنے بیٹھا مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ عائشہ نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ان آنکھوں میں موجود جذبات کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ ان آنکھوں سے جھلکتا تشکر اور محبت اسے مسرور کر رہا تھا۔

"ہوں بری بات...." اس کی آنکھ سے آنسو پھسلتے دیکھ کر وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا تھا۔ عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ یوں جیسے اس کا منع کرنا وہ سمجھ گئی ہو۔

"تمہیں پتا ہے میرے ابو نے مجھے تمہارے قابل نہیں سمجھا تھا.... انہوں نے مجھ سے کہا تھا عائشہ نیک عورت ہے علی تبریز.... مطلب تم میرے لیے نہیں تھیں کیونکہ تم نیک تھیں اور میں نہیں...." اس نے اس کے آگے سے فائل اٹھا کر بند کرتے ہوئے سائیڈ پہ رکھی تھی۔

"جانتی ہوں!" جھکی نظر سے اس نے جواب دیا۔ وہ اس کے جواب پہ بے اختیار دل کھول کر ہنسا تھا اور محبت سے اسے دیکھا۔

"مگر کچھ لوگ اتنے خاص ہوتے ہیں کہ ان کے لیے چنے جانے والے شخص کو بھی خاص بنا دیا جاتا ہے۔ میں اب سوچتا ہوں کہ کوئی دین دار شخص کبھی بھی تمہاری اس طرح سے قدر نہ کرتا جس طرح کہ میں کرتا ہوں۔" جواب میں عائشہ نے اسے دیکھا تھا اور ان نظروں میں شرارت سی تھی یوں جیسے اس کی بات کا یقین نہ ہو....

"سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ خفا ہو کر بولا۔ اب کی بار وہ ہنسی تھی۔

"عائشہ!" پھر اس نے مدھم آواز میں اسے پکارا۔

"میں کوشش کروں گا زندگی میں ہر وہ کام، ہر وہ بات کروں جس سے تم اسی طرح خوش ہو کر ہنستی رہو...." اس کے دیکھنے پہ علی نے عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ عائشہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔ اس نے اسی ہاتھ سے جو علی نے تھام رکھا تھا علی کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور آنکھوں سے لگایا۔ یہ محبت کا اظہار نہیں تھا.... یہ اس سے بڑھ کر کچھ اور تھا....

☼ ☼ ☼
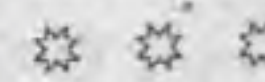
اور پھر زندگی کے اک نئے دور ایک خوشگوار فیز کا آغاز ہوا تھا علی نے خود کو بہت زیادہ تو نہیں مگر تھوڑا بہت بدل ہی لیا تھا۔ وہ عائشہ اور تبریز صاحب احمد ہاؤس میں شفٹ ہو چکے تھے۔

علی نے صحیح کہا تھا وہ عائشہ کی بہت قدر کرتا تھا اس کی عزت کرتا تھا اسے فخر تھا عائشہ احمد اس کی بیوی ہے۔ کبھی اسے اس بات پر رشک محسوس ہوتا کہ اس کی بیوی عام عورتوں کی طرح سر ننگا نہیں کرتی۔ اور بات صرف سر کو ڈھانپنے تک محدود نہیں تھی وہ ہر لحاظ سے مختلف تھی اور کبھی کبھار یہ انفرادیت، علی کے لیے تکلیف کا باعث بھی بنتی تھی وہ اس کے ساتھ تقریبات میں بھی عبایا پہن کر ہی جاتی تھی میک اپ سے عاری چہرے کے ساتھ.... زندگی میں لوگوں کے بنائے ہوئے اصولوں کی ہی کیوں تقلید کی جائے ان اصولوں پہ کیوں نہ چلا جائے جو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے وضع کر رکھے ہیں....

کیا لوگ توقع کرتے ہیں کہ ان کے اصول اللہ کے اصولوں سے بڑھ کر ہیں؟

دین پہ عمل کرنا مشکل نہیں یہ دراصل آپ اور ہم ہوتے ہیں جو اسے مشکل بنا دیتے ہیں۔

اور کون ہے جو اس مشکل کو آسان کرے؟

☼ ☼ ☼

"اگر جانا ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی تم کو اس طرح سے چھوڑ کر نہ جاتا وہ بھی ایسے میں جب بابا بھی عمرہ کرنے گئے ہوئے ہیں۔" بریف کیس میں پیپرز اور فائلز رکھتے ہوئے وہ کوفت سے بول رہا تھا۔

"پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ رخسانہ ہے نا میرے پاس اور پھر گیٹ پہ گارڈ بھی موجود ہے۔" اس نے جیسے علی کو تسلی دی تھی۔

"آپ کا ڈرائیور چھٹی پہ ہے کیا؟"

"ہاں!" وہ اب مڑ کر ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔

"اور آپ اچھے ڈرائیور نہیں ہیں سو بی کیئر فل۔" علی نے شیشے میں سے اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کو دیکھا اور مسکرایا۔

"او کے! اور کچھ؟" اس نے مسکراتے ہوئے اپنی کلائی عائشہ کے آگے کی تھی۔

"اور یہ کہ وہاں لڑکیوں کو تاڑنا نہیں ہے صرف اپنا کام کرنا ہے۔" اس کی کلائی پہ گھڑی باندھتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

"واٹ؟" اسے کرنٹ لگا تھا۔

"محترمہ! اچھا خاصا شریف مشہور ہوں میں ڈیپارٹمنٹ میں۔" اس نے سخت احتجاج کیا۔

"مشہور ہونے میں اور اصل میں ہونے بڑا فرق ہے۔" وہ اب علی کو کوٹ پہنا رہی تھی۔

"کمال ہے! اتنی نیک نامی بھی کسی کام نہیں آئی۔" وہ ناراضی سے بولا اور اب کی بار عائشہ ہنس پڑی تھی۔

"اچھا اپنا خیال رکھنا اور...." وہ کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔

"اور؟" عائشہ نے دہرا کر پوچھا۔

"اور.... اور کچھ بھی نہیں۔" وہ کھسیانا ہوا تھا۔

"اور یہ کہ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا یہی کہنا تھا نا آپ کو؟"

عائشہ نے اس کا جملہ پکڑنے اور مکمل کرنے کے بعد خفگی سے پوچھا تھا۔ "کوئی ضرورت نہیں جلدی آنے کی آپ عام حالات میں اتنی ریش ڈرائیونگ کرتے ہیں جلدی میں پتا نہیں کیا طوفان آئے گا.... آرام سے آنا بے شک کل صبح آجانا مگر اللہ کے واسطے جلدی نہ کرنا...." اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔

اور علی تبریز نے خالصتاً" اس بیویوں والی نصیحت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑایا تھا۔ جب طوفان کا آنا طے ہو تو وہ کسی چیز سے نہیں ٹلتا اور طوفان تو آیا تھا تب.... جب علی تبریز نے جلدی واپس آنے کی کوشش کی تھی اور گاڑی کھائی میں تو گرنے سے بچ گئی تھی مگر تیز رفتاری کے باعث وہ مری میں سائیڈ پر بنے پہاڑوں سے جا ٹکرائی تھی۔ وہ ایک شدید اور زبردست ایکسیڈنٹ تھا اور علی تبریز وہ بری طرح

زخمی ہوا تھا پتا نہیں اس کی زندگی میں خوشیوں کے لمحات اتنے مختصر کیوں ہوا کرتے تھے ابھی تو محض ایک سال ہوا تھا اس کی شادی کو اور اسے بتائے بغیر چارہ نہیں تھا حالانکہ وہ اس خبر کے سننے کی متحمل نہیں تھی۔

ہسپتال مختلف تھا مگر وہی I.C.U ۔۔۔ وہی عائشہ ۔۔۔ وہی اندر مشینوں میں جکڑا اس کا کوئی بہت پیارا ۔۔۔ وہی ہسپتال کا نماز والا مخصوص حصہ ۔۔۔ اور پھر وہی اس کی حالت سے فرار حاصل کرنے کی کوشش یوں جیسے آنکھیں بند کر لینے سے وہ سب ۔۔۔ وہ حقیقت خواب میں بدل جائے گی۔ خبر سننے کے بعد اس کا دل چاہا وہ بال نوچے ۔۔۔ چیخے چلائے۔ مگر پھر وہی نصیحت وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی

"اور مدد مانگو ساتھ صبر کے اور نماز کے۔" اسے یہی سکھایا گیا تھا سو وہ اسی طریقے سے مدد مانگ رہی تھی۔

دادا کے لیے دعا مانگتے وقت اس کا یقین اس کے ساتھ تھا اور بنا پروں والی چیز نے آسمان تک کا سفر بھی کیا تھا مگر مہلت ختم ہو چکی تھی۔ لکھا ہوا وقت آچکا تھا اور اس دعا کو سنبھال کر رکھ دیا گیا تھا اور اب ۔۔۔ الفاظ اس کے منہ سے نہیں دل سے نکل رہے تھے۔ یقین کا قبول بھی تھا ۔۔۔ اور وہ آسمان تک روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ وہ بول رہی تھی پکار رہی تھی اور اللہ سن رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر اللہ سے کہہ رہی تھی کہ علی تبریز کی اسے ضرورت ہے ۔ ایک دفعہ پھر وہ اللہ کو بتا رہی تھی کہ وہ اس غم کو سہہ نہیں پائے گی۔

"تو کیا اب اس کا دعا کا فلسفہ کامیاب ہونا تھا یا فیل ۔۔۔"

اور اب تو علی تبریز بھی نہیں تھا جو اسے سہارا دیتا ۔ پھر رخسانہ اسے زبردستی وہاں سے اٹھا کر لے گئی تھی ۔ اس نے کل رات سے ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پیا تھا۔ علی تبریز کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کے بچنے کے چانسز محض 30% تھے۔

آئی سی یو کے باہر رکھی چیئر پہ وہ بیٹھی تھی اور رخسانہ نے زبردستی اسے پانی پلایا تھا تبھی اس نے ایک نرس کو آئی سی یو سے گھبراتے ہوئے دوڑ کر باہر نکلتے دیکھا۔ "بیڈ نمبر بارہ کا پیشنٹ۔" نرس کہہ رہی تھی پتا نہیں کیوں مگر پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا اور پھر اس نے ڈاکٹرز کو دوڑ کر آئی سی یو کے اندر جاتے دیکھا بے اختیار وہ کھڑی ہوئی تھی رخسانہ بھی بدحواس ہوئی۔

بیڈ نمبر بارہ کا مریض علی تبریز ہی تھا یہ بات رخسانہ جانتی تھی وہ نہیں ۔۔۔ اس نے آئی سی یو کے اندر جانے کی کوشش کی۔

"بی بی! تم اندر نہیں جا سکتا ۔۔۔" آئی سی یو کے باہر موجود شخص نے اسے روکا تھا۔

"مجھے جانے دو ۔۔۔ بس ایک نظر دیکھنے دو اللہ کا واسطہ ہے۔" عائشہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ ایسی صورت حال سے ان لوگوں کا واسطہ پڑتا رہتا تھا سو اس نے عائشہ کو جانے نہیں دیا۔ مگر پھر بھی وہ زبردستی اندر چلی گئی اور تیزی سے بیڈ نمبر بارہ کے پاس جا پہنچی۔

"گل خان ۔۔۔ خان ۔۔۔" کرٹن ہٹانے پہ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر پوری قوت سے چلایا تھا۔

"اس عورت کو کس نے اندر گھسنے دیا نکلوا سے باہر!" ڈاکٹر نے سخت غصے سے کہا۔ اور پھر دو نرسوں نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا تھا کیونکہ وہ تو بے جان ہو چکی تھی۔

اس نے بیڈ نمبر بارہ کے مریض کے جسم کو جھٹکے لگاتے دیکھا اس نے اس شخص کو تڑپتے دیکھا۔ ڈاکٹر کے کرنٹ پاس کرنے پہ اس کا جسم بیڈ سے کچھ فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اور پھر اس نے ایک ڈاکٹر کو عین علی تبریز کے سینے میں ایک انجکشن لگاتے ہوئے دیکھا جان بچانے کی آخری کوشش اور وہ بے جان ہوئی تھی۔ نرسز رخسانہ کو جھڑک کر اسے سنبھالنے کا کہہ کر دوبارہ اندر چلی گئیں۔ اور وہ ۔۔۔ سکتے کی سی کیفیت میں اپنے دونوں زانو پہ گری تھی۔

چند لمحے وہ اسی حالت میں رہی تھی جامد ۔۔۔ بے حس و حرکت ۔۔۔ رخسانہ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر "یا اللہ!" پورا ہسپتال اس کی دلدوز ۔۔۔ دل کو پھاڑ دینے والی چیخ نما پکار پر دہل کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک چمکیلی دھوپ والی صبح تھی۔ ایسی دھوپ جس میں بیٹھنا انسان کے لیے راحت کا باعث ہو جو جسم کو سکون نما حرارت پہنچاتی ہو۔

سیب کی قاش کاٹ کر اس نے سامنے بیٹھے شخص کے منہ میں ڈالی تھی۔ وہ شخص وہیل چیئر پہ تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ پلستر میں جکڑی ہوئی تھی اور اس کی سہولت کے لیے وہیل چیئر کے سامنے کرسی رکھ کر ٹانگ کو اس کے اوپر رکھا گیا تھا اس کی ٹانگ کے نیچے ایک کشن بھی رکھ دیا گیا تھا۔

نہ صرف ٹانگ بلکہ اس کا دایاں بازو اور بایاں ہاتھ بھی پلستر میں جکڑا ہوا تھا اور چہرے کی حالت گو کہ پہلے سے بہتر تھی مگر پھر بھی اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اب بھی کئی زخم اس پہ موجود تھے۔ اس کی ایک پسلی بھی فریکچر تھی اور جو خون بہا وہ الگ قصہ تھا۔

عائشہ نے ایک اور قاش علی تبریز کی طرف بڑھائی تھی۔ جسے اس نے کھانے سے منع کر دیا۔ عائشہ نے وہ قاش اپنے منہ میں رکھ لی۔

"میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں عائشہ!" عائشہ نے نرم نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ایک دفعہ میں نے ایک کالم پڑھا تھا جس میں ایک غیر ملکی کتاب کا ذکر تھا۔ اس کتاب میں مرنے کے بعد دوبارہ واپس آنے والے افراد کے تاثرات قلم بند کیے گئے تھے۔"

"اچھا پھر؟"

"جب میں آئی سی یو میں تھا تو مجھے ایسا لگا کہ میں نے بھی اس چیز کو محسوس کیا ہے۔"

"پلیز علی! وہ وقت نہ یاد دلائیں ۔۔۔ نہیں جانتے آپ کیسی تکلیف ہوتی ہے۔"

"دیکھو! میں بالکل ٹھیک ہوں اور تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ تم سنو تو سہی ۔۔۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی عائشہ چپ ہوئی تھی۔

"جب میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا مجھے بس یہ یاد رہا کہ گاڑی تیز رفتاری کے باعث بے قابو ہوئی تھی میں نے اسے کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے اس کا رخ پہاڑ کی طرف موڑ دیا تھا اور پھر اس کے بعد کا وقت ۔۔۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی نیند میں ہو ۔۔۔ اور اس نیند کی حالت کو جس چیز نے توڑا تھا ۔۔۔ وہ ایک سخت اذیت والی تکلیف کی لہر تھی جو میں نے اپنے پیروں سے ٹانگوں میں اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی۔ ایسی تکلیف عائشہ! کہ بیان سے باہر ہے یوں جیسے ہزاروں شیشے کی کرچیاں آپ کے خون میں شامل ہو کر نسوں کو کاٹنے لگیں۔"

عائشہ کی آنکھیں اتنی بھر آئیں کہ اب وہ بہنے لگی تھیں مگر علی تبریز اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"اور پھر اس تکلیف سے میں تڑپنے لگا تکلیف کی لہر پیروں سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف آ رہی تھی اور جہاں جہاں وہ اذیت نما تکلیف ختم ہو رہی تھی میں نے جسم کے ان حصوں کو کسی ٹھوس چیز کی طرح بھاری اور سرد پڑتے محسوس کیا تکلیف تھی کہ پھیلتی ہی جا رہی تھی پیروں سے ٹانگوں میں اور ٹانگوں سے سینے تک ۔۔۔ اور میں تھا کہ تڑپتا ہی جا رہا تھا۔

عائشہ کے آنسو اب ٹھوڑی سے نیچے قطروں کی صورت میں گر رہے تھے وقفے وقفے سے مگر مسلسل ۔۔۔

"اور پھر مجھے یوں لگا کہ جیسے سانس آنا بند ہو رہا ہو ایسے جیسے کوئی منہ پہ تکیہ رکھ کر سانس کو دبانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ تکلیف پچھلی تکلیف سے بڑھ کر تھی۔ میں اپنی پوری قوت لگا کر زور سے سانس لینے کی کوشش کرتا مگر میرا سانس گردش ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ سینے میں ہی پھنس گیا تھا۔ اف ۔۔۔ عائشہ میں بتا نہیں سکتا میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تب مجھے احساس

دیا شیرازی

آسیب کی سیاہی

ہوا کہ میں مر رہا تھا میرا سانس صرف سینے تک تھا اور اس سے نچلا حصہ کسی گلیشیئر کی طرح سرد اور بھاری ہو چکا تھا۔ پھر اچانک میرے جسم کو ایک زوردار انتہائی تکلیف دہ جھٹکا لگا اور اس کے بعد... میں نے خود کو اتنا ہلکا محسوس کیا تھا جتنا کہ ہوا میں اڑنے والا کوئی تنکا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت ٹھنڈک کا سا احساس ہوا تھا جیسے میں نے برف کے تالاب میں چھلانگ لگا دی ہو... اور پھر... وہ کیا تھا... شاید روشنی بہت زیادہ سفید... دھندلی سی روشنی... تبھی میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ہوا میں چت لیٹا تیر رہا ہوں اور وہ روشنی — میرے اوپر تھی اور میں آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اس روشنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اچانک یوں محسوس ہوا تھا کہ کوئی طاقت... مجھے اس روشنی تک بڑھنے نہیں دے رہی۔ میں اوپر جانا چاہ رہا تھا مگر وہ طاقت مجھے نیچے کھینچ رہی تھی اتنی زیادہ تھی عائشہ یوں جیسے میرے ساتھ ہزاروں رسیاں باندھ کر کوئی مجھے نیچے کی طرف کھینچ رہا ہو میں جو کہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھ رہا تھا اب نیچے کی طرف کھینچا جا رہا تھا —

اور وہ روشنی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی... اتنی دور کہ مجھے اب اس کا دھندلا سا عکس نظر آ رہا تھا تبھی میرے زور سے سانس لینے کی کوشش پوری ہو گئی تھی اور کوئی چیز کرنٹ کی طرح میرے پورے جسم میں دوڑی تھی اسی وقت میں نے کسی نوکیلی چیز کو اپنے سینے میں پھنستے ہوئے بھی محسوس کیا۔ اور پھر اندھیرا چھاتا چلا گیا تھا۔"

وہ دور کسی خلا میں موجود کسی نقطے کو دیکھ کر بول رہا تھا۔ بات ختم کر کے اس نے عائشہ کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ تر تھا۔

"جب میں نے وہ کالم پڑھا تھا تو اس کا مذاق اڑایا تھا لیکن آج میں سمجھ سکتا ہوں کہ ہر چیز مذاق میں نہیں اڑائی جا سکتی۔" علی اب اس کی آنکھوں میں نرمی سے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ عائشہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ فورس... وہ طاقت... وہ انرجی... وہ اس کی دعا تھی۔ آخری وقت میں اس کا چیخ کر اللہ کو پکارنا... دعا ہی تو تھا۔

مگر علی تبریز نے شاید غیاث احمد کے ساتھ عائشہ کے دعا کے فلسفے کو بھی دفنا دیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا اور عائشہ اسے یاد کروانا بھی نہیں چاہتی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ پھر وہ کبھی اس سے آ کر کہے کہ "تمہارا دعائے انرجی والا فلسفہ فیل ہو گیا۔"

وہ اس بات کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ دعا فیل ہو گئی تھی ہو سکتا تھا کہ کسی اور وقت میں مانگی گئی دعا اب اس کے کام آئی ہو اور وہ اس کے سامنے زندہ بیٹھا ہوا تھا۔

"اب کیا کوئی اور ثبوت چاہیے تھا؟" اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا۔

اور کیسی عجیب بات ہے انسان ہر حالت میں آسمان کی طرف ہی دیکھتا ہے۔ دکھ ہو' خوشی ہو' تشکر ہو' بے بسی ہو' عاجزی ہو یا پھر مانگنا ہو۔ انسان ہر حالت میں اوپر کی طرف ہی دیکھتا ہے۔ حالانکہ اوپر دیکھنے پر تو صرف نیلا آسمان ہی دکھائی دیتا ہے مگر وہ نہیں جس سے اظہار ہو رہا ہوتا ہے۔"

"دراصل! یہ آپ کا یقین ہوتا ہے جو آپ کو اوپر دیکھنے پہ مجبور کرتا ہے۔"

"دو یقین..."

"اور ساری کہانی... اسی ایک بات کی تو تھی۔

"اللہ کے لیے ایسا مت کریں رحم کھائیں مجھ پر۔ میں آپ کی نوکرانی بن کر اس گھر میں رہوں گی۔ مجھے اس گھر سے مت نکالیں۔" وہ ناصر کے پاؤں میں گری گڑگڑا رہی تھی، رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

ناصر اس وقت فرعون بنا تنا کھڑا تھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا۔ برسوں سے اس کے سینے پہ دھری سل آج بے وزن ہو گئی تھی۔ تیرہ سالوں بعد اس کی فتح کا دن آیا تھا۔ وہ کیسے نہ مناتا، کیسے اس پاؤں میں گرے وجود سے پل پل کا حساب نہ مانگتا، ایسے کیسے جانے دیتا۔

"یہ سزا تم نے خود منتخب کی تھی تو اب کیوں رو رہی ہو۔" وہ تنفر سے بولا۔

"مجھے معاف کر دیں میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر اس گھر کے بغیر، رحم کھائیں۔"

"میں تمہیں اب ایک منٹ اس گھر میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ تیرہ سال۔۔۔ تیرہ سال مسلسل تم نے میری زندگی کو عذاب بنائے رکھا۔ بہت غرور تھا تمہیں خود پر، بہت حقیر لگتا تھا میں تمہیں اپنی نظروں میں، اب تمہیں پتا چلے گا جب در، در کی ٹھوکریں کھاؤ گی۔ ناشکری عورت۔" وہ شعلے اگل رہا تھا۔

"میرا کوئی قصور نہیں تھا ناصر، میں نے بہت کوشش کی، بہت، لیکن اگر اللہ نے میرے نصیب میں اولاد نہیں لکھی تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں بے بس ہوں۔" وہ ٹوٹنے لگی۔

"تمہارے نصیب میں نہیں لکھی تو تم اپنے نصیب کی سیاہی میری زندگی میں کیوں گھول رہی ہو۔ میں باپ بن سکتا ہوں اور میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ مجھے اب تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔" ناصر کے الفاظ برچھیوں کی طرح اس کے دل پر گھاؤ ڈال گئے۔

تیرہ سال کا ساتھ تھا ان دونوں کا تیرہ سال وہ اکٹھے ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے رہے تھے اور آج وہ سفاک بنا اسے کتنی آسانی سے گھر چھوڑ جانے کو کہہ رہا تھا۔ اسے لگا اس نے تیرہ سال ایک ریت کا گھروندہ بنانے میں لگا دیے تھے۔ جسے ناصر کی ایک ٹھوکر نے پل بھر میں پھر سے ریت کا ڈھیر بنا ڈالا تھا۔

وہ مسلسل روئے جا رہی تھی ناصر کے پاؤں میں گری اپنے ناکردہ گناہوں کی معافیاں مانگے جا رہی تھی۔ لیکن ناصر کا دل پتھر بن چکا تھا۔ وہ اپنی تذلیل بھولنے پہ ہرگز تیار نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"ناصر میں اب اور صبر نہیں کر سکتی۔ دو سال بہت ہیں انتظار کرنے کو ہمیں اب ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔" وہ الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے بولی۔

"کیوں۔۔۔" ناصر کی پوری توجہ میچ پر لگی تھی۔ اس کی آنکھیں ٹی وی اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں۔ بیوی کی بات کا اس نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ارم اس کی بے توجہی پہ جھنجلا کے پلٹی۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں ناصر۔"

"ہاں بولو۔" وہ بدستور ٹی وی پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"آپ میری بات توجہ سے سن کیوں نہیں رہے۔" ارم نے ریموٹ اٹھا کر والیوم کو میوٹ کر دیا۔ ناصر نے آواز کا تسلسل ٹوٹنے پر ٹھنڈی آہ بھری اور پوری توجہ سے ارم کی طرف پلٹا۔

"بولو کیا کہہ رہی تھیں تم۔" ناصر کی نظریں اب اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ارم بیڈ کی پائینتی پہ ٹک گئی۔ "میں کہہ رہی تھی۔ اب ہمیں سنجیدگی سے بچے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مہوش ایک بہت اچھی ڈاکٹر کا بتا کے گئی ہے میں چاہتی ہوں ہم کل ہی اس کے کلینک چلیں۔" وہ پرجوش ہو کر بتانے لگی۔

"اوہ تو یہ مہوش صاحبہ کا مشورہ ہے۔ جب ہی آپ ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے چکر میں ہیں۔ ہاں بھئی تمہاری کلوز فرینڈ ہے۔ اس کے کہے کو کیسے ٹال سکتی ہو تم۔" ناصر نے روایتی شوہروں کی طرح اس کی دوست پر چوٹ کی۔

"تو پھر آپ کل چل رہے ہیں؟" وہ خوش ہوئی۔

"جو حکم آپ کا میں بھلا انکار کر سکتا ہوں؟" ناصر نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرا اٹھی۔

"اچھا اب تو ٹی وی کا والیم بڑھا دو۔ پہلے ہی آدھا میچ نہیں دیکھ پایا۔" ناصر نے کہا تو وہ مسرور سی اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"دو سال ہو گئے ہیں تمہارا علاج کرتے ہوئے لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہیں پہلے بھی اتنی بار کہہ چکی ہوں جب تک تمہارا شوہر تعاون نہیں کرے گا۔ تم بچے کا خیال چھوڑ دو۔ میں تمہیں بار بار اتنی ہیوی میڈیسن نہیں دے سکتی۔ تم کچھ اپنی صحت کا بھی سوچو اگر تمہارا شوہر ساتھ نہیں دے رہا تو چھوڑ دو بچے کا خیال۔ جب اللہ نے چاہا ہو جائے گا۔ اپنے سر پر سوار مت کرو اس چیز کو۔" وہ مسلسل سر جھکائے ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی۔

"وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں وہاں یہ باتیں طعنہ سمجھی جاتی ہیں مردوں کے لیے۔ وہ کبھی علاج کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"تو پھر تم بھی یہ خیال دل سے نکال دو۔" لیڈی ڈاکٹر غصے سے بولی۔

"نہیں نکال سکتی۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"آپ کو نہیں پتا ان کی فیملی میں اب ان کی دوسری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ چار سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو؟ اگر ناصر ساتھ نہ دیتا تو اس کے گھر والے کب کے مجھے گھر سے نکال چکے ہوتے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کمی ناصر میں ہی ہو جب ہی وہ دوسری شادی کے لیے اصرار نہیں کر رہا اس طرح اس کا بھی تو بھرم قائم ہے۔ جو دوسری شادی کی صورت میں پاش پاش ہو جائے گا۔" لیڈی ڈاکٹر سیما نے ایک نئے نکتے کی طرف اس کی توجہ دلائی جس کی اس نے فوراً تردید کر دی۔

"ایسی بات نہیں ہے دراصل ناصر بہت اچھا انسان ہے۔ وہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ دوسری شادی کر کے وہ مجھے تکلیف نہیں دینا چاہتا۔" اس نے ناصر کا بھرپور دفاع کیا۔ لیڈی ڈاکٹر مسکرا دی۔

"تمہارا شوہر اتنا اچھا ہے کہ دوسری شادی کر کے تمہیں تکلیف نہیں دے سکتا اور جو اس کی ضد کی وجہ سے دن رات تم تکلیف میں گزار رہی ہو اس کی اسے کوئی پروا نہیں، بہت بھولی ہو تم ارم۔۔۔"

"میں نے کہا نا ان کے ہاں اس چیز کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔" ارم نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی اس مرتبہ لیڈی ڈاکٹر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ گہری سنجیدگی نظر آنے لگی۔

"اگر ناصر چپکے سے اپنے ٹیسٹ کروائے تو کون جا کر اس کی برادری میں ڈھنڈورا پیٹے گا میں، تم یا خود ناصر۔ تم بہت معصوم ہو ارم اور وہ تمہاری معصومیت سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس نے اس آزمائش کی گھڑی میں تمہیں تنہا تکلیفیں اٹھانے کو چھوڑ دیا ہے اور جب پھل کھانے کی باری آئے گی تو وہ حق دار بن بیٹھے گا۔ دراصل اس کے اندر یہ ڈر چھپا ہوا ہے کہ اگر اس کی رپورٹس کلیئر نہ آئیں تو وہ تمہارے سامنے نیچا پڑ جائے گا۔ جو اسے کسی صورت منظور نہیں۔ وہ ساری عمر تمہیں مورد الزام ٹھہرا کر خود بری الذمہ ہونا چاہتا ہے۔ دوسری شادی نہ کر کے وہ تم پر احسان نہیں کر رہا۔ بلکہ اپنے اس خوف سے بچنا چاہ رہا ہے۔ جو اسے دن رات چین نہیں لینے دے رہا کہ اگر دوسری شادی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو لوگوں کی انگلیاں اس پر اٹھیں گی۔ شاید اسے یہ بھی ڈر ہو کہ اگر اس کی رپورٹ صحیح نہیں آئیں تو تم اسے چھوڑ کے نہ چلی جاؤ۔" ڈاکٹر نے بات ابھی مکمل نہیں کی تھی کہ وہ بول اٹھی۔

"میں اسے چھوڑ کے کیوں جاؤں گی۔ میں نے اس سے شادی بچے کے لیے تو نہیں کی۔ میں نے تو اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنایا ہے۔ میں نے اس سے خوشیاں اور غم بانٹنے کے لیے شادی کی ہے۔ اگر وہ اولاد کے

قابل نہیں ہے تو یہ ہم دونوں کا مشترکہ غم ہوگا۔ میں اسے یہ غم سہنے کے لیے اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔ زندگی بھر کا ساتھ ہے ہمارا۔" وہ اضطراب میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ یہ ایک بے ساختہ حرکت تھی جو اس کی ذہنی کیفیت کی نشاندہی کررہی تھی۔ اسے اولاد نہ ہونے کا غم نہیں تھا۔ اسے ناصر کا ساتھ نہ دینے کا شکوہ تھا۔ لیکن لوگوں کی باتوں نے اس کے غم کو اس کی زندگی کا ناسور بنادیا تھا۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرنے لگی تھی۔ ڈاکٹر سیما کو اس کی حالت پہ رحم آگیا۔

"تم ناصر کو لے آؤ میں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔" ارم نے ایک امید بھری نظر ڈاکٹر کے چہرے پہ ڈالی۔

"کیا آپ اسے منالیں گے۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔" لیڈی ڈاکٹر نے اسے ایک آس کی ڈوری تھمادی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھیں مسٹر ناصر آپ ایک پڑھے لکھے سمجھ دار شخص ہیں۔ میڈیکل سائنس نے آج اتنی ترقی کرلی ہے کہ باآسانی پتا لگایا جاسکتا ہے کہ اولاد نہ ہونے کا سبب میاں، بیوی میں سے کون ہے۔ میں آپ کو بلیم نہیں کرتی، لیکن آپ گزشتہ دو سال سے صرف اپنی بیوی کا علاج کرائے جارہے ہیں۔ وہ بے چاری دوائیاں کھا کھا کے دوائیوں کا ڈھیر بن چکی ہے۔ پھر بھی بے اولادی کا طعنہ اسے ہی سننے کو مل رہا ہے۔ آپ محض اپنی جھوٹی انا کی خاطر اس کا ساتھ نہیں دے رہے۔ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ ظلم ہے اس کے ساتھ۔" ناصر کافی دیر سے لیڈی ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر غصے سے بل پڑ گئے تھے۔ لیکن وہ اسپتال کے ماحول کے احترام میں خاموش بیٹھا تھا۔ صبح جب ارم نے اسے ڈاکٹر کے بلاوے کا بتایا تو وہ یہی سمجھا ارم کے متعلق ہی کوئی بات ہوگی۔ اگر اسے اس وقت تھوڑا سا بھی اندازا ہوتا کہ ڈاکٹر اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہے تو وہ کبھی نہ آتا۔

"دیکھیں ڈاکٹر صاحبہ اگر ارم ماں نہیں بن سکتی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھ میں کوئی کمی ہے۔ میں الحمدللہ بالکل فٹ ہوں۔ آپ ارم کا علاج جاری رکھیں اللہ نے چاہا تو ہمیں اولاد ہوجائے گی۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" وہ نپے تلے انداز میں بولا۔ ایک عورت کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرنا اسے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

"میں نے کب کہا کہ آپ میں کوئی کمی ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنے ٹیسٹ کروالیں تاکہ تسلی ہوجائے۔ پھر میں زیادہ بہتر انداز میں علاج کرسکوں گی۔" وہ جان بوجھ کے نرم لہجے میں بولیں۔ تاکہ ناصر کو یہ بات کم سے کم بری لگے۔

"آپ کو جتنے بہتر انداز میں علاج کرنا ہے۔ آپ کریں، آپ یہ سمجھ لیں کہ میری رپورٹس کلیئر ہیں۔ اس کے بعد آپ کو جو علاج اپنانا ہے آپ وہ اپنائیں۔" وہ ایک زعم سے بولا۔

"ناصر صاحب میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میں بغیر رپورٹس کے کچھ بھی سپوز نہیں کرسکتی۔ میری ذمہ داری ہے کہ میں پیشنٹ کا صحیح علاج کروں۔ میں ان کی زندگی سے نہیں کھیل سکتی۔" لیڈی ڈاکٹر دوٹوک انداز میں بولیں تو ناصر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اپنی بیوی کو کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہوں۔ اس شہر میں ڈاکٹرز کی کمی نہیں ہے۔ اٹھو ارم۔" اس نے بیوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ یہ ساری صورت حال اس کے لیے غیر متوقع تھی۔

"آپ میری بات تحمل سے سنیں بیٹھیں پلیز۔" ڈاکٹر سیما بھی اس اچانک صورت حال پر گھبرا گئیں۔ ارم کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی ہوگئی تھی۔ وہ اسے چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ وہ ایک ایمان دار ڈاکٹر تھیں۔ اس لیے ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ ان کی جگہ اگر کوئی اور ڈاکٹر ہوتی تو جھوٹی آس کے سہارے ایک لمبے عرصے تک ارم کے وزٹ لگواتی رہتی اور اس طرح اپنی جیبیں بھرتی رہتی۔ انہیں ڈر تھا۔ یہاں سے نکل کر ارم کسی غلط ڈاکٹر کے ہاتھ نہ لگ جائے جو نئے سرے سے اسے تختۂ مشق بنادے۔ ناصر ایک لمحے کو رک گیا۔ اس کے چہرے پر ایسی بے زاری چھائی ہوئی تھی کہ وہ جلدی اپنی بات مکمل کریں تو وہ جائے۔

"ٹھیک ہے۔ میں سپوز کرلیتی ہوں کہ آپ کی رپورٹس کلیئر ہیں۔ مجھے ایک اور چانس دیں۔ شاید اوپر والے کو اس مرتبہ اس بے چاری کے حال پر رحم آجائے۔"

ناصر کے چہرے پر اک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☼ ☼ ☼

تیرہ سال ہوگئے۔ وہ اس کٹھن راستے پر تنہا چلتے چلتے تھکن سے چور ہوچکی تھی۔ ناصر کی انا کا بت اپنی جگہ ایستادہ تھا۔ گزرتے سالوں نے اس کے چہرے کے رنگ اور ہنسی چرالی تھی۔ وہ اب ایک بنجر زمین بن چکی تھی۔ جس پر ہریالی کا دور، دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ گزرتے سالوں نے اگر اس کی جھولی میں کچھ ڈالا تھا تو وہ بانجھ پن کا طعنہ تھا۔

ڈاکٹر سیما اپنی تمام تر کوششوں کے بعد مایوس ہوچکی تھیں۔ تیرہ سال سے جو انہوں نے ارم کو آس کی ڈوری تھمائی تھی۔ وہ آج واپس لے لی تھی۔

"دیکھو ارم میں تمہیں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ خدا کی ذات سے مایوس ہونا کفر ہے۔ بس دعا کرو ناصر کے دل میں خود ہی یہ خیال آئے اور وہ علاج کے لیے تیار ہوجائے۔ تمہارے لیے خوش خبری کہوں یا بدخبری تمہاری ساری رپورٹس صحیح آرہی ہیں۔ ان تیرہ سالوں میں مجھے بخوبی اندازا ہوچکا ہے کہ کمی تم میں نہیں ناصر میں ہے۔" ڈاکٹر سیما دھیمے لہجے میں آہستہ، آہستہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ ارم کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بدترین مایوسی کا شکار ہوچلی تھی۔ قصور نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے تیرہ سال لوگوں کے طعنے سنے تھے۔ خود پہ ہوتی الزاموں کی بوچھاڑ سہی تھی۔ وہ پتھر نہیں تھی انسان تھی۔ ایک نرم ساول رکھنے والی معصوم سی لڑکی وہ کب تک یہ برداشت کرپاتی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ اس کے ساکن وجود میں کوئی جنبش نہ پاکر ڈاکٹر نے اس کا کندھا ہلایا۔

"تم سن رہی ہو میری بات۔۔۔ ارم تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔" وہ کچھ زور سے بولیں۔ تاکہ وہ نوٹس لے۔ ارم بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر سیما کی بات سن کر وہ اضطراب کے عالم میں اپنی انگلیوں کو مروڑنے لگی۔ ڈاکٹر کو اس کی حالت پہ افسوس ہونے لگا۔ انہیں یاد آیا جب ارم نے پہلی بار ان کے کلینک میں قدم رکھا تھا۔ تب وہ کتنی خوش ہنستی مسکراتی اور زندگی سے بھرپور لگ رہی تھی۔ اسے اپنے شوہر سے عشق تھا۔ ناصر کے ذکر پر اس کے چہرے پہ ہزاروں رنگ بکھر جاتے تھے گزرتے سالوں میں اس کی بدلتی ہوئی حالت نہ دیکھ چکی ہوتیں تو کبھی یقین نہ کرتیں کہ سامنے کرسی پر بیٹھی اپنی انگلیوں کو بے دردی سے مروڑتی ارم وہ ہی ہنس مکھ لڑکی ہے۔

وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اپنا بیگ اٹھایا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر سیما چونکی نہیں تھیں۔ اس کی یہ حالت کافی عرصے سے تھی۔ وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہوجاتی اور باتیں کرتے، کرتے اچانک اٹھ کر چلی جاتی۔ ڈاکٹر سیما نے اپنا چشمہ اتارا اور آنکھوں میں آنے والی نمی کو ٹشو سے صاف کیا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر پہنچی تو اس پہ ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ ناصر اس وقت بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹی وی کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ ناصر اسے پکڑنے کو دوڑا، لیکن تب تک ٹی وی ٹوٹ چکا تھا۔

"پاگل عورت۔" ناصر نے ایک زناٹے دار تھپڑ

اسے رسید کیا۔
"ہاں ہوں میں پاگل۔" وہ بھی زور سے چلائی۔
"پاگل ہی ہوں جو اتنے عرصے سے قصور نہ ہوتے ہوئے بھی بانجھ پن کے طعنے سن رہی ہوں۔ پاگل ہی ہوں جو تمہارا قصور اپنی پیشانی پر سجائے لوگوں سے کتراتی پھر رہی ہوں۔ پاگل ہی ہوں جو تمہاری بزدلی کو محبت سمجھتی رہی ہوں۔ تم دوسری شادی سے اس لیے انکار کرتے رہے کہ کہیں سرعام تمہارا بھانڈا ہی نہ پھوٹ جائے اور میں تمہاری احسان مند ہوتی رہی کہ تم میری وجہ سے شادی نہیں کر رہے ہو اور میں تمہاری باتوں میں آتی رہی۔ تیرہ سال میں نے ڈاکٹروں کے چکر لگا لگا کے خود کو ہلکان کر لیا۔ دوائیاں کھا کھا کر بے زار ہو گئی۔ کوئی ذی ہوش کبھی تمہارے لیے یہ سب نہ کرتا جو میں نے اپنے پاگل پن میں تمہارے لیے کیا ہے۔ ہاں میں پاگل تھی۔ تمہاری محبت میں۔ لیکن اب نہیں۔ اب مجھے ہوش آگیا ہے۔ آج ڈاکٹر نے مجھے یہ کہہ کر جواب دے دیا کہ کمی تم میں نہیں تمہارے شوہر میں ہے اور جب تک وہ علاج نہیں کروائے گا بچے کا خیال چھوڑ دو۔ میری ساری رپورٹس کلیئر ہیں۔ دیکھو غور سے دیکھو نہیں۔" ارم نے اپنی ساری رپورٹس ناصر کی طرف ہوا میں اچھالیں — وہ ساکن بت بنا کھڑا رہا۔ گزشتہ سالوں میں وہ بھی اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ ارم کی بدلتی ہوئی حالت بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ لاکھ اعتراف کرتا، لیکن اندر کہیں اسے بھی یہ بات چبھ رہی تھی کہ ارم کی اس حالت کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اگر شروع میں ہی وہ ہمت کرتا تو وہ لوگ آج ایک خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ اگر اولاد نا بھی ہوتی تو کم از کم ارم کو اس سے اتنے گلے شکوے نہ ہوتے۔ بلکہ وہ صبر کر چکی ہوتی۔ گزرے تیرہ سالوں میں اس نے بہت مرتبہ سوچا۔ لیکن ہمت نہ کر پایا ٹیسٹ کروانے کی۔ آج جب ارم نے اپنی رپورٹس اس کی طرف اچھالیں تو اسے سخت ہتک کا احساس ہوا۔ کتنا غرور تھا اس لمحے ارم کے چہرے پر اور کتنی حقارت تھی ناصر کے لیے اس کی آنکھوں میں۔ اسی لمحے ناصر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی اپنے ٹیسٹ کروائے گا۔ اگر رزلٹ ٹھیک آیا تو وہ بھی ارم کے منہ پر ایسے ہی رپورٹس مارے گا اور اگر رزلٹ ٹھیک نہ آیا تو وہ کسی سے ذکر ہی نہیں کرے گا۔ اب یہ گومگو کی کیفیت ختم ہونی چاہیے۔ ارم اب پہلے جیسی بے وقوف نہیں رہی تھی۔ وہ بات بے بات اسے طعنے دیتی رہتی تھی۔ کبھی بے اولادی کے تو کبھی بزدلی کے وہ ہمیشہ ان الزامات کی تردید کرتا رہتا تھا۔ لیکن ناصر کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اور ارم اس چیز کا بہت فائدہ اٹھاتی تھی۔ گزرتے وقت نے اس کو جتنی تلخی دی تھی وہ اب سود سمیت واپس لوٹا رہی تھی۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ کوئی کمی نہیں ہے مجھ میں۔" ناصر چیخا۔ لیکن اس بار آواز میں وہ دم نہیں تھا۔
"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔" وہ بپھر گئی۔
"لاؤں گا۔ ثبوت بھی لاؤں گا اور لا کر منہ پر ماروں گا تمہارے اور یاد رکھنا اگر میری رپورٹ کلیئر نکلیں تو میرے گھر والے نوچ کے کھا جائیں گے تمہیں اور میری دوسری شادی کروا دیں گے۔" ناصر نے اسے ڈھکی چھپی دھمکی دی۔
"قبول ہے۔" وہ سختی سے گویا ہوئی۔
"ایک بانجھ عورت کے ساتھ یہ معاشرہ کیا سلوک کرتا ہے۔ پتا چلے گا تمہیں جب در در کی ٹھوکریں کھاؤ گی۔ تب تمہیں اپنے گھر اور چھت کی قدر ہوگی۔ ناشکری عورت۔ لیکن پھر میں ایک لمحہ نہیں رکھوں گا تمہیں اس گھر میں۔ سمجھیں تم۔" ایک اور دھمکی۔
"قبول ہے؟" وہ بدستور ڈٹی رہی۔ ارم نے اپنی زندگی کی بازی لگا دی تھی اور شدت سے فیصلے کی منتظر تھی۔

☼ ☼ ☼

رپورٹ ناصر کے ہاتھوں میں تھی اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے خوشی سے۔ پہلے تو اس نے ایک اچھے مسلمان کی طرح شکر ادا کیا۔ پھر اس کے اندر فرعون نے سر اٹھایا۔
"ارم۔" وہ زور سے دھاڑا۔ غصہ، نفرت، انتقام، خوشی، شکر، فخر اور رعونت کے سارے جذبات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ خود بھی اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سارے احساس ایک ایک کر کے ختم ہونے لگے اور اس کی جگہ غصے اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ تیرہ سال وہ جس خوف سے بھاگتا رہا تھا آج آزاد ہو گیا تھا۔
"ارم۔" وہ پہلے سے بھی تیز آواز میں دھاڑا۔
ارم جو اس وقت نماز پڑھ رہی تھی۔ جلدی، جلدی سلام پھیر کر ننگے پاؤں دوڑتی آئی۔
"کیا ہوا، خیریت تو ہے۔" اس کی نظر ناصر کے ہاتھ میں پکڑے کاغذات پہ پڑی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔
"بہت ہو گئیں تمہاری من مانیاں، اب اپنا سامان باندھو اور نکلو میرے گھر سے۔" وہ اس کی طرف لپکا۔
"لیکن کیوں... کہاں جاؤں گی میں۔" وہ ناسمجھی کے عالم میں بولی۔
"بہت شوق تھا تمہیں مجھے رسوا کرنے کا۔ دیکھو قسمت نے تمہیں ہی رسوا کر دیا۔ میری رپورٹس کلیئر آئی ہیں، دیکھو۔" ناصر نے ارم ہی کے انداز میں رپورٹ اس کے منہ پر ماری۔ ارم کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اور آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ اپنی قسمت سے اور بھی شکوہ ہونے لگا۔ پہلے کیا کم اذیتیں تھیں کہ قسمت نے ایک اور میرے کھاتے میں ڈال دی، پہلے اولاد نہیں تھی۔ اب گھر اور شوہر بھی چھن رہے تھے۔ دربدری کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ آج کے دور میں جب سگے رشتے ہی رکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ سوتیلے بھائی کے در پر کیسے جا کر رہے گی۔ سو در کی ٹھوکر کھانے سے ایک در کی ٹھوکر بہتر تھی۔ اس نے ہتھیار پھینک دیے اور اس فرعون کے قدموں میں سر رکھ دیا۔
"مجھے معاف کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گی، نوکرانی بن کر رہوں گی۔ خدا کے لیے مجھے مت نکالیں اس گھر سے رحم کھائیں مجھ پر۔"
"میں تمہیں اب مزید ایک پل بھی اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ نکلو میرے گھر سے۔" وہ اسے پاؤں سے ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ گھر جو برسوں ان دونوں کا رہا تھا۔ یکلخت سارے کا سارا ناصر کا بن گیا۔ وہ تیرہ سال اس گھر کو دینے کے بعد بھی تہی داماں رہی۔
"میں تمہیں... طلا..."
"نہیں... نہیں... خدا کے واسطے ایسا مت کریں۔" وہ تڑپ اٹھی۔ اسی وقت ڈور بیل بجی۔ وہ دونوں یکلخت خاموش ہو گئے۔ ناصر نے ایک حقارت بھری نظر اس پہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ دم سادھے ہمہ تن گوش بنی رہی۔
"کون..." ناصر نے پوچھا۔
"صاحب میں ہوں ڈاکیا۔" ناصر نے دروازہ کھول

دیا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھ سے تھوڑی غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے ناصر احمد کی رپورٹس غلطی سے آپ کو دے دی تھیں۔ آپ کے ایڈریس پر بھیجی گئی رپورٹس ناصر احمد خان کے نام سے ہیں یہ رہی آپ کی رپورٹ۔"

ڈاکٹر نے رپورٹ ناصر کی طرف بڑھائی۔ ناصر کی سانس رک گئی۔ رپورٹ کھولتے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اسے اپنے کانوں میں اپنی ہی دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ ایک نظر رپورٹ پر ڈال کر اس نے پرانی رپورٹس ڈاکٹر کو دیں اور دروازہ بند کرکے ارم کے قریب چلا آیا اور اس کے سامنے ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک اپنی سابقہ حالت میں بیٹھی تھی۔

"ارم۔۔۔" ناصر نے اس کا کندھا چھو کر دھیرے سے اسے ہلایا۔ ارم نے اپنا کندھا پیچھے کرلیا۔ جیسے ناصر کا لمس اسے اچھا نہ لگا ہو۔

"میری بات غور سے سنو۔" وہ تمہید باندھنے لگا۔

"خدا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ اگر اس نے اس وقت تک ہمیں بے اولاد رکھا ہوا ہے تو اس میں بھی ہماری کوئی بھلائی پوشیدہ ہوگی۔"

"تو تمہیں اب یہ بات سمجھ میں آئی ہے۔" وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔

"ان تیرہ سالوں میں، میں نے جو رویہ تمہارے ساتھ روا رکھا میں اس پہ شرمندہ ہوں۔"

"بس شرمندہ ــــــ اس ایک جملے سے میرے تیرہ سال، میری ہنسی، میری خوشیاں، میری بے تحاشا محبت جو صرف تمہارے لیے تھی۔ کیا سب کچھ لوٹا پاؤ گے۔" وہ کلس کے سوچنے لگی۔

"مجھے پتا ہے، تم نے میری وجہ سے بہت سی تکلیفیں سہی ہیں۔ میری ایک ضد کی وجہ سے تم اتنے سال سولی پہ لٹکی ہو۔"

"صرف تکلیفیں۔۔۔ میں تو ان سالوں میں کئی مرتبہ مر کر زندہ ہوئی ہوں تم صرف تکلیفوں کی بات کرتے ہو۔" وہ صرف سوچ رہی تھی۔ بول نہیں رہی تھی۔

"میرا بھروسا کرو میں ان سب تکلیفوں کا مداوا کروں گا۔"

"کس۔۔۔ کس چیز کا مداوا کروگے۔ کوئی ایک چیز کھوئی ہو تو کہوں بھی۔"

"دیکھو ارم تم ایک پڑھی لکھی عورت ہو۔"

"تو کیا تم نہیں تھے، پڑھے لکھے۔"

"اولاد ہونا نہ ہونا یہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"تو تمہیں اب یہ سمجھ آیا ہے، جب بات تم پہ آئی ہے۔"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"میرا قصور تھا؟"

"تم سن رہی ہو نا میری بات۔" ناصر نے اس کے ساکن وجود کو جھنجھوڑا۔ ارم نے ایک لمحے کو اس پہ نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب خالی پن تھا۔ جیسے کسی گاؤں کے پلیٹ فارم سے ریل گاڑی جانے کے بعد عجیب سکوت چھا جاتا ہے۔ جس میں جھینگروں کی آواز نمایاں ہونے لگتی ہے یا جیسے ای۔ سی۔ جی کی لکیر لمبے فاصلے تک سیدھی چلی جائے۔ ناصر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔

"مجھے معاف کردو ارم۔۔۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔"

ناصر نے ارم کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔ ارم کی ساکن آنکھوں سے دو قطرے گرے۔

"معاف کیا۔" ارم کی بے تاثر آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ارم۔۔۔" ناصر نے اس کے ڈھلکتے وجود کو بازوؤں میں تھاما۔

ارم اس کے نصیب کی ساری سیاہی اپنی مانگ میں سجائے دور جا چکی تھی۔

☆ ☆

انا

نسیم سحر

میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔

بلکہ ماں کیا۔۔۔ باپ کو بھی نہیں دیکھا۔ نانی بتاتی ہیں کہ میرا باپ شہر کا ایک کامیاب اور مشہور بزنس مین تھا، لیکن بدقسمتی سے وہ میری پیدائش سے چند ہفتے پہلے ایک کار ایکسیڈنٹ میں وفات پا گیا۔ وہ میری ماں سے بے حد محبت کرتا تھا اس کی جدائی نے میری ماں کو بھی دنیا سے بے زار کردیا اور مجھے جنم دینے کے بعد وہ بھی دنیا چھوڑ گئی۔

ایسا نہیں تھا کہ میں کوئی غریب یا لاوارث بچہ تھا اور غربت میں پلا بڑھا۔ نہیں بلکہ میں ایک شاندار گھر میں رہتا ہوں گاڑی، نوکر چاکر سب موجود ہیں، نانی ہیں اور سب سے بڑھ کر مجھے پالنے والی میری انا۔

انا۔۔۔ دبلی پتلی خوب صورت نازک سی انا جنہوں نے مجھے پالا، میرے سارے کام انا کرتی تھیں حالانکہ گھر میں اور بھی نوکر تھے، مگر میں انا سے ہی اپنے سب کام کرواتا تھا اور وہ بھی نہایت محبت اور خوشی سے میرے سب کام کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا، مجھے اسکول چھوڑنے جاتیں اور جب چھوٹا تھا تو واپسی تک گاڑی میں ہی اسکول سے باہر میرا انتظار کرتیں پھر ذرا بڑا ہوا تو گھر کے دروازے پہ میرا استقبال کرتیں، مجھے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں بعض دفعہ نانی کہہ بھی دیتیں کہ

"فرحان بیٹا انا تھکی ہوئی ہے یا انا کی طبیعت ٹھیک نہیں اسے آرام کرنے دو۔" ایسے میں، میں فوراً انا کی طرف دیکھتا تو وہ مسکرا کر مجھے اپنے سینے سے لگالیتیں۔

"نہیں بی بی جان کوئی بات نہیں فرحان کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"مگر بیٹا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" نانی جان بھی بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح انا کا خیال رکھتی تھیں اور انا بھی ہمیشہ ان کو عزت سے بی بی جان کہہ کر بلاتی تھیں۔

"فرحان کو دیکھ کر تو میں جیتی ہوں بھلا اس کے کام کرکے کیسے تھکوں گی۔" انا بی بی جان کو جواب دیتیں تو بی بی جان مسکرا کے چلی جاتیں اور میں ہنستے ہوئے اپنی انا کے گلے میں جھول جاتا۔

وقت ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہا تھا، میں اپنی نانی کی شفقت اور انا کی محبت بھری چھاؤں میں عمر کی منزلیں طے کرنے لگا۔ مجھے ماں باپ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی سوائے ایک موقع کے اور میں حیران بھی ہوتا تھا کہ مجھ سے اتنی محبت کرنے والی انا میری یہ بات کیوں نہیں مانتیں۔

اپنے اسکول فنکشن پہ میں ہمیشہ انہیں لے جانا چاہتا، ضد کرتا، روٹھ جاتا، مگر وہ نہایت پیار سے مجھے منالیتیں اور سمجھالیتیں جو میری سمجھ میں کبھی نہیں

آتا اور پھر میں روتا بسورتا بظاہر ان سے ناراض نانی جان کے ساتھ چلا جاتا مگر واپسی پہ اپنے فرسٹ آنے اور انعام جیتنے کی خوشی میں انا سے اپنی ناراضی بھول جاتا اور آتے ہی سب سے پہلے ان سے لپٹ جاتا اور وہ بھی تو دروازے پہ ہی میری راہ دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ مجھے گلے لگاتیں، خوب پیار کرتیں۔ مجھ سے پورے فنکشن کی روداد سنتیں اور پھر میری پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دیتیں۔ ایسے میں ہلکی سی نمی ان کی آنکھوں میں آجاتی۔

مجھے انا کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کون تھیں اور کہاں سے آئی تھیں۔ ان کا شاید کوئی تھا بھی نہیں۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ بطور گورنس میرے لیے رکھی گئی ہیں اور میرے لیے یہی بہت تھا۔ میں ان کی کل کائنات تھا تو وہ ہی میرے لیے تیز دھوپ میں گھنا سایہ تھیں۔ میری ایک ایک ضرورت، خواہش کا خیال رکھنے والی، زندگی اسی طرح پر سکون انداز میں گزرتی رہی۔ انا دن بہ دن کمزور ہو رہی تھیں۔ حالانکہ اس گھر میں ان کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک فرد کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ پھر نہ جانے کون سا دکھ ان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ شاید کسی اپنے کے نہ ہونے کا۔ میں نے کئی بار ان کو نانی جان سے بات کرتے اور پھر روتے دیکھا۔ لیکن میری آمد پر وہ ایک دم خاموش ہو جاتیں اور میرے اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے نانی جان سے بھی پوچھا تو انہوں نے یہی کہا۔

"اس کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی دکھی ہو جاتی ہے۔"

ایسے میں انہیں خود سے قریب کر لیتا اور میرے اس عمل سے ان کی آنکھوں میں اطمینان سا اتر آتا۔ انہیں یقین ہو جاتا کہ میں ان کا بیٹا ہوں، میرا BBA کا آخری سال تھا۔ اب کی بار میں نے کہہ دیا تھا کہ آپ کو میرے ساتھ یونیورسٹی جانا ہے۔ اگر نہیں گئیں تو پھر میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ انا نے صرف مسکرانے پہ اکتفا کیا۔ پھر رزلٹ سے ایک دن پہلے میں نے ان کو یاد دلایا تو انہوں نے حسب معمول انکار کر دیا اور بہت اصرار پہ بھی نہیں مانیں تو میں نے ان سے بات نہیں کی حیرت کی بات تھی کہ انہوں نے پروا بھی نہیں کی۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ میں زیادہ دیر ان سے ناراض نہیں رہ سکوں گا۔

دوسرے دن صبح میں تیار ہو کر بی جان کے کمرے میں گیا انا وہیں تھیں۔ مگر میں نے دانستہ ان کو نہیں دیکھا۔ بلکہ بی بی جان کو مخاطب کیا۔

"بی بی جان آج میں یونیورسٹی سے دوستوں کے ساتھ جاؤں گا اور شام تک آجاؤں گا۔" انا خاموش رہیں۔ بی بی جان نے مجھے پیار کیا۔ دعائیں دیں اور جلد آنے کی تاکید کی۔ میں ایک نظر انا پہ ڈالتے ہوئے باہر نکل آیا۔

"بیٹا ایسے کب تک چلے گا۔ کیوں خوامخواہ خود کو وسوسوں میں ڈال رکھا ہے۔" بی بی جان کی آواز آئی۔ مخاطب یقیناً "انا ہی تھیں جو خاموش رہیں۔ جبھی بی بی جان کی آواز دوبارہ آئی۔ "آج تم نے اس کی چھوٹی سی خوشی پوری نہیں کی۔ کل کو اس کی شادی کیسے کرو گی؟ اگر اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی اور ہمیں چھوڑ جائے تو پھر کیا کرو گی۔"

"نہیں، نہیں ایسے مت کہیں فرحان کو چھوڑنے کا اس سے دور جانے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ انا کی گھبرائی ہوئی بے ساختہ آواز آئی۔

"اس کو دیکھ کر تو میں جیتی ہوں۔"

"جب ہی تو کہہ رہی ہوں اندیشے مت پالو زمانہ گزر گیا، کون یاد رکھتا ہے۔ ہم اتنے اچھے علاقے میں رہتے ہیں۔ آخر اڑوس پڑوس کے لوگوں سے تو ملنا ہے نا۔ بھول جاؤ سب اور لوگوں میں اٹھا بیٹھا کرو۔ کل کو فرحان کے لیے بھی تو ہم نے لڑکیاں دیکھنی ہیں جب ہم لوگوں سے ملیں گے جبھی تو کہیں بات چلے گی نا۔" بی بی جان نے تفصیل سے سمجھایا۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں، مگر کیا کروں۔ مجھے عمر کے گھر والوں کا رویہ نہیں بھولتا، وہ ذلت اور بے عزتی مجھے آج بھی یاد ہے۔ کیسے انہوں نے کہا تھا۔ "ہم ایک طوائف کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"کوئی پہاڑ تھا جو مجھ پہ گرا تھا۔ طوائف اور وہ بھی انا۔" میں وہیں کھڑا رہ گیا میں گاڑی کی چابیاں بھول گیا تھا۔ وہ لینے آیا تھا۔ دروازہ کھولنے کے لیے جیسے ہاتھ بڑھایا اندر سے اپنا نام سن کر رک گیا۔ پھر تو جیسے میرے بدن میں جان ہی نہیں رہی۔

تمہیں اتنی پاکیزہ اور صاف ستھری رہنے والی "انا طوائف" مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ مگر ابھی شاید میرا اور امتحان باقی تھا۔ اندر سے انا کی آواز ابھری۔

"اسی لفظ سے بچنے کے لیے میں نے اپنی ممتا کی قربانی دی۔ تاکہ اگر کبھی فرحان کو پتا لگے تو وہ زیادہ دکھی نہ ہو۔ کہ میں اس کی آیا ہی ہوں۔ ماں کے بارے میں ایسا لفظ اولاد برداشت نہیں کرتی۔" انا کے الفاظ تھے کہ ہتھوڑا جو میرے سر پہ کسی نے دے مارا۔ میں ایک دم لڑکھڑا گیا اور واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں رکا نہیں اور تیز تیز قدموں سے باہر نکلتا چلا گیا۔

دن بھر بے مقصد سڑکیں ناپ کر جب میں تھک ہار کر گھر لوٹا تو ایک نیا صدمہ میرا منتظر تھا۔ انا اس دنیا سے جا چکی تھیں۔ ان کو پتا چل گیا تھا کہ میں نے ان کی باتیں سن لی ہیں۔ جس راز کو وہ پچھلے بائیس سالوں سے چھپا رہی تھیں اس کے کھل جانے کا صدمہ وہ برداشت نہ کر سکیں اور نہ ہی میرا سامنا کرنے کی ان میں ہمت تھی۔ ایک عورت، جو شاید اپنے لیے کسی کی بھی آنکھوں میں تحقیر برداشت کر سکتی ہے۔ مگر ایک ماں اپنی کوکھ جنی اولاد کی آنکھوں میں اپنے لیے تمسخر برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر۔ یہ ان کا خیال تھا۔ میں دن بھر جو پھرتا رہا۔ یہی سوچ ذہن میں رہی کہ انا کہاں قصوروار ہیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا احاطہ کر لیا۔ مجھے انا ہر جگہ بے قصور نظر آئیں۔ زمانے کے خوف نے ان کو اپنی ہی ممتا کا گلا گھونٹنے پہ مجبور کیے رکھا۔ وہ اچھی بیوی بھی تھیں جو شوہر کے صرف سال بھر کے ساتھ کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنا بیٹھیں اور اچھی ماں بھی۔"

"کاش انا آپ نے مجھ پہ بھروسا کیا ہوتا۔ میں آپ کی خاطر دنیا سے لڑ سکتا تھا۔" میں ان کی قبر سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"ماں تو ماں ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی جگہ سے ہو میرے لیے بھی وہ صرف میری ماں تھیں۔ میں نے اپنے کندھے پہ کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ وہ بی بی جان تھیں۔ میں نے اپنے آنسو خشک کیے اور بی بی جان کو سہارا دیتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

انا کو قسمت کی ستم ظریفی نے شاید اس بدنصیب جگہ پہ پہنچا دیا تھا جہاں سے واپسی معاشرے میں ناممکن سمجھی جاتی ہے۔ پھر میرے والد ان کی زندگی میں آئے جنہوں نے انا کو اس جگہ سے نکال کے ان سے شادی کی مگر شاید یہ باعزت زندگی میری انا کے نصیب میں نہ تھی۔ میرے والد کا انتقال میری پیدائش سے چند ہفتے پہلے ہو گیا۔ میری ماں کے لیے یہ صدمہ بہت جان لیوا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مجھے لے کر دوسرے شہر آگئیں اور یہاں آکر انہوں نے اپنی ملازمہ کو میری نانی اور خود کو میری انا بنا دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ معاشرہ نہ طوائف کو قبول کرتا ہے اور نہ طوائف کی اولاد کو اور شاید انہیں مجھ سے بھی خوف تھا کہ بڑا ہونے پہ میں ان سے سوال جواب کروں گا۔ اس لیے مجھ سے بھی اپنی شناخت چھپائے رکھی۔ مگر وہ بھول گئی تھیں کہ ان کی اتنی اچھی تربیت کیسے مجھے ان سے بدظن کر سکتی تھی بھلا۔

میں آج بھی اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ ان کی حقیقت جاننے کے باوجود۔ وہ صرف میری ماں تھیں اور کچھ نہیں۔ میں نے لندن میں ایڈمیشن کرا لیا اور نانی جان کو لے کر لندن آگیا ہمیشہ کے لیے۔

☼ ☼

بُشریٰ سیال

ناولٹ
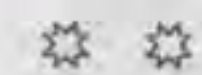
"صبا، بیٹی! بارش شروع ہونے والی ہے۔ ذرا میرے ساتھ مل کر چیزیں سمیٹو صحن میں سے۔" وہ جو نہایت انہماک سے ناول پڑھ رہی تھی۔ اماں کی آواز سن کر برا سا منہ بناتے ہوئے ناول رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بادل ناخواستہ چلتی ہوئی باہر آگئی۔

"کون سے خزانے ہیں اس محل میں جنہیں آپ محفوظ مقام پر رکھنا چاہتی ہیں۔" ہمیشہ کی طرح طنز کے تیر چھوڑتے ہوئے اس نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی تھی۔ بھادوں کی مدھ ماتی شام آنگن میں اتر آئی تھی۔ شیشم کے پتے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ بادلوں کے گھرے ٹکڑے عودو عنبر کی سرمئی مرغولوں کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔

"تم الگنی سے کپڑے اتار لو اور اندر لے جاؤ، باقی چیزیں میں خود سمیٹ لوں گی۔" اس کی بات کو قصداً نظر انداز کرتے ہوئے وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔ وہ بھی مزید بحث کا ارادہ ترک کر کے تیزی سے آگے بڑھی اور کپڑے سمیٹنے لگی۔ پانی کے چند موٹے قطرے زمین پر گرے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ ناول پڑھ رہی تھی۔ مگر نا چاہتے ہوئے بھی دھیان باہر تیز ہوتی بارش میں لگا ہوا تھا۔

"آج تو لگتا ہے کہ یہ بارش پچھلے سالوں کا ریکارڈ توڑے گی۔" اماں خود کلامی سے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی گیلی چادر اتار کر کرسی پر پھیلا دی اور دوسری چادر اوڑھ لی۔

"پکوڑے بناؤں تمہارے لیے؟" وہ اس کے پاس بیٹھیں اور محبت سے چور لہجے میں بولیں۔

"مجھے نہیں کھانا کچھ بھی، اس برستی بارش میں، ان سیلن زدہ بدبودار ٹپکتی چھتوں والے کمروں میں بیٹھ کر کچھ کھایا جا سکتا ہے؟" ایک ناراض نظر ان پر ڈال کر غصے سے کاٹ دار لہجے میں بولی تو پل بھر کو اماں خاموش ہو کر رہ گئیں۔ مگر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال کر بشاشت سے گویا ہوئیں۔

"اس دفعہ کمیٹی نکلتی ہے تو چھتیں ٹھیک کروالیں گے۔ چلو اب اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ میں پکوڑے بنا کر لاتی ہوں تمہارے لیے۔" وہ اٹھ کر باہر کی جانب بڑھیں۔

"ہاں چھتیں ٹھیک کروانے سے تو یہ بنگلہ بن جائے گا نا۔ رہنا تو اس نے پھر بھی غریب کی کٹیا ہے۔ جس سے مجھے شدید نفرت ہے۔" ——— بے زار لہجے میں بولتی وہ قسمت سے سخت شاکی نظر آ رہی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے اماں نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی مگر جانتی تھیں اس وقت اسے چھیڑنا بے کار ہو گا اس لیے ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

"ساری زندگی گزر گئی، مگر ایک ڈھنگ کا گھر نہ بن سکا ہم سے، جانے کب اس جھونپڑی سے جان چھوٹے گی۔" خیالوں میں گم وہ خود سے ہم کلام تھی۔ جب فون کی بیل نے اسے متوجہ کیا۔

"ہیلو۔" صبا بے زار لہجے میں بولی۔

"السلام علیکم!" دوسری طرف سے سلام کیا گیا۔ "کیسی ہو باد صبا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہی ہوں۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"ارے۔۔۔ بس ٹھیک کیوں؟ خیریت ہے نا؟" وہ استفسار کرنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں حمزہ، بس میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں؟ تمہارے موڈ کو کیا ہوا۔۔۔ ادھر تو سنا ہے بارش ہو رہی ہے۔ یہ تو انجوائے کرنے والا موسم ہے یا موڈ آف کرنے والا۔" وہ کچھ کچھ اس کی کیفیت سمجھ گیا تھا۔

"اونہہ۔۔۔ انجوائے۔" اس نے طنز سے سر جھٹکا تھا۔

"انجوائے کرتے ہوں گے وہ لوگ جو گھروں میں رہتے ہوں گے۔ ہم جیسے جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے لیے یہ بارش عذاب بن کر آتی ہے۔" وہ سخت شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

"خدا کو مانو لڑکی۔۔۔ خدا کی رحمت کو عذاب مت کہو۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"او میرے خدا۔۔۔" اس کی پریشانی میں ڈوبی آواز ابھری۔

"کیا ہوا؟" وہ فوراً بولا۔
"حمزہ تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔"
"لیکن ہوا کیا؟ سنو تو۔۔۔" وہ اسے پکارتا رہا مگر وہ فون بند کرچکی تھی۔
"ماں!" غصے سے بھرپور اس کی جھنجلاہٹ بھری آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ گھبراہٹ کے عالم میں اندر کی جانب بڑھیں۔
"خیریت تو ہے نا بیٹا؟"
"خیریت کا ہماری زندگی سے کیا تعلق۔۔۔ وہ دیکھیں چھت ٹپک رہی ہے۔" انہوں نے دیکھا چھت واقعی ٹپک رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ باہر تھیں۔ واپسی پر ان کے ہاتھوں میں برتن تھے جنہیں وہ پانی ٹپکنے کی جگھوں کے نیچے رکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بیٹھی وہ انہیں دیکھتی رہی۔ آخرکار تنگ آکر لیٹ گئی اور چادر سر تک تان لی۔
"ساری زندگی یہی کام کرتی رہی ہیں۔ نا جانے تھک کیوں نہیں جاتیں اماں۔ کیوں یہ سب انہیں برا محسوس نہیں ہوتا۔" خود سے لڑتے، جنگ کرتے نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی تھی۔ اماں کے بنائے ہوئے پکوڑے ٹھنڈے ہوگئے تھے مگر انہوں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ جانتی تھیں کہ یہ موسم اسے ہمیشہ کتنا اداس کردیتا ہے۔ اس کی محرومیوں کا شدت سے احساس دلاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"یہ اکیلے اکیلے کس بات پر مسکرایا جارہا ہے؟" وہ سیل فون ہاتھ میں تھامے اکیلا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جب ماما وہاں آئیں، اسے ان کی آمد کا بالکل بھی علم نہ ہوسکا۔
"کچھ نہیں ماما، وہ بس ایک دوست کی بات یاد آگئی تھی۔ آپ کب آئیں؟" ان کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے نظریں چرا کر بولا۔
"میں اس وقت آئی جب تم بادِصبا کے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے۔" وہ شرارت آمیز سنجیدگی سے بولیں۔
"ماما۔۔۔!" اس نے دبا دبا احتجاج کیا۔ وہ ہنس دیں۔
"ماما کی جان، ماما آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں۔" وہ مزید گویا ہوئیں۔ اب کی بار وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ کپ لبوں سے لگالیا۔
"حمزہ ایک بات پوچھوں؟"
"جی۔۔۔ ضرور ماما۔" وہ پوری طرح متوجہ ہوا تھا۔
"بادِصبا تمہیں پسند تو ہے نا؟ میرا مطلب ہے جو میں نے اور صوفیہ نے سوچا ہے تم لوگوں کے لیے، تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ اسی کو دیکھ رہی تھیں۔
"مجھے آپ کی پسند پر پورا بھروسا ہے ماما۔" اس کے اس طرح کہنے سے ان کا مان بڑھ گیا تھا۔
"اچھا! تو بادِصبا صرف میری پسند ہے؟" وہ ایک بار پھر شرارت سے بولیں۔
"نہیں ماما وہ مجھے بھی پسند ہے۔ تھوڑی سی ضدی ہے مگر اچھی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔
"تمہاری جاب ہوجائے تو میں صوفیہ سے بات کروں شادی کے لیے۔"
"جاب پتا نہیں کب ملے مجھے، آپ ابھی بات کرلیں خالہ جان سے۔" وہ جھٹ سے بولا۔
"اچھا۔۔۔ تو اتنی جلدی ہے ہمارے بیٹے کو، ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔" انہوں نے محبت سے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا۔ جو نظریں جھکا کر بات کررہا تھا۔
"پتا ہی نہیں چلا حمزہ عثمان تم کب اتنے بڑے ہوگئے۔" وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھیں۔ انہوں نے اس کی نظر اتاری تھی۔ اپنا بیٹا انہیں بے حد عزیز تھا۔ ان کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھا وہ۔

☼ ☼ ☼

"حمزہ۔۔۔!" دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر اس پر پڑی تھی۔ خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی۔
"واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔۔۔ تم کب آئے؟ بتایا کیوں نہیں مجھے؟ رات تم مجھ سے فون پر بات کررہے تھے۔ تب تو نہیں بتایا کہ تم۔۔۔"
"ارے لڑکی۔۔۔ ذرا چھری تلے دم تو لو۔۔۔ آتے ہی شروع ہوگئیں۔۔۔ نہ سلام، نہ دعا۔" اماں کچن میں سے برآمد ہوئیں۔
"میں نے سوچا تمہیں سرپرائز دیا جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"تمہیں پتا ہے حمزہ مجھے تمہارا انتظار کرنا اچھا لگتا ہے۔ تم بتا کر آتے تو میں خوب صفائی کرتی۔ مزے دار کھانا بناتی اور آفس سے بھی چھٹی کرلیتی۔" اس کے سادگی سے کہنے پر حمزہ کو ڈھیروں طمانیت کا احساس ہوا تھا۔
"بتا کر آتا تو تمہارا یہ ایکسائیٹڈ انداز تو دیکھنے کو نہ ملتا نا۔"
"ویسے کب آئے ہو تم اور واپس کب جانا ہے؟" اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ اسے ہر بات کی جلدی ہوتی تھی۔
"میں دوپہر میں آیا ہوں۔ کل صبح نکلوں گا ادھر سے۔"
"کل صبح نہیں، تم پرسوں جاؤ گے۔ بس میں نے کہہ دیا۔" وہ حتمی انداز سے بولی۔
"میں ضرور رک جاتا لیکن کچھ ضروری کام ہے۔ اس لیے جلدی واپس جانا ہے۔"
"او کے! پھر کل شام میں چلے جانا، ٹھیک؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ جواب میں اسے بھی وعدہ کرتے ہی بنی تھی۔
"صائمہ خالہ کیسی ہیں؟" وہ اس کے پاس ہی صحن میں بیٹھ گئی تھی۔
"ماما بالکل ٹھیک ہیں۔ تمہیں اپنے گھر میں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔" وہ اب شرارت پر آمادہ ہوا تھا۔
"اماں کہتی ہیں جب تک تمہیں جاب نہیں مل جاتی۔ وہ ایسا کچھ نہیں سوچ سکتیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔
"ہوں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ "بادِصبا اگر مجھے جاب نہ ملی؟"
"تو کیا ہوا۔ تمہارے پاپا اتنا کماتے ہیں کہ تمہیں سپورٹ کرسکتے ہیں۔" وہ اسے تسلی دینے لگی۔
"میں اپنی بات نہیں کررہا۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اماں ان دونوں کے لیے چائے لے کر آگئی تھیں۔
"حمزہ اگلی دفعہ دو، تین دن کے لیے آنا۔ میری کمیٹی نکلنے والی ہے۔ چھتیں ٹھیک کروانے کا سوچ رہی ہوں۔" وہ ان کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔
"جی۔۔۔ ان شاءاللہ! میں پوری کوشش کروں گا۔ جلد ہی چکر لگاؤں گا۔" ان کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھام کر وہ چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگا تھا۔ بادِصبا چائے پی کر چینج کرنے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو دیکھا حمزہ لکڑی کی سیڑھی دیوار سے لگا کر کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھے گئی۔
"یہ کیا کررہے ہو حمزہ؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔
"چھتوں پر مٹی ڈالنے لگا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں ان کا ٹپکنا آپ کی نازک طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔" سفید شرٹ کے بازو کہنیوں تک فولڈ کیے ہوئے وہ بالکل تیار تھا۔
"حمزہ تمہارے کپڑے گندے ہوجائیں گے۔" وہ پریشان ہوگئی تھی۔ حمزہ کے ہاتھوں پر لگی مٹی اسے بہت بری لگ رہی تھی۔ اسے مٹی کا برتن اٹھا کر سیڑھی کی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ چپ نہ رہ سکی۔
"حمزہ تمہارے ہاتھ گندے ہورہے ہیں۔" اس کی قیمتی وائٹ شرٹ اور بلیک پینٹ پر کہیں کہیں مٹی کے نشان تھے۔
"سو واٹ؟ نو پرابلم۔۔۔ اس محبت میں فرہاد نے تو نہر کھود ڈالی تھی۔ ہم تو صرف چھت پر مٹی ڈال رہے ہیں۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہولے سے مٹی والا ہاتھ اس کے گال پر پھیر دیا تھا۔

"حمزہ کے بچے۔" وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ تب تک وہ اوپر چلا گیا تھا۔ اس نے نیچے سے سیڑھی ہٹا دی۔ حمزہ اوپر بیٹھا ہنس رہا تھا۔

"بہت ڈھیٹ ہو تم۔" اسے ہنستا دیکھ کر وہ چڑ گئی اور سیڑھی واپس رکھ دی۔

☼ ☼ ☼

گزشتہ کچھ دنوں سے کمپنی کے اونر شفیع صاحب کسی ضروری کام سے آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ آج کل کمپنی کا چارج ان کے ہینڈسم' ایجوکیٹڈ فارنر بھانجے نے سنبھال رکھا تھا۔ ابتدا میں تو وہ اس کے سامنے جانے سے جھجکتی رہی۔ بعدازاں یہ جھجک بھی دور ہو گئی تھی اور اس میں بھی زیادہ ہاتھ کاشف رضوی کا تھا۔ اس کی نیچر بہت سوفٹ اور فرینڈلی تھی۔ وہ تمام اسٹاف سے ایسے بی ہیو کرتا جیسے بہت سالوں سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہو۔ اپنی شوخ اور دوستانہ طبیعت کے باعث وہ چند دنوں میں ہی بادِ صبا کے بہت قریب ہو گیا تھا۔

بادِ صبا کو بھی وہ اچھا لگا تھا۔ پہلے وہ جو مجبوری کے باعث دفتر جاتی تھی۔ اب گھر واپس آتے ہی اگلے دن کی تیاری شروع کر دیتی تھی۔ گھر — گندا اور تنگ ہونے پر اس نے اماں سے بحث کرنا اور الجھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی اس کی اس کایا پلٹ پر حیران تھیں۔

پہلے جو ہر وقت غصے سے بڑبڑاتی رہتی تھی۔ آج کل انہی لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سا خمار اتر آیا تھا اور وہ لو دیتی محسوس ہوتی تھیں۔ کاشف رضوی کی توجہ نے اسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی تھی۔

آفس کے علاوہ دونوں بہت سا وقت ساتھ گزارتے' کبھی لنچ ساتھ ہو رہا ہے' کبھی وہ اسے میٹنگ میں ساتھ گھسیٹ لیتا۔ سائٹ کا وزٹ ہوتا تو اس کا ساتھ جانا ضروری ہوتا تھا۔ چند دنوں میں آفس کے ورکرز نے دبی دبی زبان میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں مگر اسے کسی کی باتوں کی پروا نہ تھی۔ اس روز وہ اپنی ہمسائی اور کولیگ زویا کے ساتھ بس اسٹینڈ تک آئی تو زویا اس سے الجھ پڑی۔

"صبا جو کچھ تم آج کل کر رہی ہو یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم جانتی ہو تمہارے ابو کی وفات کے بعد تمہاری اماں نے کس مشکل سے تمہیں پالا پوسا' پڑھایا لکھایا اب اگر انہیں یہ سب پتا چلا تو وہ کتنا دکھی ہوں گی۔"

"میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جس سے اماں کو دکھ پہنچے؟" وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لینے لگی۔

"تمہارے اور کاشف رضوی کے درمیان کیا چل رہا ہے؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے ہمارے درمیان کیا چل رہا ہے؟" اس نے الٹا سوال داغ دیا۔

"وہ تم سے فلرٹ کر رہا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" زویا کی بات نے اسے تپا دیا تھا۔ "اور میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔"

"غلط... بالکل غلط' تم بھی محبت نہیں کرتیں اس سے۔ صرف اپنے روشن مستقبل کی خاطر اس کے آگے پیچھے پھر رہی ہو۔" اس کا جھوٹ زویا کو غصہ دلا گیا تھا زویا کا سچ سن کر وہ درشتی سے بولی۔

"ہاں' میں کر رہی ہوں کوشش روشن مستقبل کے لیے۔ کیونکہ اماں کی زندگی کو دیکھ کر میں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ اس دنیا میں خوشی اور عزت اسی عورت کو ملتی ہے' جس کے شوہر کے پاس ڈھیر سارا پیسہ ہو۔ زویا میں اماں کی طرح دو کمروں کی ٹپکتی چھتوں والی جھونپڑی میں نہیں کسی محل یا بنگلے میں زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"جہاں تک بات عزت کی ہے تو وہ اخلاق اور بلند کردار سے ملتی ہے۔ تمہیں تو آنٹی پر فخر کرنا چاہیے کہ سارا محلہ ان کی اتنی عزت کرتا ہے۔ ان کی بات کو اہمیت دیتا اور ان سے مشورے لیتا ہے۔ جہاں تک بات محبت کی ہے تو وہ نہ تم اس سے کرتی ہو نہ وہ تم سے کرتا ہے' جس رشتے کی بنیاد ہی لالچ اور دھوکے پر رکھی گئی ہے تم خود اس کے انجام کے بارے میں سوچ سکتی ہو۔"

"وہ واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے زویا۔" وہ یقین سے بولی۔

"کاشف رضوی جیسے مرد ہم جیسی مڈل کلاس لڑکیوں کو نوکرانی تو شاید رکھ لیں' مگر کبھی بیوی بنا کر پہلو میں نہیں بٹھاتے۔" زویا ایک حقیقت پسند اور سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ صبا کو بھٹکتے دیکھ کر خاموش نہ رہ سکی اور سمجھانے بیٹھ گئی' مگر دوسری طرف اس کی باتوں کا چنداں اثر نہ ہوا تھا۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتیں وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے ابھی تم کو یقین نہیں آئے گا' مگر جب میری اس سے شادی ہو جائے گی اپنی بات کو یاد کر کے تم خود ہی ہنسو گی۔" اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑا کر لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی تو زویا نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اپنی حیثیت سے اونچے خواب مت دیکھو' منہ کے بل گرو گی تب اٹھ کر سنبھلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔" اسے سمجھانے کے لیے آخری کوشش کی تھی۔

"تم مجھے ڈرانا چاہتی ہو؟" اس کا مذاق اڑا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں' میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتی ہوں۔ سمجھانا چاہتی ہوں کہ یہ امیرزادے ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو کیڑے مکوڑے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ ہمارے گھروں میں بارات لے کر آنا تو دور کی بات یہ قدم دھرنا بھی پسند نہیں کرتے۔"

"یہ تمہارا کامپلیکس ہے۔" وہ ترشی سے بولی۔

"مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا صبا پھر تمہاری تو بچپن سے حمزہ سے بات طے ہے۔ وہ اتنا اچھا انسان ہے اس کو چھوڑنے کا تم نے سوچا بھی کیسے۔" وہ تاسف سے بولی۔

"اونہہ اچھا انسان..." وہ استہزائیہ انداز سے بولی۔ "وہ محبت بھری باتیں تو کر سکتا ہے مگر میری خواہش پوری کرنا اس کے اختیار میں نہیں' سو اس سے تو میں کبھی بھی شادی نہیں کرنے والی۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دے کر سامنے سے آتی بس میں سوار ہو گئی۔ زویا بھی سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج تم نے بہت دیر کر دی آنے میں' میں تو پریشان ہو گئی تھی۔" وہ گھر میں داخل ہوئی تو اماں کو بے چینی میں ادھر سے ادھر ٹہلتے پایا۔

"منہ ہاتھ دھو لو' میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں اور پھر تمہیں ایک خوش خبری بھی سناؤں گی۔" ان کے مسکراتے مگر قدرے پرتجسس لہجے نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"اونہہ! خوش خبری اور خوشیاں بانٹنے کے لیے دنیا میں اور لوگ کیا ختم ہو گئے ہیں کہ کاتبِ تقدیر کو ہماری یاد آ گئی۔" وہ تلخ ہوئی تھی۔

"بری بات ہے بیٹا رب کی ذات سے بلاوجہ کے گلے شکوے اچھے نہیں ہوتے بلکہ ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے اور ہم تو اس کی نعمتوں رحمتوں اور برکتوں کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتے۔" ان کی بات سن کر وہ خاموش رہی۔

"لو چائے۔" صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھو کر وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اماں باہر آئیں تو اسے سوچوں میں محو پایا۔ کپ اسے تھما کر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سامنے کی تو اس نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ کہاں سے آئی؟" پلیٹ میں رکھی مٹھائی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے استفسار کیا تو اماں مسکراتے ہوئے اس کے سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور پلیٹ دوبارہ اس کے آگے کی۔ اس نے چھوٹا سا پیس اٹھا لیا اور دانتوں سے کترنے لگی۔

"حمزہ کو نوکری مل گئی ہے۔" ان کے بتانے پر اس کا

دل عجیب انداز سے دھڑکا تھا، مگر وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال پائی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتی، مگر اس وقت ذہن الجھا ہوا تھا اور پھر اسے تو زندگی کا سفر کاشف رضوی کے ساتھ بتانا تھا۔ جو رستے اسے حمزہ کی طرف لے کر جاتے تھے وہ پلٹ کر انہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"ماشاء اللہ بہت اچھا بچہ ہے۔ تمہارے ابو کی وفات کے بعد جس طرح اس نے ہمارا خیال رکھا ہے۔ میں کہتی ہوں میرا اپنا بھی کوئی بیٹا ہوتا تو وہ بھی اتنا نہ کرتا۔ مہینے کے مہینے راشن ڈلوا دیتا ہے، سودا سلف لا دیتا ہے، دکانوں کا کرایہ لے دیتا ہے۔ ہر دکھ سکھ میں ساتھ رہتا ہے۔ اللہ اسے ہزاروں سکھ اور خوشیاں دے۔" سر جھکائے خاموش بیٹھی وہ ان کی باتوں سے ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اس کی غیر معمولی سنجیدگی کو انہوں نے خوشی میں محسوس نہ کیا، درحقیقت وہ حمزہ کی جاب سے بہت خوش تھیں۔

"السلام علیکم خالہ جان!" وہ سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھی جب اچانک آواز سن کر چونک اٹھی اور سرعت سے سر اوپر اٹھایا۔ سامنے حمزہ کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بہت سا سامان تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ فریش اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"وعلیکم السلام!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ "تم بیٹھو میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔"

"کیسے مزاج ہیں جناب کے؟" کرسی کھینچ کر اس کے عین سامنے رکھتے ہوئے ایک محتاط نظر کچن کی طرف ڈال کر آگے کو جھک کر شوخی سے بولا۔

"تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟" ٹھنڈی آہ بھر کر قدرے اداس لہجے میں کہا اور سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں تو وہ مسکرا اٹھا۔

"سچ پوچھو تو میرے والی بادِ صبا سے بہت مختلف دکھائی دے رہی ہو۔"

"میں اب تمہاری رہی بھی کہاں ہوں حمزہ۔" وہ دل میں خود سے مخاطب ہوئی۔

"یار! میں تو سوچ رہا تھا کہ تم میرے انتظار میں دروازے کے آگے چکر لگا رہی ہوگی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی مبارک باد دوگی، خوشی میں چیخوگی، مجھ سے ٹریٹ اور آئسکریم کا مطالبہ کروگی، مگر یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔" اس کے اس طرح کہنے پر اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔ اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال کر بشاشت سے گویا ہوئی۔

"حمزہ میں ابھی آفس سے آئی ہوں۔ دراصل مہینے کی آخری تاریخیں ہیں تو آفس میں ورک لوڈ بہت زیادہ ہے، میں تھک جاتی ہوں گھر آتے آتے۔" اسے فوری طور پر یہی بہانہ سوجھا تھا۔

"کیا واقعی یہی بات ہے؟" اسے تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"آف کورس حمزہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"بادِ صبا! ادھر میری طرف دیکھو۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"بس بہت ہو گیا بادِ صبا! تم چھوڑ دو یہ جاب۔ میں تمہیں اور خالہ جان کو اپنے ساتھ ہی کراچی لے جاؤں گا۔"

"مگر حمزہ میں یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ اس میں اماں رخصت ہو کر آئی تھیں۔ اس کی دیواروں میں ابو کی خوشبو بسی ہے، اس کے ہر کونے میں ان کی یادیں ہیں۔" اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی تیرنے لگی تھی جسے محسوس کر کے حمزہ بے چین ہو اٹھا۔ اس نے چائے کے برتن سمیٹے اور کچن کی راہ لی جبکہ وہ حیرت سے اس کی پشت کو گھور کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"خالہ جان! بادِ صبا کھانا نہیں کھائے گی کیا؟" دسترخوان پر انہیں اکیلا بیٹھا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"بیٹا وہ مرضی کی مالک ہے کہہ رہی تھی آفس میں کھانا کھا لیا تھا اب بھوک نہیں ہے خیر تم اس کی فکر چھوڑو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے شروع کرو۔" وہ پلیٹ میں اس کے لیے سالن نکالنے لگیں، جبکہ وہ صبا کے اس رویے پر حیرت کے ساتھ ساتھ الجھن کا بھی شکار تھا۔

"خالہ جان، بادِ صبا کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی پریشانی یا۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"نہیں نہیں بچے، پریشانی کیا ہوگی۔ وہی اس کی پرانی ضد کہ گھر بدل ڈالیں۔" ان کی بات پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ منہ کی طرف جاتا اس کا ہاتھ فضا میں ہی معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

"تم اس بات کو ذہن پر سوار کر کے خود کو ہلکان مت کرو۔۔۔ وہ تو ہے ہی نادان۔ تم دھیان سے کھانا کھاؤ اور پھر اس سے۔۔۔" وہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں وہ ان کی باتیں سن ہی کہاں رہا تھا۔ اس کا ذہن تو صبا کی کچھ دیر پہلے کی باتوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

"مگر حمزہ میں یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ اس میں اماں رخصت ہو کر آئی تھیں، اس کی دیواروں میں ابو کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔۔۔" اماں برتن سمیٹ رہی تھیں، وہ اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ بے چینی میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

"بادِ صبا تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔۔۔ مجھے تم نے کہا کہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتیں اور خالہ جان سے کہتی ہو کہ گھر بدل ڈالیں۔ تم نے یقیناً مجھ سے جھوٹ بولا ہے مگر کیوں؟ ایسا آج پہلی بار ہوا ہے کہ یہاں آ کر میں نے تمہارے بغیر کھانا کھایا ہے۔ آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" خود سے سوال کرتے کرتے وہ تھک گیا تھا، مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ مسلسل دروازے پر دستک دے رہا تھا، مگر جواب ندارد۔ اس ــــ عرصے میں اسے پہلی بار صبا پر غصہ آیا تھا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ یہیں سے پلٹ جائے، مگر وہ اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے مجبوراً کھڑا رہا اور آخر کار اسے بھی دروازہ کھولتے ہی بنی۔

"کیا بات ہے؟" اس کی نگاہوں کی سرد مہری، اجنبی لہجہ اور بدلا ہوا رویہ سب کچھ حمزہ کے لیے حیران کن تھا۔ مگر وہ مضبوط اعصاب کا مالک ایک سمجھدار انسان تھا۔ اسی لیے غصہ پیتے ہوئے جذبات پر قابو پا کر بظاہر نارمل لہجے میں اپنائیت سے بولا۔

"تیار ہو جاؤ، ہم آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" وہ ہنوز دروازے میں ایستادہ تھی اسے اندر آنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

"پہلی بات یہ کہ میرا آئس کریم کھانے کا موڈ نہیں ہے، دوسرا یہ کہ سر درد کر رہا ہے اور مجھے آفس بھی جانا ہے۔ اس لیے میں ریسٹ کرنا چاہتی ہوں۔" وہ روکھائی سے بولی۔

"اگر کوئی ناراضی ہے تو مجھے صفائی کا موقع دو اور اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرو۔ اتنی اجنبی کیوں لگ رہی ہو تم، اس طرح سے بی ہیو کیوں کر رہی ہو؟" وہ دو قدم آگے بڑھا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے، حمزہ، تم پلیز اس وقت مجھے ڈسٹرب مت کرو۔" اس نے دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ حمزہ حیران پریشان کھڑا چند ثانیے دروازے کو گھورتا رہا، پھر واپس کمرے میں آ گیا۔

"صبا نے بات نہیں کی تم سے؟" اماں وہاں آ گئیں اور صبا کی بابت دریافت کرنے لگیں۔

"میرا خیال ہے وہ سو گئی ہے، آفس سے جب آئی تھی تو کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔" وہ بات بنا گیا۔

"حیرت ہے مجھے اس لڑکی پر، تمہارے آنے کی خوشی میں تو آدھی رات تک جاگتی رہتی تھی، تمہارے کان کھاتی، آئس کریم کی فرمائش کرتی تھی۔ آج ایسی تھکاوٹ ہو گئی کہ بات کیے بنا ہی سو گئی۔ خیر تم فکر مت کرو اس کا موڈ تو پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا ہے۔ دیکھنا صبح اٹھ کر سب سے پہلے تم سے سوری کہے گی۔" تشویش کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں خود ہی اسے تسلی دینے لگیں۔

"جی میں جانتا ہوں خالہ جان۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ

سکا۔

"میں تمہارے لیے دودھ لاتی ہوں۔" انہوں نے دودھ کا گلاس لاکر اس کے سرہانے رکھ دیا تھا۔ "سونے سے پہلے پی لینا۔" اسے ہدایت کرتے ہوئے وہ باہر نکل گئیں۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا' اس نے ایک نظر پورے کمرے پر ڈالی تھی۔ یہ گھر' کمرہ' اماں کی محبت سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اگر کچھ مختلف تھا تو وہ تھا صبا کا رویہ۔ وہ جتنا اس کے متعلق سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ حمزہ کھڑکی میں جاکر کھڑا ہوگیا تھا اور چاند کو دیکھنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ ناشتا کیے بغیر مقررہ وقت سے پہلے ہی آفس کے لیے نکل گئی تھی۔ اماں اسے آوازیں دیتی رہیں' مگر وہ ان سنی کر گئی۔ بہت دنوں بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ آف موڈ کے ساتھ آفس آئی تھی۔ اس نے کاشف رضوی کے آفس کا ایک چکر بھی نہیں لگایا تھا۔ کہاں تو وہ بھاگ بھاگ کر اس کے آفس میں جاتی' باتوں کے بہانے ڈھونڈتی' آج خاموش سر جھکائے فائلوں میں گم تھی' مگر ذہن حمزہ میں اٹکا ہوا تھا۔

"ہیلو صبا... کدھر غائب ہو بھئی! آج تو ایک دفعہ بھی میرے روم میں نہیں آئیں۔" اپنے سامنے کاشف رضوی کو دیکھ کر وہ سٹپٹا گئی جبکہ وہ بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ دراصل میں... یہ اس فائل کو دیکھ رہی تھی۔" اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی فائل آگے کردی۔

"چھوڑو اس کو... باہر چلتے ہیں لنچ ساتھ کریں گے' پھر لانگ ڈرائیو اور آخر میں تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔" فائل اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر پھینکی اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر کی جانب بڑھا۔ ان دونوں کو اس طرح ساتھ جاتا دیکھ کر رابعہ نے ساتھ بیٹھی زویا کو ٹہوکا دیا' مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہی تھی۔

فائیو اسٹار ہوٹل کے قدرے الگ تھلگ کونے میں بیٹھا وہ محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صبا کے انداز میں آج غیر معمولی سنجیدگی تھی' جسے وہ آفس میں ہی نوٹ کرچکا تھا۔

"ہے!!!" اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر وہ اسے مخاطب کر رہا تھا۔ "ہم یہاں خاموش ہو کر بیٹھنے نہیں آئے۔ کچھ بات کرو' ہنسو بولو۔" وہ ذرا سا آگے کو جھک کر بولا۔

"کاشف میں بہت پریشان ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"وائے؟ اینی تھنگ از او کے؟" وہ بے چین ہوا تھا۔ صبا کو محسوس ہوا کہ اس کی اداسی اس سے برداشت نہیں ہو رہی۔

"میرا کزن کل کراچی سے آیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ کاشف رضوی نے ایک پرسکون لمبی سانس فضا کے سپرد کی۔

"تھینک گاڈ! تم نے تو مجھے پریشان ہی کردیا تھا۔ کیا تمہارا کزن بہت بدصورت ہے؟" اب وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"کاشف آئی ایم سیریس۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔ جواب میں وہ ہنس دیا۔

"او کے... او کے... جسٹ ریلیکس' اینڈ ٹیل می واٹ ہیپنڈ؟" وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"ایکچوئلی میرے کزن سے میری نسبت طے ہے۔ امی کو صرف اس کی جاب کا انتظار تھا اب وہ شادی پر زور دیں گی۔ میں ان سے کیا کہوں گی' اب جبکہ اسے جاب بھی مل گئی ہے میرے پاس کوئی بہانہ نہیں ہے۔" وہ حقیقتاً بہت پریشان تھی۔ اس نے آرڈر نوٹ کروایا۔

"ڈونٹ وری یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور میرے پاس تمہارے لیے ایک زبردست نیوز ہے۔" اس کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"کیسی نیوز؟" وہ چونک اٹھی تھی۔

"ممی پاکستان آرہی ہیں۔ امپورٹنٹ بات یہ ہے کہ

وہ یہاں میرے لیے لڑکی تلاش کرنے آرہی ہیں۔" شوخ لہجے میں کہتے ہوئے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اسی وقت آرڈر سرو کیا جانے لگا۔

"اچھا تو جس لڑکی کو آپ کی ممی آپ کے لیے پسند کریں گی آپ اس سے شادی کرلیں گے؟" محتاط نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ بظاہر سرسری انداز میں استفسار کرنے لگی۔ ویٹر کے جاتے ہی وہ بولی تھی۔

"نہیں!" اب وہ کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بھی شروع کرنے کو کہا تھا۔ مگر وہ ابھی بھی اس کو دیکھ رہی تھی۔ کاشف رضوی کی نظر اس پر پڑی تھی' جس کا چہرہ اندرونی کشمکش کا غماز تھا۔

"میں اپنی پسند کو ہی ممی کی پسند بنادوں گا۔" وہ دھیمے لہجے سے بولا۔

"اور آپ کی پسند کون ہے؟" وہ بے صبری سے بولی تھی۔

"کیا یہ تمہیں بتانے کی ضرورت ہے؟" وہ حیرانی سے بولا۔ جبکہ اس کی ابھی بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"اور اگر آپ کی ممی کو وہ لڑکی پسند نہ آئی؟" خدشات ابھی بھی اس کے لہجے سے عیاں تھے۔

"مجھے اپنی پسند اور ممی پر پورا اعتماد ہے۔" نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مخملیں کیس کو وہ پرتجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ جبکہ وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! جلدی سے کھانا دیں بہت بھوک لگی ہے۔" گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی چہکتی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو پل بھر کو وہ حیران رہ گئیں۔

"یہ لڑکی بھی پاگل ہے کل شام سے منہ پھلائے پھر رہی تھی آج آتے ہی شور ڈال دیا۔" وہ بڑبڑائیں۔

"مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟" وہ ان کے پاس کچن میں ہی آگئی تھی۔

"کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی تھانیداروں کی طرح اونچی اونچی آوازیں مت لگایا کرو' بلکہ سلام کیا کرو۔" ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور ہنڈیا سے ڈھکن اٹھایا۔

"او میرے خدا...." برا سامنہ بنا کر اس نے ڈھکن واپس رکھ دیا۔ "اماں... آلو کھا کھا کر ہم خود آلو جیسے ہوجائیں گے۔" وہ بدمزا ہوئی تھی۔

"فریج میں سے کباب نکال لو' فرائی کردوں۔ حمزہ کے جانے سے طبیعت اداس تھی۔ دل ہی نہیں چاہا کچھ پکانے کو۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔ وہ فریج میں سے کباب نکال لائی۔

"آپ نہیں کھائیں گی؟" انہوں نے کبابوں کی پلیٹ واپس اسے پکڑائی تو وہ پوچھنے لگی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھیں۔ اس نے بھی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور کباب واپس رکھ دیے۔

"حمزہ اس دفعہ یہاں سے جاتے ہوئے بہت اداس تھا۔" جس موضوع سے وہ بچنا چاہتی تھی اماں نے وہ چھیڑ ہی دیا تھا۔

"صبا تم جانتی ہو نا صائمہ آپا کا بیٹا مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔ صرف کہنے کی حد تک نہیں وہ واقعی مجھے تمہاری طرح عزیز ہے۔" وہ مزید بولیں۔

"اماں میرے سر میں درد تھا۔" وہ جان چھڑانے کو بولی۔

"سردرد کا یہ مطلب تھوڑی ہوتا ہے کہ مہمان کو نظر انداز کردیا جائے۔ تم جانتی ہو نا کہ تمہارے ابو کی وفات کے بعد صائمہ آپا اور حمزہ نے ہی ہمارا خیال رکھا ہے۔ اور تو کسی نے مڑ کر ہمیں پوچھا تک نہیں۔" وہ اسے اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہتی تھیں۔

"اماں میں بہت محبت کرتی ہوں صائمہ خالہ سے۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ میں یہ بات جانتی ہوں۔ حمزہ سے میں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی' میں بھی

انسان ہوں تھک جاتی ہوں آفس سے واپسی تک۔ رات میرے سر میں بہت شدید درد تھا۔ یہ بات آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ پھر حمزہ کوئی پہلی یا آخری مرتبہ یہاں نہیں آیا تھا۔ اگلی دفعہ آئے گا تو۔۔۔"

"ارے۔۔۔" اس کی بات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے وہ چونک کر اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگیں' ان کی نظروں کے تعاقب میں اس نے بھی اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جہاں تیسری انگلی میں خوب صورت رنگ جگمگا رہا تھا۔

"یہ اتنی خوب صورت انگوٹھی کہاں سے لی ہے؟" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور رنگ کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی مالیت کا اندازہ کرنے لگیں۔

"یہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اماں۔۔۔ دراصل آفس میں وہ رابعہ ہے نا۔۔۔ میری کولیگ۔۔۔ یہ اس کا ہے۔۔۔" اس نے تھوک نگلا' اماں ہنوز اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ اس کے بھائی نے اسے۔۔۔ گفٹ کیا تھا۔ مجھے اچھا لگا تو۔۔۔ رابعہ نے کہا دو' تین دن کے لیے تم پہن لو۔" اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"صبا ایسی تربیت تو نہیں کی تھی تمہاری میں نے کہ تم لوگوں سے زیورات مانگ کر پہنو۔ جس کی چیز ہے اسے دو دن بعد واپس تو کردینی ہے پھر اسے پہن کر تمہیں کون سی خوشی حاصل ہو رہی ہے؟" صبا کی حرکت نے انہیں دکھی کیا تھا۔

"اماں کیا ہوگیا۔۔۔ دو دن بعد واپس کردوں گی' آپ بھی نا بس۔۔۔"

"دو دن بعد نہیں تم اسے یہ کل ہی واپس کروگی۔" وہ قطعیت سے بولیں۔

"آپ ہر بات میں اپنی مرضی کرتی ہیں اماں۔ میری خوشی کی کوئی اہمیت نہیں ہے آپ کے نزدیک' کردوں گی واپس رنگ' بھول گئی تھی کہ میری اتنی اوقات کہاں کہ کوئی قیمتی چیز پہن سکوں۔" اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا' اپنا ہاتھ ان کی گرفت سے ایک جھٹکے سے آزاد کروا کر وہ اندر بھاگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے حمزہ جب سے اپنی خالہ کی طرف سے آئے ہو چپ اور اداس ہو۔ صبا سے لڑائی تو نہیں کر بیٹھے؟" آفس سے واپسی پر سیدھا وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔ صوفے پر بیٹھا شوز اتار رہا تھا جب ماما کی آواز سن کر اس کے چلتے ہاتھ پل بھر کو رکے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا اور شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وارڈروب سے اپنا سوٹ نکالنے لگا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ماما' بس آفس کی وجہ سے تھک جاتا ہوں۔" سوٹ نکال کر مڑا تو انہیں تفکر سے اپنی جانب بغور دیکھتا پا کر مجبوراً چہرے پر بشاشت طاری کرتے ہوئے چلتا ہوا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اپنے مضبوط ہاتھ ان کے شانوں کے گرد پھیلا کر انہیں بازوؤں کے حلقے میں لے کر چلتا ہوا بیڈ تک آیا' انہیں بٹھا کر خود بھی سامنے بیٹھ گیا۔

"مائی سویٹ ماما جانی کوئی لڑائی وڑائی نہیں ہوئی میری کسی سے اور نہ ہی اور کوئی پریشانی ہے۔ آپ فکر مت کریں۔" دھیمی مسکان چہرے پر سجائے انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا۔

"میں تو تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ آج میری صوفیہ سے بات ہوئی تھی۔ وہ صبا کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔ پھر میرا بھی خیال ہے کہ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آج تمہارے پاپا سے بات کروں گی۔ سوچا ایک دفعہ تم سے بھی مشورہ کرلوں۔"

"ماما آپ ابھی کچھ دن ٹھہر جائیں۔" دانستہ ان سے نظریں چراتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"دیکھا! میں نہ کہتی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ کل تک تو تم نے شادی کی جلدی مچائی ہوئی تھی' آج کہہ رہے ہو ابھی ٹھہر جائیں۔" اس کی بات سے انہیں اچنبھا ہوا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ماما میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ابھی میری جاب شروع ہوئی ہے۔ کیا ہم شادی کے اخراجات افورڈ کرلیں گے؟" صبا کی کہی باتوں اور رویے کی وہ کسی کو بھنک بھی نہ پڑنے دینا چاہتا تھا۔ اس لیے فوراً بات بدل کر بولا۔

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ میں اور تمہارے پاپا سب کچھ کرلیں گے۔" اس نے مزید بحث کا ارادہ ترک کردیا اور سوٹ اٹھا کر واش روم کی جانب بڑھا بہت دیر تک شاور لینے سے اس کے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ڈھیروں بوجھ دل پر لے کر وہ واپس گیا تھا۔ صبا کا رویہ اس کے لیے بالکل ناقابل فہم تھا۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ ابھی آفس میں آ کر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر فائل دھری تھی' اس کی نظریں تو فائل پر جمی تھیں' مگر سوچ کا رخ صبا کی طرف تھا۔

"باد صبا کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔" وہ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پیشانی مسل رہا تھا۔ شب بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ موبائل کی بیپ ہوئی تھی وہ سوچوں کی دنیا سے نکل کر واپس حال میں لوٹ آیا۔

یس کا بٹن پش کرتے ہوئے اس نے سیل فون کان سے لگایا اور چیئر کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"خالہ جان کیسی ہیں آپ' گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟" پہلی دفعہ انہوں نے پی سی او سے فون کیا تھا' سو اس کا پریشان ہونا فطری تھا۔

"سب ٹھیک ہے اللہ کا کرم ہے۔ تم سناؤ گھر میں خیریت ہے؟"

"الحمدللہ!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"حمزہ بیٹا میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں لیکن تم یہ صبا سے مت کہنا اور نہ ہی اس کا ذکر آپا سے کرنا۔"

"آپ بے فکر ہو کر بات کریں میں کسی سے نہیں کہوں گا۔" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"حمزہ پتا نہیں صبا کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ وہ ہر وقت الجھی الجھی رہتی ہے۔ کھانا پینا بھی بہت کم ہو گیا' بات چیت کرنا تو گویا بھول گئی ہے۔ اور اب تو۔۔۔"

"اب کیا۔۔۔ بولیں نا خالہ جان۔ اب کیا ہوا' بتائیں پلیز!" وہ بے چین ہوا تھا۔

"مجھ سے بدتمیزی بھی کرنے لگی ہے۔ اپنی کسی کولیگ سے اتنی قیمتی انگوٹھی مانگ کر لے آئی پہننے کے لیے' میں نے واپس کرنے کا بولا تو غصے میں آ کر پتا نہیں کیا کچھ کہتی گئی۔"

"آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے اس کی نیچر بالکل بچوں جیسی ہے۔ اس لیے انگوٹھی مانگ لی ہوگی۔ جہاں تک موڈ کی بات ہے تو وہ آج کل آفس ورک سے تھک جاتی ہے اس لیے کچھ چڑچڑی ہو گئی ہے۔" ان کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"وہ میری بیٹی ہے حمزہ' میں اس کے مزاج کے ہر موسم سے آشنا ہوں۔ وہ ایسی بالکل نہیں تھی۔ تم بات کرو اس سے' پوچھو کہ آخر مسئلہ کیا ہے اسے' مجھے بتائے تو سہی۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں' میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔ آپ کو شام میں فون کروں گا' جب وہ گھر آ جائے گی۔" انہیں تو تسلی دے دی تھی' مگر خود وہ اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو!" موبائل اسکرین پر "حمزہ کالنگ" دیکھ کر اس کا موڈ آف ہوا تھا۔ کئی بار کال ریجیکٹ کی تھی' مگر وہ جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ آخر کار اسے اٹینڈ کرنی پڑی۔

"السلام علیکم!" آواز کو حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے اس نے سلام میں پہل کی تھی۔

"جلدی کہو' کیا کہنا ہے۔ میں بہت مصروف ہوں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"جی ہاں! اس دنیا کا نظام آپ ہی کے کندھوں پر چل رہا ہے۔" مسکراتے ہوئے اس نے طنز کیا تھا۔

"پلیز بی سیریس حمزہ' میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں

ہوں۔ تمہیں جو کہنا ہے جلدی کہو۔" دانت پیس کر بولی۔

"ہاں دوسرے تو تمہارے حکم کے غلام ہیں۔ تم جیسے انہیں آرڈر کرو' وہ ویسے تم سے بات کریں۔ خود تمہیں حق حاصل ہے کہ جیسے مرضی کسی سے بات کرو۔ پھر کہتی ہو کوئی وجہ بھی نہ پوچھے۔"

"حمزہ میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔" وہ جان چھڑانے کو بولی۔

"ہاں' کیونکہ تمہارے پاس کہنے کو کچھ ہے بھی نہیں اور ویسے بھی تمہیں ضرورت نہیں۔"

"حمزہ میں بتا چکی ہوں کہ بزی ہوں۔ اگر کام کی بات ہے تو کرو۔ ورنہ۔۔۔" اس کی بات کاٹ کر سختی سے بولی تو چند ثانیے کے لیے وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔

"تم آفس سے ریزائن کر دو میں نیکسٹ ویک اینڈ پر تمہیں اور خالہ جان کو لینے آرہا ہوں۔"

"اس دھونس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" وہ طنز سے بھرپور لہجے میں بولی۔

"بادصبا! کیوں کر رہی ہو ایسا' آخر وجہ تو بتاؤ۔" وہ تھک کر بولا۔

"یہ میری زندگی ہے۔ اس کو اپنی مرضی سے گزارنے کا مجھے پورا پورا حق ہے۔ تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یقیناً" یہ تمہاری زندگی ہے۔ مگر اس پر تمہارے علاوہ ان لوگوں کا حق بھی ہے جو تم سے جڑے ہیں؛ محبت کرتے ہیں تم سے۔ جنہیں فکر ہے تمہاری۔" وہ رسانیت سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے کہا نا میرے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم اب بچی نہیں ہو۔ شاید بہت بڑی ہو گئی ہو۔ غلطی تو میری ہے جسے پتا ہی نہ چلا۔" اس کا جواب سنے بغیر اس نے کال کاٹ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

کافی دن گزر گئے۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ اس نے اماں سے جھگڑا کیا نہ ہی انہوں نے اسے چھیڑا' مگر ایک ان دیکھی دیوار دونوں کے بیچ حائل ہو چکی تھی۔

"زویا کی شادی طے ہو گئی ہے۔" رات کا کھانا کھانے کے لیے وہ دسترخوان پر آکر بیٹھی تو اماں نے اسے بتایا۔

"اچھا۔۔۔" اس نے مختصر جواب لاپروائی سے دیا۔

"تمہیں اگر کچھ شاپنگ کرنی ہے تو بتاؤ۔ میرے پاس کچھ پیسے پڑے ہیں۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ کسی کی شادی کے لیے شاپنگ کرنے کی۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"زویا دوست ہے تمہاری' کوئی غیر تھوڑی ہے۔" اماں کو اس کا انداز عجیب سا لگا تھا۔

"اماں وہ کبھی بھی میری دوست نہیں تھی۔۔۔ اونہہ۔ کامپلیکس کی ماری ہوئی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ اس کا موڈ بگڑتا دیکھ کر انہوں نے موضوع بدل ڈالا۔

"خیر۔۔۔ زویا بہت خوش ہے لڑکا سرکاری اسکول میں پڑھاتا ہے۔ اس کے سگے چچا کا بیٹا ہے۔" وہ مزید تفصیل بتانے لگیں۔

"اونہہ! اسکول ماسٹر" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولی۔ "زویا کی سوچ ہمیشہ سے ہی چھوٹی تھی۔ کم قیمت اور ناکارہ چیزیں اسے شروع سے پسند ہیں۔" اس نے تمسخر اڑایا۔

"بری بات ہے بیٹا ایسے نہیں کہتے۔ زویا اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ پھر لڑکا اس کے والدین کا دیکھا بھالا' پسند کیا ہوا ہے۔ والدین اولاد کا برا نہیں چاہتے وہ یہ بات بخوبی جانتی ہے۔"

"یہ بات آپ کسے سنا رہی ہیں۔" وہ ایک دم اکھڑ گئی تھی۔

"یہاں میرے اور تمہارے علاوہ کون ہے جسے کچھ سناؤں گی۔ حقیقت ہے بیٹا ہم جیسے گھروں میں لینڈ لارڈ تو آنے سے رہے رشتہ لے کر۔" نادانستگی میں انہوں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"آ بھی سکتے ہیں۔" وہ بولی تو اس کے لبوں کی مسکراہٹ کا ساتھ آنکھیں بھی دے رہی تھیں۔

"آ بھی جائیں تو قبول نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ رشتہ ہمیشہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں کرنا چاہیے۔ انسان بہت سی پریشانیوں اور مسائل سے بچ جاتا ہے۔"

"کیوں؟ یہ کس کتاب میں لکھا ہے؟" وہ بحث پر آمادہ تھی۔

"بچے ہر بات کتابوں میں نہیں لکھی ہوتی اتنی عمر گزرنے کے بعد تجربہ تو آ ہی جاتا ہے۔"

"کیا ہر بات عمر گزار کر ہی سمجھ میں آتی ہے۔" وہ الجھ گئی۔

"ہاں! اور کبھی کبھار وقت کے ہاتھوں ایسا سبق ملتا ہے کہ انسان عمر سے پہلے تجربہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے بہتر ہوتا ہے بڑوں کی بات مان لی جائے۔ انہیں غلط نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ ان کا تجربہ زیادہ ہوتا ہے۔"

"وقت ہر کسی کو دھوکا نہیں دیتا اماں' یہ میرا یقین ہے۔" وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اماں بھی خاموش ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"آج کیسے میری یاد آ گئی۔" بہت دنوں کے بعد اس نے خود سے حمزہ کو فون کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔

"مجھے بات کرنی ہے تم سے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"خیریت؟"

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اماں کو کیوں میرے خلاف ورغلا رہے ہو؟" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"یہ الزام ہے مجھ پر' میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ احتجاجاً بولا۔

"تو پھر وہ مجھے جاب چھوڑنے کا کیوں کہہ رہی ہیں۔ ایسا پہلے کبھی انہوں نے نہیں کہا تھا۔"

"کیونکہ۔ اب وہ تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

"حمزہ نہ تو مجھے جاب چھوڑنی ہے اور نہ ہی ابھی شادی کرنی ہے۔"

"بادصبا! اب میری نوکری بھی ہو گئی ہے۔ اب کیا مسئلہ ہے؟ اور پھر ماما بھی یہی چاہتی ہیں۔ اب مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"سوری حمزہ! مجھے تم سے شادی نہیں کرنی ہے۔" اس نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"واٹ؟" حمزہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سیل فون کان سے ہٹا کر دیکھا۔ اسے لگا وہ مذاق کر رہی ہے۔

"تم ہوش میں تو ہو بادصبا؟" وہ بے یقین تھا اب تک۔

"میں مکمل ہوش و حواس میں کہہ رہی ہوں حمزہ عثمان مجھے تم سے۔۔۔"

"بس' خاموش۔۔۔ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔" وہ درشتی سے بولا۔

"میں تمہیں' تمہاری اور اپنی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گا۔" وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔ صبا خاموش ہو گئی۔

"حمزہ!" وہ بولی تو آنسوؤں کا گولا اس کے گلے میں پھنس گیا۔

"مجھے یقین ہے تم مجھ سے محبت کرتے ہو' بہت چاہتے ہو مجھے۔ لیکن۔۔۔ حمزہ۔۔۔" اس کے منہ سے سسکی نکل گئی تھی۔ "تم۔۔۔ مجھے۔۔۔ وہ سب نہیں دے سکتے۔۔۔ جو۔۔۔ جو مجھے کاشف دے سکتا ہے۔ حمزہ! تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ اس محبت کی قسم جو تم مجھ سے کرتے ہو۔ پلیز میرا راستہ مت روکو' پلیز حمزہ۔" وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ حمزہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا۔ "میری منزل قریب ہے۔"

"بادصبا!" وہ ٹوٹے ہوئے بے یقین لہجے میں بولا تھا۔

"حمزہ میرے خوابوں کو تعبیر ملنے والی ہے۔ مجھے میری مراد پانے دو' تم مجھ سے دور چلے جاؤ۔۔۔ پلیز حمزہ۔" وہ شدت سے رو رہی تھی۔ اسے خود سے دور جانے کے لیے اپنی ہی محبت کے واسطے دے رہی

تھی۔ وہ دم سادھے بیٹھا اس کی آواز سن رہا تھا۔
"بادِ صبا!" اپنی ہی آواز اسے کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔
"حمزہ پلیز مجھ سے کچھ مت پوچھنا۔" وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔
"اوکے! آئی پرامس یو۔ میں تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔" اس کی آواز شدت ضبط سے بھاری ہو گئی تھی۔ فون بند ہو چکا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھا تھا۔
"حمزہ آیا تھا آج۔" وہ آفس سے آئی تو اماں کے بتانے پر چونک اٹھی۔
"اچھا۔" مختصر جواب دے کر وہ خاموش ہو گئی۔
"پوچھو گی نہیں کہ جلدی کیوں واپس چلا گیا؟" صبا کے رویے پر وہ حیران ہوئی تھیں۔
"کیوں گیا؟" اس نے بادل ناخواستہ پوچھا۔
"کہہ رہا تھا آفس میں بہت مصروف ہوتا ہے۔ زیادہ چھٹیاں نہیں ملتیں ـــ" ان کی بات سن کر اس کا دل عجیب طرح سے اداس ہوا تھا۔
"اماں میں کھانا کھا کر آئی ہوں۔ اب سونے لگی ہوں۔ مجھے جگانا مت۔" وہ اندر کی طرف چل پڑی۔
"اتنی جلدی سونے لگی ہو؟"
"اماں آج بہت تھک گئی ہوں۔" وہ کمرے میں آ گئی۔ اماں باہر نماز پڑھ رہی تھیں۔ اس نے بیگ میں سے سیل فون نکال کر نمبر ملایا۔ مگر دوسری بیل جانے پر کال کاٹ دی۔ فوراً" اسے کال بیک آ گئی۔
"بادِ صبا!" وہ شدت سے پکار رہا تھا۔
"حمزہ!" وہ بھی جواب میں اسے پکار کر خاموش ہو گئی۔
"خیریت! مجھے ہی فون کر رہی تھیں؟" وہ بے یقینی سے دریافت کر رہا تھا۔ اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔
"حمزہ تم آج یہاں آئے تھے؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
"ہاں ـــ آیا تو تھا۔ کیوں اب گھر آنے پر بھی پابندی لگاؤ گی؟" اس کی بات پر چند ثانیے کو وہ چپ رہ گئی۔
"تم مجھ سے ملے بغیر کیوں چلے گئے؟" اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ شکوہ کر بیٹھی۔ دوسری طرف وہ دھیمے پن سے ہنس دیا۔
"تم سے مل کر مجھے وہ پرانی بادِ صبا یاد آ جاتی، جو میری آمد پر خوشی سے پاگل ہوتی تھی۔ میرے آگے پیچھے پھرتی تھی، مجھے تنگ کرنے پر خالہ جان سے ڈانٹ کھاتی اور جب میں اسے منانے لگتا تو فوراً" آئس کریم کی فرمائش کر دیتی۔ اگر اسی بادِ صبا سے ملاقات ہو سکتی ہے تو بتاؤ میں ابھی آ جاتا ہوں۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔
"ایسی باتیں مت کرو حمزہ۔" وہ اسے ٹوک گئی۔
"بس اسی لیے تم سے ملے بغیر واپس لوٹ آیا۔ میں نہیں چاہتا میری کسی بات یا عمل سے تمہیں تکلیف ہو۔"
"حمزہ تم میرے کزن ہو، اور ـــ"
"اور؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اور کچھ بھی نہیں۔" اس نے اس کی بات خود ہی مکمل کر دی تھی۔ وہ لب کاٹنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اس نے کاشف رضوی سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر وہ اسے موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ صبا کافی پریشان تھی۔
"مجھے خود ہی کاشف سے بات کر لینی چاہیے۔ کب سے کہہ رہا ہے تمہیں ممی سے ملوانا ہے مگر ملوا نہیں رہا ہے۔"
"السلام علیکم اماں!" بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی وہ ان کے قریب ہی تخت پر ٹک گئی تھی۔
"وعلیکم السلام! جیتی رہو کھانا لاؤں تمہارے لیے؟" انہوں نے پیار بھری نظر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر ڈالی۔
"بھوک نہیں ہے اماں۔ مجھے بس ایک کپ چائے بنا دیں۔" وہ وہیں تخت پر لیٹ گئی تھی۔
"خالی پیٹ چائے نہیں پیتے، پہلے کھانا کھا لو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔
"کھانا کھا کر آئی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔ اماں کچن میں چلی گئی تھیں۔ اس نے سر کے نیچے تکیہ درست کیا تو ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے نکال کر سامنے کیا تو وہ کسی کی شادی کا کارڈ تھا۔ اس نے بے دلی سے کھولا۔
"ہمارے پیارے بیٹے حمزہ عثمان کی شادی مورخہ 11 اپریل کو ہونا قرار پائی ہے۔ جس میں آپ کی شرکت ـــ" اس سے آگے اس سے پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے عبارت کو گھور رہی تھی۔
"حمزہ!" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔
"تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ پھر کسی اور سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟" وہ کارڈ واپس رکھ کر اندر چلی گئی تھی۔ اماں چائے لے کر آئیں۔ تو وہ سوتی بن گئی۔ وہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ اسے حمزہ کی بے وفائی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ بادل ایک بار زور سے گرجے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش کا پانی چھت پر شور مچا رہا تھا۔ ساری رات وہ اور آسمان مل کر روئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"صبا آج آفس نہیں جانا۔" وہ بہت دیر تک سوتی رہی تھی۔ اماں کو اسے جگانا پڑا۔ وہ کسلمندی سے پڑی رہی۔
"اماں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں آج نہیں جا رہی آفس۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"تمہاری آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی ہیں۔" رات بھر رونے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پپوٹے سوج گئے تھے۔
"میں تو چاہتی ہوں تم آفس چھوڑ دو، بس بہت کر لی تم نے نوکری۔" وہ ممتا کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ کہے بنا نہ رہ سکیں۔ حالانکہ جانتی تھیں وہ اس بات پر خفا ہو گی۔
"ناشتا بناؤں تمہارے لیے؟" اس کی غیر معمولی سنجیدگی کو خرابی طبع پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے کوئی سوال، جواب نہیں کیے تھے۔
"اماں صرف چائے دے دیں اور کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" اس کا دل بھر آنے لگا تھا۔ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔
"رات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا، پیا۔ اب میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو بناتی ہوں۔ اس کے بعد دوا کھا لینا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔
اماں کے باہر نکلنے کے بعد اس نے تکیے کے نیچے سے سیل فون نکالا تھا۔ حمزہ کا ایس ایم ایس تھا۔ وہ جلدی سے پڑھنے لگی۔

بارشوں کے موسم میں
تم کو یاد کرنے کی
عادتیں پرانی ہیں
اب کی بار سوچا ہے
عادتیں بدل ڈالیں
پھر خیال آیا کہ
عادتیں بدلنے سے
بارشیں نہیں رکتیں

"اونہہ! دھوکے باز، جھوٹا، فریبی ـــ محبت کے بلند و بانگ دعوے کرنے والا۔ مجھ سے انکار کی وجہ بھی نہیں پوچھی اور جھٹ سے شادی کرنے بیٹھ گیا۔ جیسے یہ تو تھا ہی اسی انتظار میں۔" وہ سخت قنوطی ہو رہی تھی۔ آنکھیں ایک بار پھر نمکین پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔
وہ حمزہ کی بے وفائی پر آنسو بہا رہی تھی۔ جب کاشف رضوی کی کال نے اسے متوجہ کیا تھا۔ وہ تو اسے مکمل بھول بیٹھی تھی۔
"ہیلو ڈیئر! کدھر غائب ہو بھئی؟ آج آفس نہیں آنا؟" وہ فریش موڈ میں بول رہا تھا۔
"میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں آج آفس نہیں آ سکتی۔" وہ بھیگے لہجے میں بولی۔

"اوہ! Sad ۔ کیا ہوا طبیعت کو؟"

"ٹمپریچر ہو گیا ہے۔ سر میں شدید درد ہے۔"

"میڈیسن لی؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دے دیا۔

"دیٹس ناٹ فیئر صبا۔ تم اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتیں۔ میں تمہاری طرف آرہا ہوں۔ تمہیں ساتھ لے کر میڈیسن لینے چلتے ہیں۔" وہ پروگرام ترتیب دیتے ہوئے بولا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ اتنی بھی بیمار نہیں ہوں۔ امی نے میڈیسن دی ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔" وہ جھٹ سے بولی۔ مبادا وہ گھر پہنچ نہ جائے۔

"شیور؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جی!"

"گڈ! اوکے تم ریسٹ کرو۔ آفس ورک کی ٹینشن نہیں لینی۔ یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب مکمل ٹھیک ہو جاؤ، تب آفس آنا۔" اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"تھینک یو کاشف۔" وہ ممنون تھی۔

"نو نیڈ آف تھینکس ڈارلنگ۔۔۔ جسٹ ٹیک کیئر آف یور سیلف۔" وہ فون بند کر رہی تھی۔ جب اماں اندر داخل ہوئیں۔

"کس کا فون تھا؟"

"آفس سے فون تھا اماں امپورٹنٹ میٹنگ ہے مجھے جانا ہو گا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں حیرت سے لب نیم وا کیے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ تیار ہو کر بغیر کچھ کھائے پیے نکل کھڑی ہوئی۔

"صبا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مت جاؤ آفس۔" انہوں نے روکنے کی کوشش کی۔

"اماں میرے باس کی کال تھی۔ میٹنگ میں شرکت لازمی ہے۔" وہ ان کا جواب سنے بغیر باہر نکل گئی۔ وہ کاشف سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

اسے حمزہ کے رویے نے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ بے حد اداس اور دکھی تھی۔ ایسے میں کاشف رضوی کی کال نے اس پر سوچ کے نئے در وا کیے تھے۔

"حمزہ۔۔۔ میں تمہیں بتا دوں گی کہ کوئی ہے، جو مجھے تم سے بھی بڑھ کر چاہتا ہے۔" ایک عزم کے ساتھ وہ دوپہر کے وقت آفس کے لیے نکلی تھی۔ اسے اس وقت آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر بہت سے ورکرز حیران ضرور ہوئے تھے۔ مگر پوچھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

وہ اپنی سیٹ پر آئی تھی۔ ایک فائل سامنے رکھے ہوئے وہ باتوں کو ترتیب دے رہی تھی جو اسے کاشف رضوی سے کرنی تھیں۔ ہاتھ میں فائل پکڑے اعتماد سے قدم اٹھاتی وہ اس کے آفس کی جانب بڑھی تھی۔ ہینڈل گھما کر وہ دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ اندر سے اپنا نام سن کر وہیں رک گئی۔

"نو وے یار! شادی اور وہ بھی اس دو ٹکے کی لڑکی باد صبا سے۔ نو۔۔۔ نیور۔۔۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا تھا۔ صبا کو محسوس ہوا چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔

"نہیں یار۔۔۔ تم غلط کہہ رہے ہو لڑکی تو اچھی ہے۔" ایک اجنبی آواز ابھری۔

"تم نہیں جانتے اس اچھی لڑکی کو۔" اس نے لفظ اچھی پر زور دیا تھا۔

"میری دولت کے لالچ میں اپنے بچپن کے منگیتر کو گڈ بائے کہہ دیا۔" وہ تمسخر اڑا رہا تھا۔

"اتنا پیسہ اور وقت میں نے کبھی کسی لڑکی پر برباد نہیں کیا۔ جتنا کہ اس محترمہ پر کیا ہے مگر اس کا لالچ ختم ہونے کو ہی نہیں آتا۔" اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کا دل رک رک کر چل رہا تھا۔

"مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہارے معاملے میں سیریس ہے۔ آئی مین محبت وغیرہ۔"

"محبت نہیں، ہاں شادی وہ مجھ سے کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے اتنی دولت تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی جتنی میرے پاس ہے۔"

"یار کاشف جب اسے علم ہو گا کہ تم نے اسے دھوکا دیا ہے تو سوچو اس کی کیا حالت ہو گی۔" وہ اسے

شاید اسے احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اگر میں نے دھوکا دیا ہے تو وہ کب فیئر تھی میرے ساتھ۔ اس نے تو اپنی ماں اور منگیتر کو بھی دھوکا دیا ہے۔" وہ سارا الزام اس پر ڈال رہا تھا۔

"کاشف وہ تمہاری ٹائپ کی لڑکی نہیں تھی۔ کیا ملا تمہیں اس سے فلرٹ کر کے؟" وہ لمبے لمبے اور اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ بخار کی حدت سے چہرہ سرخ تھا۔

"یار! اس فلرٹ میں مزا بہت آیا۔۔۔ یو نو۔۔۔ وہاں آسٹریلیا میں تو سب لڑکیاں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ ادھر پاکستانی لڑکی سے پہلی مرتبہ فلرٹ کیا۔ سچ میں مزا آیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ باد صبا کا جی چاہا۔ آفس کا دروازہ دھکیلے اور اندر داخل ہو جائے۔ اس گھٹیا شخص کو گریبان سے پکڑ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ مگر ایسا کرنے کی وہ ہمت خود میں نہیں پاتی تھی۔ وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

"یار۔۔۔ بہت غلط کیا ہے تم نے اس کے ساتھ۔ وہ ایک اچھی اور شریف لڑکی تھی۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ہاہاہا۔۔۔ شریف اور باد صبا۔" وہ طنز بھرے لہجے میں بولا۔

"لڑکوں سے افیئر چلانے والی لڑکیاں تمہاری ڈکشنری میں شریف ہوتی ہوں گی۔ میرے نزدیک وہ قابل نفرت ہیں۔ اس قابل بھی نہیں کہ انہیں نوکرانی بنایا جائے۔ تم شادی کی بات کر رہے ہو۔" وہ حقارت سے بولا تھا۔ اس سے زیادہ سننے کی اس میں سکت نہ تھی۔ بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی وہ اپنی سیٹ تک آئی تھی۔ اپنا پرس اور موبائل اٹھا کر وہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شام بکھرتی جا رہی تھی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ شہر کی دیواروں پر سائے لہرا رہے تھے۔ اردگرد سے بے نیاز وہ چل رہی تھی۔

"وہ تم سے فلرٹ کر رہا ہے۔" زویا کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ وہ بالکل اکیلی چل رہی تھی۔

"کاشف رضوی جیسے لڑکے ہم جیسی مڈل کلاس لڑکیوں کو نوکرانی تو شاید رکھ لیں۔ مگر کبھی بیوی بنا کر پہلو میں نہیں بٹھاتے۔" ایک اور آواز ابھری تھی۔

"حقیقت ہے بیٹا، ہم جیسے گھروں میں لینڈ لارڈ تو آنے سے رہے رشتہ لے کر۔" اماں کی آواز کی بازگشت سنائی دی تھی۔

"تم سے مل کر مجھے وہ پرانی والی باد صبا یاد آجاتی۔"

"حمزہ۔" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ "اوہ میرے خدایا! میں کیا کر بیٹھی۔ حمزہ کو بھی کھو دیا اور۔۔۔" آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"ہاہاہا۔۔۔ شریف اور باد صبا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ شریف اور باد صبا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔"

"بس۔۔۔" وہ زور سے چلائی۔ اردگرد آتے جاتے لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون اس کے قریب آئی تھیں۔

"خیریت ہے بیٹا؟" وہ اس سے دریافت کر رہی تھیں۔ وہ زارو قطار رونے لگی۔ اس خاتون نے اسے گاڑی میں بٹھایا۔ اس سے گھر کا ایڈریس پوچھا اور اسے گھر چھوڑ گئیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ شام گہری ہو گئی تھی، اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر کمرے میں گئی اور چارپائی پر گر کر رونے لگی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"حمزہ۔۔۔ تم؟" وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ دوڑ کر اس کے پاس گئی۔ اس کے شانے پر سر رکھے وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ صرف اس کا سر تھپتھپا رہا تھا۔

"حمزہ اس نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ اس نے کہا کہ میں لالچی ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ میں دھوکے باز لڑکی ہوں۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ وہ اسے لے کر باہر صحن میں آگیا تھا۔ "وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ میری ذات کی دھجیاں بکھیر رہا تھا اور میں۔۔۔ میں اسے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔" حمزہ کے شانے پر سر رکھے وہ مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آنسو حمزہ کی شرٹ کو بھگو رہے تھے۔ "وہ کہہ رہا تھا بادِ صبا شریف لڑکی نہیں ہے۔"

"بکواس کرتا ہے۔" اب حمزہ چپ نہ رہ سکا۔ "وہ خود دھوکے باز اور فلرٹ ہے۔ میں اس کی اوقات جانتا ہوں۔" اس کی بات پر بادِ صبا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ "تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"اس بات کو چھوڑو، بس بھول جاؤ کہ کبھی کاشف نامی کوئی شخص تمہاری زندگی میں آیا تھا۔ وہ تمہیں ڈیزرو نہیں کرتا تھا۔ جھوٹا، دھوکے باز۔"

"حمزہ میں آج بھی تم سے ہی محبت کرتی ہوں۔ میں تمہاری وہی بادِ صبا ہوں جو تمہارے آنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔ جو تمہاری دیوانی تھی۔ حمزہ میرا یقین کرو میں اس شخص کی صرف دولت سے متاثر تھی۔ مانتی ہوں دولت کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ لیکن حمزہ دل کی مسند پر آج بھی تم ہی براجمان ہو۔ میں جانتی ہوں اب ان باتوں کا کچھ فائدہ نہیں۔ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔" برستی آنکھوں کے ساتھ اس نے حمزہ کو دیکھا تھا۔ جو مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"اڑا لو۔۔۔ تم بھی میرا مذاق اڑا لو، سب قصور میرا اپنا ہے۔" وہ اس سے دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"بادِ صبا تم آؤ گی میری شادی پر؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"حمزہ۔" اس نے شکوہ کناں نظروں سے دیکھا تھا۔

"ظاہر ہے۔ اب تو تمہیں آنا پڑے گا۔ کیونکہ دلہن کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔"

"حمزہ اگر یہ مذاق ہے تو گھٹیا ہے۔" وہ ناراض ہوئی۔

"بادِ صبا تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی کروں گا۔" اس کی بات سن کر صبا پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا حمزہ کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ تمہارے بدلے ہوئے رویے پر میں بے حد پریشان تھا اور خالہ جان بھی افسردہ تھیں۔ ایسے میں تم نے راستے جدا کرنے کی بات کی تو مجھے لگا سب کچھ ختم ہو گیا۔ انہی دنوں ایک ہمدرد دوست نے مجھے بتایا کہ تم اپنے باس کے چنگل میں پھنس گئی ہو۔ وہ تم سے فلرٹ کر رہا ہے۔ دل تو چاہا کہ اس بے ضمیر شخص کو سبق سکھا دوں۔ مگر ایسے میں تم خفا ہوتیں کہ میں نے اسے تم سے دور کیا۔ اس لیے میں نے تمہیں وقت دیا۔ پھر پلان — کے مطابق میں نے اپنی شادی کا کارڈ تمہیں بھجوایا۔ جسے دیکھ کر تم دکھی ہوئیں اور وہ تمہیں اپنی توہین لگا۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے بعد تم کاشف سے شادی کی بات کرو گی اور وہ صاف مکر جائے گا۔ اس طرح اس کی اصلیت تم پر کھل جائے گی۔" وہ ایک ایک بات بتاتا چلا گیا۔

"حمزہ جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے چھوڑ دو، تم نے پھر بھی میرا پیچھا کیوں کیا؟" اس کی نظر میں حمزہ کا قد اور اونچا ہو گیا تھا۔

"کیونکہ میں جانتا تھا کہ جس طرح سے تم رو رو کر مجھ سے دور ہونے کی بات کر رہی ہیں تو یقیناً تم دلی طور پر ایسا نہیں چاہتیں۔ پھر مجھے ایک دوست نے بھی کاشف کی اصلیت بتا دی۔ بخدا اگر وہ تم سے مخلص ہوتا تو میں کبھی بھی درمیان میں نہ آتا۔"

"اور یہ دوست زویا ہے نا؟"

"ہاں! وہ اچھی اور مخلص لڑکی ہے۔ اسے تمہاری بہت فکر تھی۔"

"میں سدا کی بے وقوف۔۔۔ دوست دشمن کی پہچان نہ کر سکی۔ اس سے بھی اتنی بدتمیزی کی۔" وہ دوبارہ افسردہ ہونے لگی۔

"بے وقوف تو تم واقعی ہو۔ ویسے اتنا شان دار تم نے استقبال کیا ہے میرا۔ ایسا زبردست اظہار محبت۔۔۔ اگر مجھے پہلے پتا ہوتا تو بہت پہلے یہاں آگیا ہوتا۔" وہ شرارت سے گویا ہوا۔ مقصد اس کو ریلیکس کرنا تھا۔

"حمزہ۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"ہیں ڈارلنگ۔" وہ بخشنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"مار کھاؤ گے مجھ سے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کدھر جا رہی ہو۔ ابھی تو مجھے تم سے حکایت دل کہنی ہے، کچھ تم سے سننی ہے۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔

"حمزہ! اماں کدھر ہیں؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

"بہت جلدی خیال آگیا اماں کا۔۔۔ وہ ہمسایوں کے ہاں محفل میلاد میں گئی ہیں۔"

"اماں کو بھی بہت دکھ دیے ہیں میں نے۔ کیسے معاف کریں گی وہ مجھے۔" اس کے لہجے میں پچھتاوے بول رہے تھے۔

"ماں، بچوں سے کبھی خفا رہ ہی نہیں سکتی اور خالہ جان تو تمہیں بہت چاہتی ہیں۔ ہاں تمہارے بدلے ہوئے رویے پر وہ بھی پریشان تھیں۔" اس نے تسلی دی۔

"اماں جانتی تھیں کہ تمہاری شادی والا کارڈ جھوٹ موٹ کا ہے؟"

"ہاں۔۔۔" اس نے صبا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں موجود رنگ اتار کر پھینک دی اور جیب سے رنگ نکال کر اسے پہنانے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو حمزہ؟" اس نے ہاتھ واپس کھینچنا چاہا مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"منگنی کر رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مگر میں اماں کو کیا بتاؤں گی کہ کہاں سے آئی؟" وہ کنفیوژ ہوئی۔ رنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"کہہ دینا حمزہ نے دی ہے۔"

"مجھے شرم آتی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"ہاہاہا۔" حمزہ نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ "تو پھر کہہ دینا کولیگ سے لی ہے۔ اس کے بھائی نے گفٹ کیا تھا۔ مجھے اچھی لگی تو مانگ لی۔"

"حمزہ۔۔۔!" وہ اس پر جھپٹی وہ اٹھ کر بھاگا تھا۔ اسے چڑا کر ہنس رہا تھا۔

"جنگلی بلی، ناخن مار دیا ہے۔" وہ ہاتھ کی پشت سہلا رہا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں حمزہ۔" وہ اس کی نقل اتار کر بولا۔

"بادِ صبا ایک دفعہ پھر کہنا۔۔۔ پلیز!" وہ صاف مذاق اڑا رہا تھا۔

"یہ پکڑو اپنی رنگ۔۔۔ مجھے نہیں کرنی تم سے شادی۔ تم یوں ہی ساری زندگی میرا تمسخر اڑاؤ گے۔ ایک چھوٹی سی خواہش کیا پوری کی۔ سارے میں بات پھیلا دی اماں نے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"ہاہاہا۔ جو چیز دے دی، سو دے دی۔ واپس نہیں لوں گا۔ اور بادِ صبا خواہش کرنا غلط نہیں مگر اس کے حصول کے لیے غلط طریقے استعمال کرنا اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے رنگ پکڑ کر دوبارہ اس کے ہاتھ میں ڈال دیا۔

"پلیز بادِ صبا! مجھ سے شادی کر لو۔ بندہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم کو بہت خوش رکھے گا اور پھر اس کے گھر کی چھتیں بھی نہیں ٹپکتیں۔" سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے آخر میں شریر ہوا۔

"حمزہ کے بچے۔۔۔ اب نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔" وہ صحن میں پڑی جھاڑو اٹھا کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔ شیشم کے پتے آہستہ آہستہ تالیاں بجا کر انہیں ملن کی مبارک باد دے رہے تھے۔ ہوا میں آغاز بہار کے پھولوں کی مہک تھی۔ شام مسکرا رہی تھی اور یہی مسکراہٹ ان دونوں کے لبوں پر بھی رقصاں تھی۔ بادِ صبا کچن میں گئی تھی۔ چائے بنانے، حمزہ صحن میں مسرور سا بیٹھا اس کا منتظر تھا۔

☆ ☆

میمونہ صدف

چار بڑے کمروں پر مشتمل وہ شہر کا معروف پارلر تھا جہاں متمول گھرانوں کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی فیشل، مینی کیور، پیڈی کیور، ہلکنگ، تھریڈنگ، باڈی مساج، ہیئر کٹنگ اور میک اپ پر پانی کی طرح پیسہ بہاتی نظر آتی تھیں۔

پارلر کی اونر ایک غیر ملکی چینی نژاد تھی جس نے وہاں کا بیشتر عملہ بھی چینی نژاد ہی بھرتی کر رکھا تھا۔ چینی نقوش کی حامل شستہ اردو بولتی وہ تمام لڑکیاں پیشہ وارانہ انداز میں کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔

ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑی بے نیازی سے چیونگم چباتی، میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے اشمل نے سامنے کاؤنٹر پر نظر دوڑاتے ہوئے سامنے والے کمرے کی جانب دیکھا جس کے کھلے دروازے سے ہی دیوار گیر شیشے کے سامنے پارلر چیئر پر بیٹھی اس کی ماں فیشل کرواتی نظر آ رہی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ وہاں بیٹھی مختلف جرائد و رسائل کی ورق گردانی کرتے وقت گزار رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ یوں ماں کے ساتھ پارلر نہیں آئی تھی۔ یہ اس کا پہلا تجربہ تھا جو اسے بے حد کوفت میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔ مزید دس منٹ وہ اس طرح بیٹھی ورق گردانی کا شغل فرماتی رہی جب چینی نقوش کی حامل ایک لڑکی نے اسے مخاطب کر کے اسے اندر جانے کا کہا جہاں اب اس کی ماں بیٹھی ہیئر کٹنگ کروا رہی تھی۔ سست روی سے چلتی وہ ماں کے برابر کھڑی ہو گئی۔

"شی از مائی ڈاٹر۔ اس کی آئی بروز بنانی ہیں اور فیس ویکسنگ کر دیں۔" مسز خالد نے ذرا کی ذرا مڑ کر اشمل کی جانب دیکھتے ہوئے اس لڑکی کو ہدایات دیں۔ دیکھنے میں پاکستانی لگ رہی تھی۔ لڑکی نے الجھن سے دس بارہ سالہ اشمل کو دیکھا جو جینز اور لمبی سی شرٹ میں دوپٹے سے بے نیاز بڑی بے زار سی کھڑی تھی۔

"میڈم شی از ٹو ینگ۔ ابھی اس پر یہ سب ٹرائی کرنا قبل از وقت ہے۔" لڑکی نے بڑا ٹھہر ٹھہر کر فقرہ مکمل کیا تو مسز خالد کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

"میں نے آپ سے مشورہ نہیں مانگا۔ آپ چینہلا کو بلائیں۔" بڑی رکھائی سے جواب دیتے ہوئے انہوں نے اشمل کی جانب دیکھا جس نے مختصر دبا دبا سا احتجاج کیا۔

"بیٹا یو ول لک ویری پریٹی۔ سب بچیاں کرواتی ہیں نا۔"

"ماما آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ۔" وہ حد درجے اکتائی ہوئی تھی۔

"پاگل مت بنو۔" انہوں نے سختی سے اسے جھڑکا۔

"میڈم بچی ٹھیک کہہ رہی ہے۔" لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تو مسز خالد نے اسے گھورا۔

"کال چینہلا پلیز۔" ہنوز رکھائی سے کہتے انہوں نے رخ موڑ لیا تو وہ مزید کچھ بھی کہے بنا بوکھلائی سی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند ثانیے بعد چینی نقوش والی چھوٹے سے قد کی لڑکی اپنی مخصوص پیشہ وارانہ مسکراہٹ لیے موجود تھی۔

"چینہلا شی از مائی ڈاٹر آپ پلیز اس کی ہلکنگ اور فیس ویکسنگ کر دیں۔" انہیں ہمیشہ چینہلا ہی ڈیل کرتی آئی تھی، مگر آج شاید مصروفیت کچھ زیادہ ہونے کی بنا پر انہیں وہ نئی لڑکی مہیا کی گئی تھی جس کے کام سے وہ مطمئن نہ ہو سکیں اوپر سے اس کی مداخلت انہیں بری لگی تھی۔ چینہلا کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ اشمل کی جانب بڑھ کر ہیلو ہائے کرنے لگی۔

"ویل چینہلا ڈونٹ مائنڈ یہ جو نئی لڑکی آپ نے رکھی ہے شی از ویری ان پروفیشنل۔ آپ لوگ پاکستانی گرلز مت ہائر کیا کریں۔ آپ کے پارلر کی یہی بات تو اچھی ہے کہ آپ سب باہر سے سیکھی ہوئی ہیں۔" چینہلا جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے محض مسکرا کر رہ گئی۔

"اب دیکھیں نا یہ کیا طریقہ ہے بھلا کسٹمر کو ڈیل کرنے کا کہ آپ اسے کہیں یہ مت کروائیں۔ گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کیا کھائے گا؟ اگر یہی طریقہ رکھیں گے تو کسٹمر کیسے سیٹیسفائیڈ ہو گا؟ میری بیٹی ہے، میں جو مرضی کرواؤں۔" چینہلا کے چلتے ہاتھ لمحے بھر کو رک گئے اور اس نے اس لڑکی کی طرف سے معذرت کر کے پھر سے اپنے کام پر توجہ مرکوز کر دی۔ مسز خالد مطمئن سی ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

مسز خالد ایک این جی او کی سرگرم رکن تھیں اور ان کا بہت وسیع سوشل سرکل تھا جس میں وہ اس قدر مصروف ہو گئیں کہ انہیں گھر بار کی قطعاً پروا نہ رہی۔ یوں بھی گھر میں نوکروں کی فوج مہیا کر کے وہ اپنے تئیں اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو چکی تھیں۔ ان کے شوہر خالد بادامی ایک مشہور پرائیویٹ بینک میں اعلا عہدے کے افسر تھے۔ جو بینک کے بعد اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے ایک جم میں ایکسرسائز کے لیے جاتے تھے۔ گھر پہنچنے پر وہ اس قدر تھکان کا شکار ہوتے کہ دو گھڑی بچوں کے پاس بیٹھنے کا بھی وقت نہ ہوتا۔ دونوں میاں بیوی کے پاس گھر کے بجائے باہر کی سرگرمیوں کے لیے زیادہ وقت تھا کہ انہیں اپر کلاس میں اپنا ایک مقام بنانا تھا۔ اشمل، مشعل اور حذیفہ کو یوں بھی ان کی آیا نے پالا تھا جو ایک کل وقتی ملازمہ تھی۔ تینوں بچے ہی شہر کے ایک مہنگے اور اعلا درجے کے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ تینوں نا صرف بلا کے ذہین تھے بلکہ

حد درجے پر اعتماد بھی تھے۔ جس پر والدین کو فخر تھا۔ مگر ایک بات جو وہ دونوں بھول چکے تھے وہ یہ کہ معاشرے میں بجا طور پر بچوں کا پر اعتماد ہونا ضروری ہے' مگر ہر چیز اعتدال میں رہ کر ہی اچھی اور فائدہ مند لگتی ہے۔ حد سے زیادہ بڑھی خود اعتمادی کبھی کبھی بدتمیزی کی جانب بڑھنے لگتی ہے اور ایسا ہی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان تینوں بچوں کے ساتھ ہونے لگا تھا۔

اشمل سیونتھ اسٹینڈرڈ میں آگئی تھی۔ بچپن سے ہی حساس واقع ہونے کی وجہ سے ہوش سنبھالنے کے بعد سے وہ شدت سے والدین کی عدم توجہ کو محسوس کرتی تھی۔ شروع شروع میں اس احساس کو کھل کر لفظوں میں بیان کرنے پر اسے ماں باپ کی طرف سے

ٹھیک ٹھاک جھاڑ پڑی تھی۔ اسے "گستاخی" کا نام دیا گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے چور دروازے ڈھونڈ نکالے تھے۔ جن میں پہلا دروازہ اسے لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ کی صورت ملا تھا۔ اس کی انٹرنیٹ پر بہت سی ایسی سرگرمیاں تھیں جو اس عمر کی بچیوں بچوں کے لیے قطعاً "ممنوع" تھیں' مگر بچوں پر روک ٹوک رکھنے والا اور انہیں رہنمائی کرنے والا ہی جب گونگا اور اندھا ہو تو پھر چور دروازوں سے بڑھتے راستے تباہی کے گہرے گڑھے کی طرف ہی جاتے ہیں۔

اپنی تنہائی اور باتوں کو بانٹنے کے لیے اس نے فیس بک پر بہت سے نئے دوست بنا ڈالے جو اس کچی عمر کے ذہن کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھے۔ کوئی نظر رکھنے والا اور روک ٹوک کرنے والا تو تھا نہیں اور اسے خود بھی احساس نہ ہوا کہ جن دوستوں کو وہ بے حد مخلص گردان کر آگے بڑھ رہی ہے دراصل ایسا دلدل ہے جس میں دھنس کر وہ کبھی باہر نہ نکل پائے گی۔

☼ ☼ ☼

مس مریم نے حاضری لگانے کے بعد ساری کلاس پر نگاہ دوڑائی تو اشمل پر نظر پڑتے ہی ان کا ماتھا ٹھنکا۔ پہلے ہی اس کے بالوں میں لگی ایکسٹینشن پر وہ اسے

فائن چارج کر چکی تھیں اور اب وہ بھنویں بھی بنا کر آگئی تھی۔ سیشن کے آغاز پر بھولی سی اشمل چار ماہ بعد اس قسم کے فیشن اپنا کر اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی دکھ رہی تھی۔ کلاس کے دوران اشمل اپنے چہرے پر میڈم مریم کا ارتکاز محسوس کر کے شدید کوفت میں مبتلا ہو رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ میڈم اسے یوں کس بنا پر گھور رہی ہیں۔ اسے رہ رہ کر اپنی ماں پر بھی غصہ آرہا تھا۔ کلاس کے اختتام پر میڈم اسے اسٹاف روم میں آنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ وہ چاروناچار اسٹاف روم تک آئی تو میڈم مریم نے اسے باہر بینچ پر بٹھا کر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اشمل بیٹا وٹ از دس؟" وہ ان کا اشارہ بخوبی سمجھتی تھی لہٰذا خاموش رہی۔

"بیٹا ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں اس طرح بڑوں کے فیشن اپنانا آپ کو زیب نہیں دیتا بیٹا پہلے آپ تین جگہ سے کان چھدوا کر اتنے ٹاپس پہن آئیں پھر آپ نے بالوں میں سرخ ایکسٹینشن لگالی اور اب آپ یہ آئی بروز بنوا آئی ہیں بیٹا آپ کی کلاس میں کوئی بھی بچی اس طرح سے فیشن نہیں کرتی ایک حد تک تیار ہو کر آنا الگ بات ہے' مگر اس طرح بڑوں کے فیشن اتنی سی عمر میں اپنانا الگ بات۔ بیٹا ابھی آپ چھوٹی ہیں۔ اسٹوڈنٹ ہیں' ابھی آپ کو صرف پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے۔ اس قسم کے کاموں کے لیے پوری عمر پڑی ہے جب آپ ہماری عمر میں آجائیں گی تو جتنا مرضی فیشن کیجیے گا کوئی آپ کو نہیں روکے گا' مگر ابھی نہیں۔" بڑے پیارے' طریقے سے انہوں نے اسے سمجھایا۔

"میڈم میری ماما نے مجھے پارلر لے جا کر خود کروایا ہے۔ وہ کہتی ہیں بچیوں کو تیار رہنا چاہیے۔ اگر وہ خود یہ سب کرواتی ہیں تو آپ مجھے کیوں روک رہی ہیں آئی ایم سو کنفیوزڈ کہ آپ کچھ اور کہتی ہیں اور ماما کچھ اور میں کس کی بات مانوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو مس مریم کے پاس بولنے کو کچھ باقی ہی نہ رہا۔

گھر پہنچ کر بھی اس کا موڈ سخت خراب رہا تھا۔ کبھی اسے ماں پر غصہ آتا کہ وہ کیوں اسے یوں سجا سنوار کر اسکول بھجوا دیتی ہیں اور کبھی ٹیچر پر کہ اگر اس کے والدین کو کوئی مسئلہ نہیں تو انہیں کیا مسئلہ ہے۔

رات میں مسز خالد گھر آئیں تو وہ ان پر چیخنا چلانا شروع ہو گئی۔

"کیا ضرورت تھی جب میں نے آپ کو روکا بھی تھا تو! پہلے بھی مجھے کتنی بار فائن ہو چکا ہے۔ آپ کو شوق ہے میری انسلٹ کروانے کا۔" مسز خالد جو پہلے ہی ذہنی تھکان کے باعث ہلکان تھیں اس پر الٹ پڑیں۔

"کیا بکواس کر رہی ہو دماغ جگہ پر ہے تمہارا؟"

"آپ فضول میں یہ سب فیشن کروا کر میری انسلٹ کرواتی ہیں اسکول میں ماما۔" وہ روہانسی ہو گئی تو مسز خالد نے اسے خود سے لگا لیا۔

"ہائی سویٹ ہارٹ کس نے انسلٹ کی ہے تمہاری؟ کس کی یہ مجال کہ میری جان کو کچھ کہے بھی۔ تمہاری ٹیچرز کی اتنی ہمت کہ تمہیں فائن کریں۔ ہوتی کون ہیں وہ؟ میں کل ہی آؤں گی تمہارے اسکول تمہاری ٹیچرز کا دماغ درست کرنے۔" وہ اسے خود سے لگائے تھپک کر پیار کر رہی تھیں۔ ایسا موقع بہت کم ہی اشمل کی زندگی میں آیا تھا۔ وہ بھی چھوٹے سے بچے کی طرح ماں کے سینے سے لگی سسکتی رہی۔

اگلے روز ہی مسز خالد پرنسپل کے آفس میں موجود تھیں بمعہ شکایات کے انبار کے۔ پرنسپل انہیں صفائیاں دے دے کر تھک گئیں' مگر وہ خاموش ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ پرنسپل نے مس مریم کو بلا بھیجا۔ مس مریم کے آنے پر پرنسپل خود ایک طرف ہو گئیں اور ان دونوں کو آمنے سامنے کر دیا۔

"مس مریم آپ کو کس نے کہا کہ آپ میری بیٹی کو اس طرح سے فائن کرتی پھریں اور آپ اس کے پرسنلز میں مداخلت کریں۔ اشمل کیسی ڈریسنگ کرتی ہے' کیسا فیشن کرتی ہے ڈیٹ از نن آف یور بزنس' آپ کو ہم پڑھانے کے لیے پے کرتے ہیں یہاں بچوں

کی ذاتیات پر بولنے کے لیے نہیں۔" وہ بڑے کٹیلے انداز میں بولیں تو مس مریم کے ساتھ ساتھ پرنسپل کو بھی برا لگا۔

"مسز خالد اشمل ہماری بچی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسکول اور ٹیچرز کی ذمہ داری محض بچوں کو پڑھانا نہیں بلکہ ان کی گرومنگ کرنا بھی ہے۔ بچوں کی تربیت ماں باپ کے ساتھ اساتذہ کا بھی کام ہوتا ہے اور دوسری بات کہ اشمل ہمارے ڈسپلن کو خراب کر رہی ہے۔" مس مریم نے اپنے غصے پر قدرے قابو پا کر توجیہہ پیش کی۔

"اشمل میری بیٹی ہے اور اس کی تربیت میرا کام ہے۔ میں اپنے ماحول کے مطابق اس کی تربیت کروں گی آئندہ پلیز آپ میری بیٹی کے پرسنل میٹرز میں نہیں بولیں گی۔" وہ دو ٹوک بولتی پرنسپل کی طرف مڑیں۔

"اور مسز شیرازی اگر آئندہ مجھے پھر سے کمپلین آئی تو میں آپ کے ڈائریکٹر تک جاؤں گی۔" اپنے تئیں تنبیہہ کرتی وہ بیگ اٹھا کر پرنسپل آفس سے باہر نکل گئیں۔ مس مریم لب بھینچے پرنسپل آفس میں بیٹھی مسز شیرازی کی مناسب ہدایات سن رہی تھیں آخر میں اٹھتے ہوئے وہ محض اتنا ہی کہہ پائیں۔

"میڈم استاد ہمارے زمانے میں بھی ہوتے تھے اور اس سے کہیں سخت' اساتذہ سے آپ کی ہماری نسل پڑھی ہے جو ہمیں ڈنڈے بھی لگا جاتے تھے تو ہمارے والدین اتنا ہی کہتے تھے کہ غلطی تمہاری ہی ہو گی کہ استاد کبھی غلط نہیں ہو سکتا جب والدین ہی بچوں کے سامنے استاد کو غلط گردانتے ہیں تو بچہ بھی استاد کی عزت نہیں کیا کرتا۔ ایسے معاشرے میں پھر اخلاقی قدروں سے دور نسل کی ہی پرورش ہوتی ہے۔" مسز شیرازی ان سے متفق ہونے کے باوجود کچھ نہ کہہ پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کی چھٹیوں سے قبل اسکول میں ون ڈش پارٹی تھی۔ تیار فیشن کی دلدادہ نئی نسل کو دیکھ کر اساتذہ

خاموش ہی رہے۔ اشمل اس روز سرخ رنگ کی بغیر آستین کی فراک چوڑی دار پاجامہ بغیر دوپٹے کے زیب تن کیے ہوئے تھی۔

اس کی کلاس انچارج مس مریم نے دیکھ کر بھی ان دیکھی کر ڈالی۔

"ایسا لباس بچی خود تو خریدنے سے رہی، مائیں سلوا کر دیتی ہیں تبھی بچیاں پہن کر آتی ہیں نا۔" مس شائستہ کے توجہ دلانے پر وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں انہوں نے اب نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔ روحانی والدین کو جب روحانی بالیوگی سے روک دیا جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

اشمل نے حال ہی میں موبائل فون بھی ضد کر کے خرید لیا تھا اور اب وہ پارٹی کے دوران کسی کونے کھدرے میں بیٹھی سب سے نظر بچا کر مسلسل کسی کو پیغام بھیج رہی تھی۔

"چھٹی آج بارہ بجے ہے 'لازما' گیٹ پر آجانا۔"

آخری پیغام بھیج کر اس نے موبائل بڑی خاموشی سے اپنے پرس میں چھپا دیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق پارٹی میں شامل ہو کر وہ بارہ بجے اس حلیے میں گیٹ سے باہر نکل کر سامنے والی گلی میں داخل ہوئی جہاں کالی کیراڈ میں بیس برس کے لگ بھگ لڑکا اس کا منتظر تھا۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھی ہی تھی کہ سامنے سے آتی مس سنبل نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ مس سنبل نے گاڑی کا دروازہ کھولتے اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے باہر نکالا۔ برابر بیٹھا لڑکا خاموشی سے گاڑی بھگا لے گیا اور وہ خوفزدہ سی مس سنبل کے سامنے کھڑی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"چلو میرے ساتھ واپس اسکول۔" مس سنبل درشتی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے گھسیٹتے ہوئے واپس اسکول تک لے آئیں۔ وہ مجرم بنی پرنسپل آفس میں بیٹھی ان کے تمام سوالات کا جواب دے رہی تھی۔

کاشف صدیقی اس کا فیس بک پر بننے والا دوست تھا جس سے سات ماہ قبل اس کی دوستی ہوئی تھی۔ گھر میں والدین کی عدم توجہ کی بنا پر ہی وہ اس سے قریب ہوئی تھی اور آج دوسری مرتبہ وہ اس سے ملنے گئی تھی۔ وہ دونوں پہلے بھی اس طرح سے اسکول سے واپسی پر کسی پارک میں مل چکے تھے۔ فیس بک کے علاوہ اب دن رات ان دونوں کا موبائل فون پر بھی ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ پرنسپل نے مس مریم کو اس کی کونسلنگ کے لیے کہا تھا۔ مس مریم اسے لے کر خالی کلاس روم میں چلی آئی تھیں۔

"اشمل آپ کو پتا ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ وہ شخص کسی غلط ارادے کے تحت آپ کو کسی مصیبت میں بھی ڈال سکتا تھا۔" مس مریم نے اسے سمجھانے کے لیے مناسب الفاظ کا استعمال کیا۔

"میڈم میں بچی نہیں ہوں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ وہ کیا کیا کر سکتا تھا، مگر اس نے کرنا ہوتا تو پہلی دفعہ میں ہی کر لیتا۔" مس مریم کا تو گویا دماغ ہی گھوم گیا۔ آج کل کے میڈیا اور انٹرنیٹ نے واقعی بچوں کے ذہنوں کو قبل از وقت ہی بہت بڑا کر دیا تھا کسی قسم کا حجاب ہی اب بڑوں اور بچوں کے درمیان حائل نہ رہا تھا۔ یہ خود اعتمادی نہیں بے راہ روی اور بے حیائی تھی جسے ہم خود اعتمادی کا جامہ پہنا کر اپنا سینہ ٹھونکتے پھرتے ہیں۔

"اچھی بیٹیاں اس طرح کے کام نہیں کرتیں اشمل۔ آپ کے والدین کو معلوم ہو گا تو کیا ہو گا یہ نہیں سوچا آپ نے۔" مس مریم بہت ٹھہر ٹھہر کر بولیں تو وہ طنزیہ ہنسی ہنس دی۔

"میرے والدین نے خود مجھے اس راستے پر دھکیلا ہے میڈم۔ جن بچوں کو مناسب توجہ اور پیار گھر سے نہ ملے تو وہ اسی طرح پیار کے پیچھے بھاگتے باہر کے لوگوں میں پناہ لیتے ہیں۔" اس کے اندر کی محرومیاں باہر آنے لگی تھیں۔

"میڈم کیا میری ماما کو نظر نہیں آتا کہ میں کیسی ڈریسنگ کرتی ہوں، کن ایکٹیویٹیز میں انوالو ہوں؟ انہیں مجھے گائیڈ کرنا چاہیے کہ نہیں؟ آج تک انہوں نے مجھے نہیں روکا۔ جن پیرنٹس کے پاس بچوں کے لیے وقت نہ ہو ان کے بچے کم عمری میں ہی اچھے برے تجربے کر لیتے ہیں تو انہیں پھر افسوس نہیں کرنا چاہیے۔" وہ اتنی تلخ اور حساس ہو گی مس مریم کو قطعا" اندازا نہ تھا۔ غلطی واقعی اس بچی کی نہیں "بڑوں" کی تھی۔ کچے ذہنوں کو جس ماحول میں پنپنے کے لیے چھوڑ دیا جائے وہ اسی ماحول میں نمو پاتے ہیں۔ اولاد کی پرورش کا کام تو والدین اور اساتذہ پر بڑی بھاری ذمہ داری ہے اور اگر یہ ذمہ داری مناسب انداز میں پوری نہ کی جائے تو ایسے ہی بچے جنم لینے لگتے ہیں جو آگے چل کر خاندان کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے بھی ناسور بننے لگتے ہیں۔ مس مریم نے روتی بلکتی اشمل کو سینے سے لگالیا۔ اس وقت وہ صرف اور صرف ایک ماں بن گئی تھیں۔۔۔ روحانی ماں۔

☼ ☼ ☼

"اتنا کچھ ہو گیا اور آپ لوگوں نے مجھے انفارم تک نہیں کیا۔"

مسز خالد کو بلا کر پرنسپل نے مناسب الفاظ میں ساری تفصیل سنا ڈالی تھی۔ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی بجائے ان ہی پر چڑھ دوڑی تھیں۔

"کلاس ٹیچر کس کام کی ہیں؟ کیا وہ چیک نہیں رکھ سکتی تھیں کہ ان کی کلاس کی بچیاں کیا کر رہی ہیں؟" انہوں نے کڑے تیوروں سے مس مریم کو گھورا تو وہ بولنے سے خود کو روک نہ پائیں۔

"مسز خالد۔۔۔ جب آپ خود ہی ہمیں سختی سے منع کر کے گئی تھیں کہ آپ کی بچی کی ذاتیات سے ہمیں دور رہنا ہے تو آپ کس حق سے ہمیں بلیم کرنے آئی ہیں۔ ویسے تو والدین محض اساتذہ کی اتنی ہی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں سائنس، میتھس، انگلش سمجھا دیں اور بس۔۔۔ تو ایسے معاملات پر پھر آپ کو ہماری ریسپانسبلٹیز کیوں یاد آجاتی ہیں؟ عام حالات میں آپ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ٹیچر کا کوئی رائٹ بھی ہے بچے کو کچھ کہنے کا پھر ایسے معاملات میں کیوں بھاگے چلے آتے ہیں؟ جب آپ لوگوں نے ٹیچرز کے ریلیشن کو خود ہی بچوں کی پرورش سے الگ کر ڈالا ہے تو پھر کس بیس پر آپ ہم سے شکایت کرنے آئی ہیں۔"

مسز خالد لاجواب ہو گئیں۔

"مس مریم۔" پرنسپل نے انہیں ٹوکا تو وہ بول پڑیں۔

"پلیز میڈم لیٹ می اسپیک۔۔۔ مسز خالد والدین کا کام بچوں کو پیدا کر کے تمام ضروریات فراہم کر کے چھوڑ دینا نہیں ہوتا بلکہ انہیں صحیح غلط کی پہچان کرانا بھی ہوتا ہے۔ نوکر چاکر اور یہ تمام ضروریات زندگی والدین کا نعم البدل نہیں ہیں۔ پیار کے نام پر آپ بچوں کو انگلی تک نہ لگائیں اور ڈانٹیں بھی نہیں۔۔۔ یہ کہاں کا پیار ہے؟ بچوں کی غلط حرکات پر ان کی بھلائی کے لیے انہیں سمجھانے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی انہیں جھڑکنا اور مارنا بھی پڑتا ہے۔ ذرا سے رونے اور ضد کرنے پر ان کے ہاتھ میں ہر چیز تھما دینا بچوں سے پیار نہیں دشمنی ہے۔ اولاد کی پرورش اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو اشمل آج اس اسٹیج پر نہ پہنچتی۔ بچوں کو پیسے سے کہیں زیادہ ماں باپ کی توجہ، پیار اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور خدا کے لیے بچوں کے ذہن سے یہ نکال دیں کہ ٹیچرز ان کے ویل وشر نہیں ہیں۔ ٹیچرز کو اپنے طریقے سے کام کرنے دیں وہ ان کا بھلا چاہتے ہیں نقصان نہیں۔ بچوں کو ٹیکنالوجی سے متعارف ضرور کرائیں، مگر ان کے ساتھ بیٹھ کر ان پر چیک اینڈ بیلنس بھی رکھیں۔ ہر عمر کا بچہ ہر ٹیکنالوجی استعمال کرے یہ اخلاقی تنزلی کا سفر ہے۔ ہر کام کا، ہر چیز کے استعمال کا ایک وقت، ایک عمر ہوتی ہے اور کوئی بھی کام نہ وقت سے پہلے فائدہ مند ہے نہ بعد میں۔۔۔ تھینک اباؤٹ اٹ۔"

یہ کہہ کر وہ رکی نہیں وہاں سے چلی گئیں البتہ مسز خالد کے لیے وہ اولاد کی پرورش کے حوالے سے بہت سے در وا کر گئی تھیں جن پر اب انہیں سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت تھی۔

☼ ☼

شازیہ جمال نیر

تیرے ساتھ جو گزری

اس نے سخت کوفت زدہ انداز میں وال کلاک کی لمحہ بہ لمحہ سرکتی سوئیوں کو دیکھا تھا۔ وقت بہت تیزی سے بیتتا جا رہا تھا اور ماما جی کے گھر آنے کے آثار تاحال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

اب سے پندرہ منٹ بعد ٹھیک دس بجے اس کی عزیز از جان دوست فاریہ کا برتھ ڈے فنکشن شروع ہونے والا تھا اور اس نے ان پندرہ منٹوں میں ماما جی سے اجازت لے کر فاریہ کے گھر پہنچنے تک کے مراحل طے کرنا تھے۔

"بی بی! صاحب بس آتے ہی ہوں گے آرام سے بیٹھ جائیں یوں چکر لگا لگا کے تو آپ کے پاؤں میں درد شروع ہو جائے گا۔" بنتو نے دبی دبی آواز میں ایک بار پھر اپنی درخواست دہرائی تھی۔

"اوہ شٹ اپ بنتو.....!" کونے میں کھڑی پریشان حال بنتو کو اپنی درخواست کے جواب میں ایک بار پھر اس کی جھنجھلاہٹ بھری ڈانٹ سنائی دی تو اس کی لاچار نظریں خود بخود سفید موتیوں کے کام والے نفیس ہاف اوپن کھسے میں مقید اس کے گلابی پیروں سے الجھ گئیں۔

اس نے ٹخنوں کو چھوتا سفید نیٹ کا فراک پہن رکھا تھا جس کی پٹی پر بے شمار سفید ستارے جھلملا رہے تھے۔ بالوں کو انتہائی عمدگی سے سیٹ کر کے ایک کندھے پر ڈال رکھا تھا جس سے جھانکتے سفید بندے مسلسل ہل رہے تھے۔

بیڈ پر پڑے اس کے موبائل کی مسلسل جلتی بجھتی اسکرین اس کی کوفت میں اضافے کا باعث بن رہی تھی قریب تھا کہ وہ موبائل اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارتی کہ اچانک اسے پورچ میں ماما جی کی گاڑی رکنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر ریلنگ تک گئی تھوڑا سا نیچے جھانک کر دیکھا ماما جی کے قدموں کی مخصوص دھمک سارے میں گونج رہی تھی وہ دونوں ہاتھوں سے فراک تھوڑا سا اوپر اٹھائے ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

"ارے ارے کہاں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟"

اس کے قدم عین ماما جی کے سامنے دو قدم کے فاصلے پر آ کر رکے تھے۔

"جانتے ہیں میں کتنی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" اس نے اپنی سانسیں درست کرنے میں بھی وقت صرف کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میرا انتظار؟ وہ کیوں؟" ملازم کو بیگ دے کر وہ اس کے کندھے پر بازو پھیلائے اندر کی جانب بڑھنے لگے۔

"مجھے فاریہ کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا ہے۔ آپ سے اجازت لیے بغیر کیسے جاتی؟"

"اوہ! آئی ایم سوری جانو! کب جانا ہے؟"

"اب سے ٹھیک آٹھ منٹ بعد مجھے فاریہ کے گھر موجود ہونا ہے ماما جی!" اس نے بچوں کے سے انداز میں اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا۔

"او کے! میں ڈرائیور سے کہتا ہوں میری وجہ سے تم پہلے ہی کافی ٹینشن اٹھا چکی ہو بٹ ناؤ چیئر اپ ڈارلنگ!" ماما جی نے اپنے مخصوص انداز میں اس

رخسار سہلایا تھا۔وہ کھل کر مسکرادی۔

"آپ دنیا کے سب سے بیسٹ ماماجی ہیں نا!"

"نہیں، تم دنیا کی سب سے بیسٹ بھانجی ہو!" ٹھیک اسی کے انداز میں کہتے انہوں نے اسے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چاچا! کیسٹ پلیئر آن کریں" اس نے قدرے آگے کو ہو کر ڈرائیور سے کہا تھا جس نے اس کے حکم کی تعمیل میں صرف ایک لمحہ صرف کیا تھا۔

"میں جہاں رہوں، میں کہیں بھی ہوں تیری یاد ساتھ ہے!" سنگر کے سحر زدہ الفاظ دردو سوز میں ڈوبی آواز نے جادو سا جگا دیا تھا۔

"چاچا! آپ کو نہیں لگتا کہ کل بارش ہوگی؟" جب اس کا موڈ خوشگوار ہوتا تو دل چاہتا ڈھیر ساری باتیں کرے۔ یونہی چھوٹی چھوٹی بے معنی باتیں! اس بات کی پروا کیے بغیر کہ سامع ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس کا ڈرائیور ہے یا پودوں کی دیکھ بھال پر مامور مالی، کچن میں بری طرح مصروف خانساماں یا اس کی خاص ملازمہ بنتو!۔

"خدا معلوم بی بی! میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" ڈرائیور نے پیش گوئی کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ اس نے یونہی سر ہلاتے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"ویسے چاچا! اگر کسی دن میرا اور آپ کا کار ریس کا مقابلہ ہو جائے تو آپ کا کیا خیال ہے کون جیتے گا؟"

"آپ جیتیں گی بی بی!" ڈرائیور کے مودب الفاظ پر وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"پچھلے اکیس سالوں سے آپ ڈرائیونگ کرتے چلے آرہے ہیں اور مجھے ڈرائیونگ سیکھے ابھی صرف ایک سال تین ماہ اور چند دن ہوئے ہیں۔ پھر میں کیسے جیت سکتی ہوں بھلا؟" اس نے مسکراہٹ روک کر قدرے جرح کرنے والے انداز میں پوچھا تھا۔

ڈرائیور نے کچھ کہنے کی بجائے لب بھینچ لیے۔ اسٹیئرنگ پر جمے اس کے ہاتھوں کا اضطرار اور چہرے پر پھیلے مخمصے کے تاثرات اس نے پہلی بار نوٹ کیے تھے۔

"چاچا! کوئی مسئلہ ہے کیا؟" وہ اپنے احساسات کو الفاظ کا روپ دینے میں زیادہ دیر نہیں کرتی تھی۔ ڈرائیور نے اضطراری انداز میں اسٹیئرنگ پر انگلیاں پھیری تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا ادھیڑ عمر ڈرائیور خاصا باتونی انسان ہے۔ وہ ایک بات شروع کرتی تو وہ نجانے کہاں کہاں کے قصے چھیڑ ڈالتا۔ آج اس کے انداز غیر معمولی پن کا اشارہ دے رہے تھے۔

"او جسٹ آمنٹ...!" اسے اچانک جیسے کچھ یاد آگیا تھا۔

"آپ اس دن اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بتا رہے تھے نا؟ پھر کب سے شروع ہے شادی؟"

"شادی تو شروع ہو چکی ہے بی بی! لیکن ایک مسئلہ ہے..."

"کیسا مسئلہ؟"

"آپ شاید نہیں جانتیں شادی بیاہ کے موقع پر سینکڑوں کام نبٹانے ہوتے ہیں، میرے گھر کی تو جی پہلی شادی ہے بڑا بیٹا کوئی ہے نہیں... تو اس لیے فکر ہو رہی تھی وہاں پتا نہیں سب کیسے چل رہا ہوگا؟" ڈرائیور نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی تھی۔ ماہین نے تاسف سے اپنا ماتھا چھوا۔

"اف! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا... آپ کی بیٹی کی شادی کی تقریبات چل رہی ہیں اور آپ یہاں گھر والوں سے اتنی دور..." اسے سچ مچ بہت افسوس ہوا تھا۔

"اب مزید وقت ضائع کرنا کسی طور مناسب نہیں، آپ ایسا کریں سیدھا یہاں سے اپنے گھر جائیں اور بھرپور طریقے سے اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کریں۔" اس کی فطری رحمدلی اچانک عود کر آئی تھی۔ گاڑی کے ٹائر فاریہ کے گھر کے میرون گیٹ کے سامنے چرچرائے تھے۔

"لیکن بی بی...! میں آپ کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد آپ کو گھر چھوڑنا میری ڈیوٹی ہے۔"

"میں خود ڈرائیو کر سکتی ہوں بلکہ اچھا خاصا ڈرائیو کر سکتی ہوں۔ آپ فی الحال ماماجی سے کوئی بات مت کیجیے گا۔ میں خود واپس جا کر ان سے بات کر لوں گی۔ بس اب ساری باتیں چھوڑ کر اپنے گاؤں جانے والی گاڑی پکڑیں اس وقت آپ کی بیٹی کی خوشی زیادہ اہم ہے۔" اس نے گاڑی کا دروازہ بند کر کے چابی ان کے ہاتھ سے لے لی۔ اس کے چہرے پر حوصلہ دلاتی مہربان مسکراہٹ تھی۔ گفٹ پیک سنبھالے، ہاتھ ہلاتی آگے بڑھ گئی۔

"مجھے معاف کر دینا بی بی! میں مجبور ہوں۔ اس وقت میری بیٹی کی خوشی واقعی زیادہ اہم ہے۔" بہت مشکل لگتا ہے کسی مہربان ہستی کو دھوکہ دینا اس وقت ڈرائیور کو بھی بہت مشکل لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

بنی سنوری فاریہ نے اسے سرتاپا بہت بری طرح گھورا تھا۔ ادھر پروا کسے تھی؟ گفٹ ٹیبل پر رکھ کر مزے سے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گنگناتی وہ فاریہ سے لپٹ گئی۔

"بہت بری ہو تم ماہی! سچ میں!" فاریہ نے خفگی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔ اصل میں تو اسے اپنے غصے کے گراف کے اتنی جلدی نیچے آنے پر خود پر غصہ آیا تھا۔

"اگر تم مزید دو منٹ بھی لیٹ ہو جاتیں تو قسم سے میں نے تمہارا سر پھاڑ ڈالنا تھا۔"

"ہاؤ! فاری تم اتنی خونخوار کب سے ہو گئیں؟" اس نے جان بوجھ کر معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائی تھیں فاریہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"کھوں کھوں!" عقب سے افشین اور سائرہ نے بیک وقت گلا کھنکھارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

"یوسف سچ کہتا ہے ماہی! تم واقعی۔ اس کی رقیب روسیاہ بنتی جارہی ہو۔ تمہیں دیکھ کر فاریہ بی بی کو کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔" افشین کی بات پر وہ قدرے جھینپ سی گئی تھی۔

اسی دم فاریہ کی ممی ملازمہ کے ساتھ انواع و اقسام کے لوازمات سے لدی پھندی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی تھیں۔ ماہی آگے بڑھ کر ان سے ملنے لگی۔ اسے فاریہ کی گریس فل ممی بہت اچھی لگتی تھیں۔

"یوسف کہاں ہے؟" اسے بہت جلد سب سے اہم بندے کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

"آؤٹ آف سٹی۔" جواب سائرہ نے دیا تھا۔

"ویری بیڈ!" اس کے تبصرے پر فاریہ نے محض کندھے اچکائے تھے۔ کیک کٹا تحائف دیئے گئے، خوب ہلا گلا رہا۔ فاریہ کی ممی خرابی طبیعت کی وجہ سے جلد ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں تو یہ چاروں اوپر فاریہ کے کمرے میں آگئیں۔

"سنو! میں نے "میرا چھلا ولا" پر بہت زبردست ڈانس سیکھا ہے۔ دکھاؤں؟" افشین نے رائے طلب

نظروں سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"میری طرف سے معذرت! پہلے ہی سر میں شدید درد ہے اگر فاریہ کی پارٹی میں شرکت نہ کرنا ہوتی تو اس وقت یقیناً" ٹیبلٹ لے کر سوئی پڑی ہوتی۔" سائرہ نے اپنا دامن بچایا۔

"موڈ نہیں ہے۔" بیڈ پر نیم دراز ماہی نے بے مروتی دکھائی۔

"آں۔۔۔! دیکھ لیتے ہیں کوئی حرج نہیں" فاریہ نے گویا اس کی سات نسلوں پر احسان کیا تھا افشین کے تو تلووں میں لگی اور سر پر بجھی۔

"مرو تم لوگ آدم بے زار بوڑھیاں!" تینوں خوب ہنسیں۔ افشین نے چڑ کر ان تینوں پر کشن کی بارش کردی۔ آخر تھک ہار کر ان کے قریب ڈھیر ہوگئی۔ گھڑیال نے بارہ بجنے کا شور مچایا تو ماہی ہڑبڑا کر گویا کسی خواب سے جاگی تھی۔

"اوہ! اتنی دیر ہوگئی۔ اچھا سکھیو مجھے اجازت دو ویسے بھی آج میرا ڈرائیور ساتھ نہیں۔"

"آج رات ٹھہر جاؤ ماہی!" فاریہ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی۔

"نہیں یار! ماما جی سے اجازت نہیں لی تھی۔"

"اُفوہ! ایک تو تمہارے یہ ماما جی!" تینوں بیک وقت بولی تھیں۔

"اے خبردار! میرے ماما جی کے بارے میں کوئی ایک لفظ بھی کہا تو۔۔۔" اس نے فوراً" انگلی اٹھا کر تنبیہاً" کہا تھا۔

"اچھا! سنو مجھے تو راستے میں ڈراپ کردو گی نا؟" افشین نے دوپٹہ اوڑھتے ہوئے پوچھا۔ فاریہ کی ممی سائرہ کی خالہ تھیں سو اس کے پاس رکنے کا ٹھوس جواز تھا جبکہ ان دونوں نے واپسی کے لیے اجازت چاہی تھی۔ فاریہ کا ڈرائیور بھی آج چھٹی پر تھا وہ ان دونوں کے بارے میں کچھ متفکر سی تھی۔

☼ ☼ ☼

افشین کو اس کے گھر کے گیٹ پر چھوڑنے کے بعد اس نے گاری فل اسپیڈ میں دوڑادی۔ شہر کی پر رونق سڑکوں پر آہستہ آہستہ سناٹا چھا رہا تھا۔ رات کا پہر اور ڈرائیور کی عدم موجودگی! اسے فطری پریشانی نے آن گھیرا۔

"اور یہ چاچا بھی خوب ہیں" اس کا ذہن ڈرائیور کی باتوں میں الجھا تھا۔ ماما جی تک یہ بات کیسے پہنچائی جائے کہ وہ۔۔۔

مختلف سوچوں میں غلطاں لاشعوری طور پر اس نے گاڑی کی رفتار اور بڑھادی تھی۔ ایک لحہ کی چوک ہوئی اور۔۔۔ اور اسے لگا گویا ساتوں آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے ہوں۔ اس نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دوسری جانب وہ اپنی کار کا دروازہ بند کر کے تقریباً" بھاگتے ہوئے اس کی سمت آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی مس! آر یو اوکے؟" قدرے آگے کو جھکا وہ انتہائی تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ ماہی نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بدقت اس کی جانب دیکھا۔ وہ بہت پریشان نظروں سے اس کی پیشانی سے گرتی خون کی بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔

"نو! آئی ایم ناٹ اوکے!" خون آلود انگلیوں کی پوروں کو دیکھ کر وہ سسکنے لگی تھی۔

"دیکھیں! پلیز روئیں مت ادھر قریبی کلینک تک چلتے ہیں' زخم کی بینڈج کروانا بہت ضروری ہے۔" اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے وہ ٹھہر ٹھہر کر شائستگی سے بولا تھا۔

"نہیں۔۔۔! مجھے اپنے گھر جانا ہے میرے ماما جی پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"تو کیا اس حالت میں دیکھ کر پریشان نہیں ہوں گے؟" نا چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تیز ہوگیا تھا۔ پھر قدرے نرم لہجے میں کہنے لگا۔

"میں کسی سے کہہ کر آپ کی کار سروس کے لیے بھیج دیتا ہوں اور آپ میرے ساتھ کلینک تک چلیے۔" ماہی تذبذب کے عالم میں اسے دیکھے گئی جو ہنوز کرسی پر جھکا آنکھوں میں اپنائیت لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیے! ہر کسی پر اعتبار کرنا اچھی بات نہیں' لیکن ضرورت پڑنے پر کسی ایک پر اعتبار کرلینا چاہیے۔"

"اور اگر وہ کوئی ایک بھی ناقابل اعتبار نکلے تو۔۔۔؟" وہ آنسوؤں سے بوجھل پلکیں جھپک جھپک کر یوں معصومیت سے بولی تھی کہ مقابل کے لیے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔

"آپ کو میرے ماتھے پر "قابل اعتبار" کا بورڈ چسپاں تو نظر نہیں آرہا ہوگا اور مشکل یہ ہے کہ میرے پاس آپ کو دکھانے کے لیے کوئی "شرافت سرٹیفکیٹ" بھی نہیں ہے تو ایسا کریں گھر والوں سے کانٹیکٹ کر کے کسی کو بلوالیں۔" آرام سے کہتے ہوئے وہ ایکدم سیدھا ہوگیا اور بازو سینے پر باندھ کر سڑک پر رواں اکا دکا ٹریفک دیکھنے لگا۔

"نہیں۔۔۔! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر قدم باہر رکھا تو لگا چودھویں کے چاند نے اپنی ساری چاندنی اس پر لٹا دی ہو۔ اس کا حسن خیرہ کن تھا وہ اپنی جگہ سحرزدہ سا کھڑا رہ گیا۔

"بینڈیج کروانے کے بعد آپ مجھے جلدی سے میرے گھر تک چھوڑ دیں پلیز!" دل ہی دل میں جھنجلاہٹ پر قابو پاتی وہ بمشکل اس کا ارتکاز توڑنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"معذرت کا کوئی بھی لفظ اس تکلیف کا مداوا کرسکتا ہے جو تمہاری اس غیر ذمہ داری اور غفلت کی وجہ سے ماہین کو سہنا پڑی؟" ماما جی بری طرح ڈرائیور پر برس رہے تھے۔ سر جھکائے کھڑے ڈرائیور کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی تھی۔

"ایک نمبر کا الو کا پٹھا ہوں میں' جس نے دنیا جہان کے کام چوروں کو اپنے گھر مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے جمع کر رکھا ہے۔" ان کے غصے کی کوئی حد نہیں

تھی۔ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے ادھر سے ادھر ٹہلتے وہ اپنے اشتعال پر قابو پانے میں "قطعاً" ناکام ثابت ہو رہے تھے۔

"اف! اگر وہ منحوس حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو میں بہت آسانی سے سب ہینڈل کرلیتی۔" ماہی نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دوپٹے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائی تھیں۔ اس کا ارادہ جان کر بنتو چوکس ہو کر بیٹھ گئی۔

"بی بی! لیٹی رہیے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"اوہ شٹ اپ بنتو! کتنی بار کہا ہے مجھے ٹوکا مت کرو۔" سائیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے آرام دہ چپل پاؤں میں اڑستی وہ سیڑھیوں کی جانب بھاگی تھی۔

"ماما! پلیز! انہیں کچھ مت کہیں، میں نے خود انہیں جانے کی اجازت دی تھی۔" ماما جی نے گردن موڑ کر قدرے خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

"ماہی! دس از ناٹ فیئر بیٹا! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔"

"یہ سب یوں ہی ہونا تھا ماما جی! کسی کا کوئی قصور نہیں۔ آپ پلیز زیادہ اسٹریس نہ لیں ویسے بھی میں بالکل ٹھیک تو ہوں۔" ماما جی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔

"کہاں سے سیکھ لی ہیں ایسی دل میں اتر جانے والی باتیں؟" وہ مصنوعی بے چارگی سے بولے تو اس نے ہنستے ہوئے ان کے عقب میں کھڑے ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے جانے کا کہا اور خود ماما جی کا بازو تھامے واپس مڑ گئی۔

"بہر حال! میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، کون تھا وہ؟"

"میں نہیں جانتی اسے اور نہ ہی میرے پاس اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ ماما جی اس کی کبھی کبھار لاپروائی برت جانے والی عادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ سو گہری سانس کھینچ کر رہ گئے۔

"زندگی میں جب بھی موقع ملے اپنے محسنوں کا احسان اتار دینا چاہیے اور اس کے لیے ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔"

"اوہ کم آن ماما جی! وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ ہم نے کون سا ان سے رابطہ رکھنا ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہتے کندھے اچکائے تھے۔

"کچھ رابطے رکھنے نہیں پڑتے، بلکہ خود بخود قائم ہو جایا کرتے ہیں۔" سرخ روش پر سر جھکائے چلتے ڈرائیور چاچا نے سر جھٹکا تھا۔

☼ ☼ ☼

تازہ پھولوں کی دلفریب مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا سرخ مہکتے گلابوں کا بوکے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ چکا تھا۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر سیدھی ہو بیٹھی۔ کمر پر گری بالوں کی آبشار سمیٹ کر دائیں کندھے پر ڈالی اور ہاتھ بڑھا کر بوکے اٹھا لیا۔ اس نے پھولوں میں اٹکے چھوٹے سے سنہری کارڈ کو باہر کھینچا۔ "پھولوں جیسا حسن رکھنے والی لڑکی کے لیے۔" وہ ابھی ٹھیک طرح سے حیران بھی نہیں ہو پائی تھی کہ موبائل کی بپ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ اس نے یوں ہی بلا ارادہ موبائل اٹھا کر کر کان سے لگا لیا۔

"پھول پسند آئے؟" خوب صورت گمبھیر آواز اسے شناسا سی لگی تھی۔ اس نے الجھ کر پہلے ہاتھ میں تھامے بوکے کو دیکھا۔ پھر کان سے ہٹا کر موبائل کو جو اُدھر وہ کہہ رہا تھا۔

"بے وقت فون کرنے کے لیے معذرت! آپ کی طبیعت پوچھنا مطلوب تھا۔ پیشانی کا زخم کیسا ہے اب؟"

"بہت بہتر!" اس نے دو لفظی مختصر جواب دیا تھا۔ اسے بلیک جینز پر اسکائی بلیو ٹی شرٹ پہنے وہ نوجوان اپنی تمام تر وجاہت سمیت یاد آ گیا تھا۔

"آپ کو میری جسارت بری تو نہیں لگی؟"

"کون سی؟" ماہی الجھی تھی۔

"پھول بھیجنے والی! ویسے آپ نے بتایا نہیں آپ کو پھول پسند آئے؟"

"کون سے سوال کا جواب دوں پہلے یا دوسرے؟" بنتو اس کا آج کے لیے منتخب کیا گیا۔ لباس استری کر کے اندر داخل ہوئی تھی۔ ماہی نے محض ایک نظر اس کے ہاتھ میں ہینگر ہوئے کپڑوں کو دیکھا تھا۔

"دونوں کا! لیکن واضح رہے پہلے کا جواب نہیں اور دوسرے کا ہاں ہونا چاہیے۔" ماہی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"آپ باتیں بہت خوب صورت کرتے ہیں؟"

"کچھ لوگ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ انہیں سوچ کر ہی خوب صورت لفظوں کی مالا زبان سے جھڑ کر سماعتوں میں بکھرنے لگتی ہے۔" ماہی نے بے ساختہ نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا۔ بنتو اس کے کپڑے واش روم میں لٹکانے کے بعد اب کھڑکیوں کے پردے سمیٹ رہی تھی۔

ماہی کو احساس ہوا کہ اب اسے فون رکھ دینا چاہیے۔ وہ کیوں خوامخواہ کسی اجنبی سے بے تکلف ہو رہی ہے؟ لیکن دل۔۔۔ اس نے دماغ کی آواز پر لبیک کہتے دل کا مان بھی رکھ لیا۔ فون رکھنے سے پہلے دل چاہا اپنے مخاطب کا نام پوچھ لے سو اس نے پوچھ لیا۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟"

"بہت جلدی خیال نہیں آ گیا آپ کو نام پوچھنے کا؟"

"جلد یا بدیر آ تو گیا نا۔ ویسے بھی زندگی اگر اپنے محسن کا احسان چکانے کا موقع دے تو ان سے۔۔۔ واقف ہونا ضروری ہے۔" وہ قدرے بے نیازی سے بولی تھی۔

"تو چلیے آپ مجھے اپنے محسن کے نام سے یاد کر لیجیے گا۔"

"نہیں۔۔۔ اصلی والا نام بتائیے؟" اس نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا تھا۔

"پیار کا نام تو سنا تھا یہ اصلی اور نقلی نام بھی ہوتے ہیں کیا؟" دوسری طرف سے گویا لطف لیا گیا تھا۔

"آپ ایک بار پھر مجھے الجھا رہے ہیں۔" وہ نروٹھے پن سے کہہ کر فون بند کرنے والی تھی۔ جب دوسری طرف متبسم لہجے میں کہا گیا۔

"خاکسار کو زیاد احمد کہتے ہیں۔" اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ اس کی آنکھ اچانک کھلی تھی۔ وہ کچھ دیر تو یوں ہی خالی الذہنی سی کیفیت میں بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ پھر کشن ایک طرف ہٹاتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے دل کو عجیب سی گھبراہٹ نے آن گھیرا تھا۔ کمرے میں نیلگوں بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے سے آتی مدھم آوازیں رات کے سناٹے میں ہلکے ہلکے ابھرتے شور سے مشابہ تھیں۔ وہ ننگے پاؤں ننگے سر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس نے اس وقت نیلے رنگ کا آرام دہ ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔

لاؤنج کے نیم وا دروازے سے باتیں کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے پورا دروازہ کھول دیا دھاڑ کی آواز پر کمرے میں موجود تینوں نفوس نے بیک وقت گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

"واہ!" ماما جی کے ساتھ صوفے پر بیٹھے سفاری سوٹ والے ادھیڑ عمر مرد کے منہ سے بلا ارادہ نکلا تھا۔

"ایسا ہیرا کہاں چھپا رکھا تھا سیٹھ! ہم تو یاروں کے یار ہیں پھر ہم سے کیسی پردہ داری؟" سفاری سوٹ والے کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اس کی غلیظ نظریں ماہی کو اپنے جسم کے آر پار اترتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے دروازے کا پٹ مضبوطی سے تھام کر اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری تھی۔

"ماما جی۔"

"ماہی! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ یہاں سے۔" ماما جی صوفے سے اٹھ کر چلائے تھے۔

"ماما جی۔۔۔ یہ۔"

"تم نے سنا نہیں؟ میں نے کیا کہا ہے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ پوری قوت سے دھاڑے تھے۔ ماہی ششدر سی دو قدم پیچھے ہٹی پھر بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"ماما جی نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی اور یہ لوگ ان کی باتیں۔" وہ بیڈ پر گر کر منہ پر ہاتھ رکھے سسکنے لگی۔

صبح اس نے نہا دھو کر بنتو کا لایا گہرے سبز رنگ کا گھیردار فراک پہن رکھا تھا۔ ہلکی سی نمی لیے بالوں کو سمیٹ کر گردن کے ایک جانب ڈالا اور کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ بنتو بنا اس کے کہے خاموشی سے اس کی کمر کی ڈوریاں کسنے لگی۔ ماہی چپ چاپ سامنے پھیلے وسیع سرسبز لان کے مہکتے پھولوں پر رقص کرتی سنہری تتلیاں دیکھنے لگی۔

رت جگے اور بے تحاشا رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ رات کا منظر ایک لمحے کے لیے بھی تو اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا اور ماما جی کی سرد آواز۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگی تھیں۔ ڈوریاں کسنے کے بعد بنتو اب اس کے بالوں کی چوٹی کے ہر بل میں موتیے کے پھول پرو رہی تھی۔ یہ اس کا برسوں پرانا معمول تھا۔

"بی بی! صاحب ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" نذیراں دوسری بار پیغام لیے حاضر ہوئی تھی۔ بنتو نے اپنا کام ختم کیا تو وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ آئینے پر نگاہ ڈالے بغیر دوپٹا درست کرتی وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

"گڈ مارننگ جان ماما!" ماما جی اپنی مخصوص کرسی سے اٹھ کر والہانہ انداز میں کہتے اس کی جانب بڑھے تھے۔ وہ بے ساختہ ان کے سینے سے سر ٹکا کے رونے لگی۔

"آئی ایم سوری جانو! ایکسٹریملی سوری فار ایوری تھنگ۔" وہ اس کے سر پر بوسہ دیتے ندامت سے کہہ رہے تھے۔

"وہ لوگ کون تھے ماما جی؟ اور ہمارے گھر میں کیا کر رہے تھے؟" وہ ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کرتی ان سے الگ ہوئی تھی۔

"کچھ کاروباری دوست تھے نامعقول! انہیں گھر لانے کی غلطی کر کے بہت شرمندہ ہوں میں تم سے اور خود سے بھی اور مجھے ڈر ہے اس غلطی کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑ جائے کہیں۔" آخری بات انہوں نے خود سے زیر لب کہی تھی۔ جبکہ ماہی تو انہیں سابقہ موڈ و انداز میں دیکھ کر ہی نارمل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"بنتو! میں ذرا باہر جا رہی ہوں کچھ دیر میں آجاؤں گی۔" ٹی وی میں بری طرح منہمک بنتو ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"میں بھی ساتھ چلوں؟"

"اور تم جانتی ہو میرا جواب کیا ہو گا؟" بنتو خجل سی ہو کر دہلیز پر کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

وسیع و عریض رقبے پر کھڑے اس پر شکوہ بنگلے میں ملازموں کی فوج ظفر موج تھی۔ ماما جی کی اپنی مصروفیات، ایسے میں کبھی کبھار وہ بری طرح بور ہو جاتی۔ فاریہ اور سائرہ اپنے ماموں زاد عامر کی منگنی کا فنکشن اٹینڈ کرنے لاہور گئی ہوئی تھیں۔ جبکہ افشین جوائنٹ فیملی سسٹم کی پروردہ تھی۔ ڈھیر سارے رشتے خوب گہما گہمی، ایسے میں اسے بور ہونے کا گلہ کبھی نہیں رہا تھا۔

اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ڈرائیور مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کہاں جانا ہے بی بی؟"

"قریبی پارک تک جا رہی ہوں چاچا! آپ بیٹھیں میں خود ہی کچھ دیر بعد آجاؤں گی۔" ڈرائیور ایک طرف ہٹ گیا اور ماہی نے جوں ہی گیٹ سے قدم باہر رکھا۔ وہ جیب سے موبائل نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا تھا۔

دونوں اطراف اونچے لمبے درختوں میں گھری

سڑک پر خشک پتے ہوا سے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ اس نے جھک کر دل کی شیپ کا ایک زرد پتا اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا اور پھونک مار کر اڑا دیا۔

"تمہیں دیکھ کر پرستان سے راستہ بھول کر آئی کسی پری یا ڈار سے بچھڑی کونج کا گماں کیوں ہوتا ہے؟" اسے اپنی دائیں جانب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے وہ قدم باقدم اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

"آپ نے پرستان دیکھا ہے؟"

"نہیں، پری دیکھی ہے۔" اس نے بازو سینے پر باندھ لیے تھے۔ ماہی سنی ان سنی کا تاثر دیتی درخت میں کھیلتی بھوری چڑیا دیکھنے لگی۔

"ویسے تم نے اپنا نام نہیں بتایا مجھے۔"

"بہت جلدی خیال نہیں آگیا آپ کو نام پوچھنے کا؟" ماہی نے اس کے انداز میں اسی کی بات اسے لوٹا دی تھی۔ زیاد کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"ہاں تو آپ میرا کون سا نام سننا پسند کریں گے اصلی یا نقلی؟" نچلا لب دانتوں تلے دبائے وہ شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

"نہ اصلی نہ نقلی، بلکہ پیار کا نام۔" زیاد کی ذہانت سے بھرپور گہری کالی آنکھوں میں چمک ابھری تھی۔

"ماہی!" اس کے لبوں سے بلا ارادہ پھسلا تھا اور زیاد کھل کر مسکرا دیا۔ اس لمحے نہ جانے کیوں ماہی کو لگا وہ قدم باقدم ساتھ چلتے اس شخص کے سحر سے ساری زندگی آزاد نہیں ہو پائے گی۔ بہت غیر محسوس انداز میں دونوں کے مابین اجنبیت اور غیریت کی دیوار زمین بوس ہو گئی تھی۔

"یہاں قریب ہی ایک نئی کافی شاپ کھلی ہے، چلو گی؟" وہ دوستانہ انداز میں اجازت طلب کر رہا تھا۔ ماہی اسے جواب دینے کی بجائے آگے چلنے لگی۔

ڈھلیے کے سے انداز میں بنی لکڑی کی اس شاپ میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ انہوں نے لکڑی کی اسٹائلش گول میز کے گرد رکھی چوڑی بیک والی کرسیوں کا انتخاب کیا تھا۔ زیاد نے دور سے ویٹر کو وکٹری کا نشان بنا کر دو کافی لانے کا آرڈر کیا۔

"آپ کو پیسے کی متبادل سب سے بہترین چیز کیا لگتی ہے زیاد؟"

"سکون، خوشی اور کامیابی۔"

"اور تمہیں؟" ویٹر نے بھاپ اڑاتے کافی کے کپ ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔

"میرے پاس رشتے کے نام پر صرف ماما جی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دنیا جہان کی دولت خرچ کر دوں اور بدلے میں کوئی مجھے میری ماں، باپ، بھائی یا بہن لا دے۔" کافی کپ کے کناروں پر انگلی پھیرتی وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"رشتے ہماری جاگیر نہیں ہوتے ماہی! یہ تو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بیش بہا نعمت ہے۔ اگر مل جائے تو شکر و قدر، نہ ملے تو صبر بہترین ہے اور ویسے بھی۔۔۔" اس نے ایک گہری نگاہ ماہی کے شدت جذبات سے سرخ پڑتے چہرے پر ڈالی تھی۔

"نئے بننے والے کچھ رشتے بہت سے پرانے رشتوں کی کمی بہت آسانی سے پوری کر لیتے ہیں۔" ماہی کی جھکی پلکوں میں لرزش اتر آئی تھی۔

ایک بھرپور دن گزارنے کے بعد جب وہ بے انتہا خوش گوار موڈ کے ساتھ گھر واپس آئی تو نذیراں نے ماما جی کی گھر میں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ وہ سرمستی کی سی کیفیت میں ان کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو ملازم حسین۔" ماہی کے قدم نیم وا دروازے کے قریب آن ٹھہرے تھے۔ ماما جی کی اس کی جانب پشت تھی اور وہ اضطراری انداز میں کھڑکی پر بازو ٹکائے فون پر بری طرح کسی پر بگڑ رہے تھے۔

"کان پک گئے ہیں میرے اس ڈی ایس پی کی تکرار سنتے سنتے کون وہ الو کا پٹھا؟ اسے کہو اگر اپنی وردی اور زندگی عزیز ہے تو میرے کاموں میں ٹانگ اڑانے کی غلطی مت کرے ورنہ دونوں سے جائے گا۔" ان

کے لہجے میں عجیب سی پھنکار تھی۔
"بی بی!"
"آں۔۔۔ہاں۔" بنتو کے پکارنے پر وہ ٹھٹک کر پیچھے مڑی۔
"آپ کا فون ہے۔" غائب دماغی سے کارڈلیس اس کے ہاتھ سے لیتی وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر مڑ کر ماما جی کے کمرے کے نیم وا دروازے کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

تم تو کچھ محدود سے لمحوں میں ملے تھے ہم سے
پھر نہ جانے کیوں ہم اتنی فرصت سے تمہیں سوچتے ہیں

"بنتو! ایک ایسا شخص جو قطعی اجنبی ہو، جس کے بارے میں آپ کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔ لیکن بہت اچانک وہ آپ کی زندگی میں داخل ہو کر دل و دماغ پر یوں چھا جائے کہ اس کے سوا نہ کوئی دکھائی دے اور نہ ہی کچھ سنائی دے، تو اس کا کیا مطلب ہے؟"
بنتو اس کے بالوں میں ناریل کے تیل مساج کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں سست پڑیں دوسرے ہی لمحے وہ مسکراتے ہوئے پر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"ایسا صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کسی سے بے تحاشا محبت ہو۔"
"محبت۔" ماہی نے زیر لب دہرایا تھا اور اسے لگا اس کے منہ میں مٹھاس گھل گئی۔
"تم سچ کہہ رہی ہو بنتو؟"
"آپ کو کیا لگتا ہے بی بی؟" بنتو کو تو ویسے ہی اس کے بدلے بدلے انداز چونکا رہے تھے۔ اب تو اسے پکا یقین ہو چلا تھا۔
"میں نہیں جانتی۔ لیکن۔۔۔ مجھے زیاد کی باتیں، اس کا لہجہ، اس کے خیالات، اس کا ایک ایک انداز اچھا لگتا ہے، بہت اچھا۔ وہ بہت مختلف ہے کچھ ہے ایسا جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔"
"اس کا تو ایک ہی مطلب ہے بی بی! کہ آپ کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔" بنتو بوتل کا ڈھکن بند کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔ لیکن اس کی بازگشت دیر تک گونجتی رہی۔
"آپ کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔"
"ہاں! مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے زیر لب خود سے اعتراف کیا تو اندر کہیں ڈھیر سارے مسرتوں کے دیے ایک ساتھ جل اٹھے تھے اور ہر سو چراغاں ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"پھر مسئلہ کیا ہے ڈیڈ؟"
"تم سمجھ نہیں رہے حیدر! گردیزی کے ساتھ میری کروڑوں کی پارٹنر شپ ہے اگر اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تو وہ یہ پارٹنر شپ ختم کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرے گا۔" وہ لندن میں بیٹھے اپنے اکلوتے سپوت سے اپنی سب سے بڑی پریشانی ٹھیک طرح سے شیئر نہیں کر پا رہے تھے۔
"میں تو اس گھڑی کو کوس رہا ہوں جب اس کی نظر ماہی پر پڑی تھی۔ تب سے اس کی ایک ہی تکرار ہے کہ ماہی کو اس کے حوالے کر دوں۔ بدلے میں وہ میری ساری شرائط ماننے پر تیار ہے۔"
"سودا مہنگا نہیں ہے ڈیڈ! آئی تھنک آپ کو اس کا مطالبہ مان لینا چاہیے۔"
"کمال کرتے ہو یار! کیسے مان لوں؟ اگر وہ ماہی کی بجائے کسی اور لڑکی۔۔۔"
"آخر ہے کیا چیز یہ ماہین بی بی!" حیدر نے کوفت سے سر جھٹکا تھا۔
"وہ میری برسوں سے سنبھالی گئی پراپرٹی ہے۔ جس پر میرے بعد صرف تمہارا حق ہے۔ بہت پاپڑ بیلے ہیں میں نے اسے اپنا بنائے رکھنے میں۔ اب عین وقت پر اپنے سونے کی اینٹوں سے بنائے محل کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے مسمار کر دوں؟ نو نیور۔" انہوں نے انگلی سے پیشانی مسلی تھی۔ جو کچھ کرنا تھا اب انہیں خود ہی کرنا تھا اور بہت جلدی کرنا تھا۔ ان کی سوچ کا پنچھی دور

کہیں اڑان بھر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بہت تیز بارش کے بعد دھوپ کی پہلی کرن
اور بہت رونے کے بعد ہلکی سی ہنسی
بہت شور کے بعد سکون کا ایک پل
بہت دکھ کے بعد خوشی کا ایک لمحہ
انسان کی زندگی میں جو اہمیت رکھتا ہے۔ ویسے ہی میرے لیے تم ہو۔" محبت کا اتنا واضح اور ایسا خوب صورت اظہار! زیاد کا بھاری گمبھیر لہجہ اس کی سماعتوں میں امرت سا گھول گیا تھا۔
وہ بہت مگن انداز میں پائپ پکڑے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس نے سبز کھلے پائنچوں والے ٹراؤزر کے ساتھ سرخ رنگ کی لائننگ والی لانگ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ساتھ میں سرخ و سبز امتزاج کا نیٹ کا دوپٹا لاپروائی سے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ کیچر میں مقید بالوں کی کچھ لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ گلاب کی سی پنکھڑیوں والے لبوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔
"ہائے بے بی!" کوئی بہت اچانک اس کے عقب میں آ کر بولا۔ پانی کا پائپ اس کے ہاتھ سے چھوٹا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے مڑی تھی۔ سفاری سوٹ والے کی چھیدتی نظریں ایک بار پھر اس کی جانب اٹھی تھیں۔ ماہی بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی غیر محسوس انداز میں گردن سے لپٹا دوپٹا کھینچ کر نیچے کیا۔
"کم آن بے بی! گھبرا کیوں رہی ہو؟ ویسے بھی اب میرے اور تمہارے درمیان چند دنوں کی دوری ہے۔" اس نے اپنے اور ماہی کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ بہت آسانی سے پاٹ لیا تھا۔
"مجھ سے دور رہو۔" اس کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی تھی۔ مقابل نے گویا اس کی بات کو خوب انجوائے کیا تھا۔
"سو وُاِرلنگ۔۔۔" ماہی کو لگا کسی نے اس کے رخسار پر جلتا کوئلہ رکھ دیا ہو۔
"چٹاخ!" اس کا ہاتھ اٹھا اور پوری شدت سے سامنے والے کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ وہ پلٹی اور بے تحاشا بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب رخ کیا تھا۔ ماما جی، نذیراں، مالی بابا، بنتو سب اس وقت ذہن سے محو ہوئے اسے صرف ایک ہی شخص کا خیال آیا تھا۔
"ہیلو زیاد۔"
"وہ ماما جی کے کوئی کاروباری دوست ہیں۔ ایک بار پہلے بھی میں انہیں اپنے گھر دیکھ چکی ہوں۔ ساتھ میں کوئی اور آدمی بھی تھے۔ دونوں شکل سے ہی بہت بڑے کرمنل لگتے ہیں۔ اس دن بھی انہوں نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور آج بھی۔ اس نے ایسا کیوں کہا کہ میرے اور اس کے درمیان بس چند دنوں کی دوری ہے۔" زیاد اپنی مخصوص ریوالونگ چیئر پر آنکھیں موندے جھول رہا تھا۔ ماہی کے بے ربط ٹوٹے پھوٹے جملے اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی مانند برس رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کی گردن کی نسیں ابھر رہی تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے چیئر روکی، موبائل اٹھایا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔

☆ ☆ ☆

ماما نے بہت آسانی سے اپنے منصوبے اور گردیزی کے مطالبے میں ردوبدل کر دیا تھا۔ گنتی کے چند دنوں کے لیے ماہی کو اس کے حوالے کر کے وہ اس سے اپنی تمام شرائط منوانے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔
اس منصوبے کو "حادثے" کا رنگ دینے کے لیے یہ بات صرف اپنے اور گردیزی کے درمیان رکھنا اہم پوائنٹ تھا۔ تاکہ گردیزی کی خواہش اور اس کی شرائط پوری ہونے کے بعد جب ماہی واپس آئے تو اس حادثے پر اس کے سر پر ہاتھ رکھنے والے اس کے ماما جی ہی ہوں۔ سب کچھ پرفیکٹ تھا۔ کہیں کوئی جھول، کوئی چوک نہیں تھی لیکن گردیزی کی بے صبر طبیعت نے وہ کچھ کر دیا تھا جو اس منصوبے میں کہیں شامل

نہیں تھا۔

اس کے رخسار پر ماہی کی انگلیوں کے نشان ابھی تک واضح نظر آرہے تھے۔ چہرے پر بلا کی خشونت اور آنکھوں میں شعلے کی سی لپک۔ "تو پھر ڈن! پرسوں رات دس بجے ماہی تمہارے پاس ہوگی اور ٹھیک سات دن بعد تم اسے میرے حوالے کروگے؟" گردیزی کے سائن شدہ کاغذات کا پلندہ سمیٹتے ہوئے انہوں نے حتمی لہجہ اختیار کیا تھا۔

"پرسوں تک کا انتظار نہیں کرسکتا میں۔ کل رات دس بجے مجھے وہ لڑکی چاہیے ڈیٹس فائنل۔"

☼ ☼ ☼

"زیاد کو پڈنگ پسند ہے تو میں سب سے پہلے پڈنگ بنانا ہی سیکھوں گی۔" وہ آستین فولڈ کرکے بالوں کو کیچر میں قید کرتی کچن میں چلی آئی تھی۔ خانساماں اسے اندر آتا دیکھ کر جی بھر کے حیران ہوا تھا۔

"کچھ خاص کھانے کا موڈ ہو رہا ہے بٹیا؟"

"کھانے کا نہیں بنانے کا' مجھے پڈنگ بنانی ہے بابا۔ کیا آپ مجھے گائیڈ کریں گے پلیز۔" وہ کیبنٹ کھول کر سامان کا جائزہ لینے لگی۔

"آپ کیوں زحمت کرتی ہو بٹیا! ہمیں حکم کردیا ہوتا۔"

"ارے نہیں۔ مجھے خود اپنے ہاتھوں سے ہی بنانی ہے۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے مسکراتے ہوئے اپنی بات پر زور دیا تھا۔ خانساماں مودب انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بہت دل لگا کر پڈنگ بنانے لگی اور ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ نذیراں نے فاریہ لوگوں کی آمد کی اطلاع اسے پہنچائی۔

"تم سب اس وقت؟ کتنا اچھا سرپرائز ہے۔" وہ بے انتہائی خوش ہوئی تھی۔

"پکچر دیکھنے جارہے ہیں تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہری اپ۔" افشین بیگ میز پر اچھالتی سائرہ کے ساتھ صوفے میں دھنس گئی جبکہ فاریہ پنجرے میں مقید آسٹریلین توتوں کے جوڑے کو دیکھنے لگی۔

"لیکن ماما جی سے اجازت۔۔۔"

"اوہ نو! ناٹ اگین!" تینوں بیک وقت بولی تھیں۔

"یار! بات تو سنو۔۔۔"

"ماما جی کے سوا اگر کسی اور کو اطلاع دینا ضروری ہے تو دے دو۔ ہم ٹھیک پانچ منٹ بعد نکل رہے ہیں۔" وہ اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھیں۔

"زیاد!" اس کے تصور میں اس بار بھی صرف اسی کا سراپا در آیا تھا۔ اس نے اس وقت ڈارک پنک ٹراؤزر کے ساتھ لائٹ پنک ٹخنوں کو چھوتی ہلکی کڑھائی والی قمیص پہن رکھی تھی۔

بنتو کو چند ایک ہدایات دینے کے بعد بالوں کو کیچر کی قید سے آزاد کرتی موبائل لیے ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔ فاریہ اور وہ فرنٹ سیٹ پر جبکہ پچھلی سیٹ پر سائرہ اور افشین بیٹھ گئی تھیں۔ چاروں نے حسب عادت کار میں ہی خوب غل غپاڑہ مچانا شروع کردیا تھا۔ ماہی بہت غیر محسوس انداز میں ان کی باتوں سے کٹ کر اپنے اسمارٹ موبائل میں پوری طرح گم ہو چکی تھی۔ اس کی انگلیاں کھٹا کھٹ زیاد سے میسجنگ میں مصروف تھیں۔

"میں نے ماما جی کو اس خبیث کے بارے میں سب بتادیا تھا مع تھپڑ کے۔" زیاد نے الماری کی کھینچی دراز کو پوری قوت سے دھکیل کر بند کیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے ماما جی اب اسی سے ملنے گئے ہیں۔ خوب طبیعت صاف کرکے آئیں گے وہ اس کی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ اب ٹیبل پر بکھری اپنی چیزیں تیزی سے سمیٹ رہا تھا۔

"ماما جی نے اس سے فون پر بات کی تھی میں جانتی ہوں۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے فاریہ نے افشین کی کسی بات پر زور کا قہقہہ لگایا لمحہ بھر کے لیے اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔

"ابھی کیا کہا ہے افشی نے؟" اس نے غائب دماغی سے فاریہ سے پوچھا تھا اور بنا اس کا جواب سنے پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جہاں زیاد کے دو پیغام بڑی بے صبری سے اس کے جواب کے منتظر تھے۔

"کہاں ملیں گے تمہارے ماما جی اس سے؟"

"میں نہیں جانتی بس اتنا پتا ہے کہ وہ اس گھٹیا آدمی کو آج زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرے ماما جی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں زیاد! وہ میری خاطر اس سے کیے گئے اپنے تمام معاہدے توڑنے میں ذرا دیر نہیں کریں گے۔"

"معاہدے! کیسے معاہدے؟" وہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ آخری دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگنے کے بعد تقریباً" بھاگتے ہوئے پارکنگ ایریا عبور کیا تھا۔

"ہوں گے کوئی کاروباری معاہدے! مجھے یقین ہے ماما جی آج میری وجہ سے اس کی پارٹنر شپ پر لات مار کے آئیں گے۔ ویسے بھی اس نے پچھلے کچھ دنوں سے ماما جی کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔ مجھے سب پتا ہے کیونکہ میں اتنی معصوم ہوں نہیں جتنی نظر آتی ہوں سیاں۔۔۔" آخری بات اس نے یوں ہی ازراہ مذاق لکھ دی تھی اور خود ہی اس سے لطف لیا تھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کرنے کے بعد اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی تھی۔

"میں اپنی دوستوں کے ساتھ پکچر دیکھنے جارہی ہوں اگر آپ اس وقت شہر سے باہر نہ جارہے ہوتے تو میں زبردستی آپ کو اپنے ساتھ لے کر آتی۔" اس کی دھونس میں ڈھیر سارا مان تھا۔ اگلے کئی ثانیوں تک اسکرین تاریکی میں ڈوبی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ یہ اس کا زیاد کے نام آخری میسج ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ چاروں چپس کترتی پوری طرح پکچر دیکھنے میں منہمک تھیں۔ فاریہ کے سیل پر یوسف کی کال آنے لگی تو چاروں طرف سے "اونہوں" کی ناگوار آوازیں سنائی دیں۔ اس نے بوکھلاہٹ میں گنگناتا موبائل سائلنٹ پر لگانے کی بجائے کال کاٹ دی۔ دوسری طرف سے فوراً" اس کا میسج موصول ہوا۔

"تمہارے ساتھ اس وقت یقیناً" ماہین بی بی تشریف فرما ہوں گی۔ ایسے میں ہم غریبوں کی دال کہاں گلے گی بھلا؟" فاریہ نے موبائل ماہی کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔

"اف! یوسف بھائی کی نظر میں اتنا خراب امیج اور وہ بھی میرا۔" ماہی نے مصنوعی صدمے سے ان تینوں کو گھورا۔ فاریہ کے ہاتھ سے موبائل جھپٹا اور کھٹا کھٹ میسج لکھنے لگی۔

"یوسف بھائی! یہ سب آپ کی اپنی انتہائی غیر رومانٹک منگیتر کا کیا دھرا ہے جس کا الزام وہ مجھ غریب پر تھوپ رہی ہے۔ آپ اسے کال کریں یا میسج میری بلا سے' بلکہ اگر آپ کہیں تو میں اسے سدھارنے میں آپ کی بہترین معاون ثابت ہوسکتی ہوں۔ پھر کیا خیال ہے؟" اس کا بھیجا میسج پڑھتے ہوئے فاریہ نے اس پر مکا تانا تھا۔ اس نے حساب برابر کرنے والے انداز میں کندھے اچکادیے۔

"مس! اس طرف آپ کی کوئی نگہت آنٹی آپ کو بلا رہی ہیں۔ شاید کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے۔" ماہی نے حیران ہو کر اپنی طرف جھکے نوعمر لڑکے کو دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"نگہت آنٹی۔۔۔! جی نہیں میری کوئی نگہت آنٹی نہیں ہیں۔ آپ کو یقیناً" کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ تینوں اب موبائل پر جھکی یوسف کا جوابی میسج پڑھ رہی تھیں۔

"آپ کا نام ماہین خان ہے؟"

"ہاں!"

"پھر انہوں نے آپ ہی کا کہا ہے۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پلیز جلدی چلیں۔" ماہی نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا فطری تجسس نے اس کے ساتھ جانے پر اکسایا۔

"سنو! میں ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں۔" وہ ساتھ بیٹھی فاریہ کا کندھا ہلا کر آہستگی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے اوکے!" موصوفہ پوری طرح منگیتر کے

پیغامات میں غرق تھیں۔ جبکہ وہ دونوں پکچر دیکھنے میں۔ سو کسی نے بھی اس کے وہاں سے اٹھ کر جانے کو خاص اہمیت نہ دی۔

☼ ☼ ☼

"ادھر آجائیں" وہ اس لڑکے کی معیت میں آگے سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔

یہ سینما کی شاید بیک سائیڈ تھی۔ جہاں اس وقت ناکافی روشنی تھی اور مدھم روشنی میں پارک کیے گئے موٹر سائیکلز' اوندھی سیدھی پڑی کرسیاں اور چند ایک غیر ضروری اشیا کی ہیئت عجیب مضحکہ خیز نظر آرہی تھی۔

اپنے لباس اور سینڈلز کی وجہ سے ماہی کو چیزیں پھلانگ کر چلنے میں دشواری ہورہی تھی۔ اور وہ حقیقت میں پچھتا رہی تھی کہ کیوں اس بے وقوف سے لڑکے کی باتوں میں آکر وہ یہاں چلی آئی۔

"بھاڑ میں گئیں نگہت آنٹی۔" اس کا پاؤں بری طرح کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ بمشکل گرتے گرتے بچی۔

وہ اس لڑکے اور نگہت آنٹی پر چار حرف بھیج کر واپس پلٹنے کا ارادہ کررہی تھی کہ عقب سے کسی نے آکر اس کے منہ پر یوں سختی سے ہاتھ جمایا کہ اسے لگا وہ اب کبھی دوبارہ سانس نہیں لے سکے گی۔ وہ ایک ہاتھ اس کے منہ پر جمائے دوسرے سے اس پر گرفت مضبوط کرتا نامعلوم سمت گھسیٹنے لگا۔ ماہی کو لگا شاید یہی اس کا آخری وقت ہے۔

☼ ☼ ☼

"ہوں... تو سب کچھ پلاننگ کے عین مطابق ہوا۔" ماما جی نے مطمئن انداز میں صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں۔ حسب عادت اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پیشانی پر مسلتے وہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کررہا تھا۔

چند دنوں کے بعد حیدر پاکستان واپس آرہا تھا۔ حیدر اکرام! اس کا اکلوتا لاڈلا بیٹا عرصہ دراز سے پڑھائی کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھا۔ جس پر اس نے پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا اور بے تحاشا آزادی دی تھی۔ وہ شروع ہی سے ماہی کی شادی حیدر سے کرنے کا خواہاں تھا۔ اس خواہش کے پیچھے بے شمار وجوہات تھیں اور ہر وجہ پہلی سے بڑھ کر ٹھوس تھی۔ لیکن گردیزی کے اس معاہدے کی وجہ سے اسے جو کچھ کرنا پڑا وہ بہرحال اس کی پلاننگ میں شامل نہیں تھا اور اب وہ چند دنوں کی "برتی ہوئی عورت" کو اپنے بیٹے کے سر پر مسلط کرنے کے بعد اسے کھلے دل سے اپنی پسند کی دوسری شادی کرنے کی اجازت دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ شاید کسی بلی نے کوئی گلدان وغیرہ گرادیا تھا۔ اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نظر ایک بار پھر میز پر پھیلے کاغذات پر بھٹکی تھی۔ "گردیزی لاکھ کمینہ سہی پر اپنا کہا ضرور پورا کرتا ہے۔" اس نے گردیزی کی خوبی کو دل ہی دل میں سراہا اور یوں ہی صوفے پر آڑے ترچھے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل اٹھایا اور گردیزی کا نمبر ملانے لگا۔

"آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الوقت کوئی جواب موصول نہیں ہورہا۔" دو' تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے موبائل دوسرے صوفے پر اچھال دیا تھا۔

"اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد الو کا پٹھا یوں ہی غائب ہوجاتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"فاریہ! ماہی کہاں ہے؟" بمشکل پانچ' چھ منٹ گزرے ہوں گے جب سائرہ اور افشین کو ماہی کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ موبائل پر جھکی فاریہ نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا۔

"ماہی...؟" اس نے قدرے ناسمجھی سے اپنی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتی سائرہ کو تکا تھا۔

"ہاں... وہ ماہی تو ابھی کچھ دیر پہلے... اوہ نو۔" اس نے سراسیمگی کے عالم میں اپنے دائیں بائیں اور عقب میں گردن موڑ کر دیکھا تھا۔

"فون کرو اسے۔" سائرہ کے کہنے پر اس نے جلدی سے ماہی کا نمبر ملایا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گود میں رکھا ماہی کا موبائل تھرکنے لگا۔

"اوہ!" وہ جاتے جاتے اپنا موبائل اس کی گود میں ڈال کر گئی تھی۔ اس کا پنک بڑا سا اسٹائلش بیگ ابھی تک اس کی سیٹ پر پڑا تھا۔

"کوئی لڑکا نگہت آنٹی کا پیغام لے کر آیا تھا اس کے پاس۔ نگہت آنٹی! اوہ مائی گاڈ۔" اسے ایک دم شدید قسم کی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

"چلو!" وہ تینوں تیزی سے اٹھ کر باہر آگئیں۔

"کس طرف گئی تھی وہ؟ تم نے دیکھا تھا؟"

"میں نے صرف اسے ہال سے اٹھ کر جاتے دیکھا تھا میں بھی..." حلق میں اٹکے آنسوؤں کے گولے نے فاریہ کو بات پوری نہیں کرنے دی۔ وہ نیم تاریکی میں پاگلوں کی طرح اسے تلاش کررہی تھیں۔ جس کا کوئی نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔

"بنٹو کو کال کرو۔" فاریہ نے ماہی کے موبائل سے اس کے گھر والے کارڈلیس پر کال ملائی تھی' جو بنٹو کے پاس ہوتا تھا۔

"بیلو بی بی! بہت دیر نہیں کردی آپ لوگوں نے؟ آپ کے جانے کے فوراً" بعد بڑے صاحب کا فون آگیا تھا۔ میں نے انہیں آپ کے جانے کا بتادیا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے گھر پہنچے ہیں۔ آپ کب تک آئیں گی؟" فاریہ نے بنا کچھ کہے بے جان ہاتھوں سے لائن کاٹ دی تھی۔

"یوسف... یوسف بھائی کا نمبر ملاؤ۔" افشین کے کہنے پر وہ کانپتے ہاتھوں سے یوسف کا نمبر ملانے لگی۔ چار فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی زرد بلب کے عین نیچے کرسی رکھے ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بھائی صاحب! آپ نے یہاں کسی لڑکی کو جاتے دیکھا ہے؟ گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے' ساتھ میں ہم رنگ جوتے... اور... اور کھلے بال... بہت پیاری لڑکی۔" شدید گھبراہٹ میں بے ربط الٹے سیدھے فقرے افشین کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

"لڑکیاں تو جی ساری پیاری ہوتی ہیں۔" مقابل نے گویا خوب لطف لیا تھا۔

"تو اس میں دانت نکالنے والی کون سی بات ہے؟ فضول انسان۔" سائرہ نے دانت کچکچاتے ہوئے افشی کا ہاتھ کھینچا تھا۔ فاریہ یوسف سے بات کرنے کے بعد ہاتھ کی پشت سے گیلے رخسار صاف کرتی رندھی آواز میں بولی۔

"وہ آرہا ہے جب تک ہم بیک سائیڈ پر دیکھیں؟" وہ دونوں بنا کچھ کہے اس کے ساتھ چلنے لگیں۔

"ماہی! پلیز کہیں سے آجاؤ۔" فاریہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

افشین کا ہاتھ تھامے سائرہ کی نظر تھوڑے سے فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی پلاسٹک کی کرسی کے نیچے چمکتی کسی چیز پر پڑی تھی۔ اس نے آہستگی سے افشین کا ہاتھ چھوڑا دو قدم چل کر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا۔ ماہی کا گلابی رنگ کا ٹوٹا ہوا بریسلٹ جس میں بے تحاشا چمکتے سفید موتی پروئے ہوئے تھے۔ اس سے جو مطلب نکلا اس نے ان تینوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا کردیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"آخر میں کہتا ہوں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا میری بھانجی کو؟ ایک بار مجھے پتا چل جائے جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے اسے ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ وہ نہ جی پائے گا' نہ مر پائے گا۔" کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے اضطراری انداز میں ادھر سے ادھر ٹہلتا غصے سے کف اڑا رہا تھا۔

"میری بھانجی! میری متاع حیات! جسے میں نے کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا۔ نہ جانے اس وقت کس حالت میں ہوگی۔" شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ تمام ملازمین سر جھکائے مودب کھڑے تھے۔ قریب ہی صوفوں پر فاریہ' سائرہ اور افشین افسردہ بیٹھی تھیں۔ جبکہ سینے پر بازو باندھے یوسف کی پرسوچ نظریں کارنر ٹیبل پر پڑے کرسٹل گلدان پر بھٹک رہی تھیں۔ اس کا ذہن

اس تمام معمے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میں یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے آرام سے نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی بیٹھوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنا تمام اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑے اور کچھ بھی کرنا پڑ جائے۔ میرا خود سے وعدہ ہے۔ وہ ایک بار پھر ہم سب کے درمیان ہوگی۔"

"اگر خدا نے چاہا تو۔۔۔" خانساماں نے زیر لب کہا تھا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ بس دعا کریں، وہ جہاں ہو، ساتھ خیریت کے ہو۔" انہوں نے باری باری ان تینوں کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"انکل! ماہی کے بارے میں کوئی بھی اطلاع ملے تو پلیز ہمیں ضرور مطلع کیجیے گا۔" یوسف نے ان سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ ماما جی نے حوصلہ دلاتی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا۔

"اور آپ سب میری بات غور سے سنو۔" وہ ملازمین کی لمبی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔

"اس حادثے کی خبر اس چار دیواری سے باہر نہیں جائے گی اور نہ ہی آپ لوگوں کو اس ایشو پر آپس میں تبادلہ خیال کرنے کی ضرورت ہے۔ ازاٹ کلیئر؟"

"جی سر!" سب بیک زبان بولے تھے۔

"ہوں تم لوگ جا سکتے ہو۔" حکم ملتے ہی قطار ٹوٹ گئی۔

سیٹھ اکرام کی اپنے اندر چھپے کامیاب اداکار سے آج ملاقات ہوئی تھی۔ اسے اس شاندار ایکٹنگ پر صرف ایک ہی شخص داد دے سکتا ہے گردیزی۔ جس سے رابطہ کرنے میں وہ ایک بار پھر ناکام رہا تھا۔ وہ ـــــ انتظار کرو اور دیکھو قسم کے تاثرات چہرے پر سجائے اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا جہاں ایک اور بری خبر اس کی منتظر تھی۔

✡ ✡ ✡

"عبدالروف! میری بات سمجھ گئے نا بیٹا؟" اس نے لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے ساتھ کھڑے نوخیز لڑکے سے پوچھا۔

"جی لالہ! سب کچھ آپ کی توقع کے عین مطابق ہوگا۔"

"بہت ہوشیاری سے یہ معاملہ ہینڈل کرنا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سب کیے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہے۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں لالہ!"

"دوسری کڑی سے تیسری کڑی کو ملانے کے لیے ہمیں بہت مہارت سے اس کے منہ سے وہ سب اگلوانا ہوگا جو ہمارا آگے کا کام مزید آسان کر دے۔" لفٹ رک گئی تھی، دونوں نے ایک ساتھ قدم باہر رکھا تھا ـــــ پندرہ منٹ ناک کی سیدھ میں چلتے رہنے کے بعد وہ دائیں جانب مڑے اور ایک عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"سب سنبھال لوگے نا؟" اس نے آواز تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ایک چھوٹا سا پرزہ بہت مہارت سے اس کے موبائل میں فٹ کرنے کے بعد موبائل اس کی جانب بڑھایا۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا لالہ!" نوخیز لڑکے نے موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی اسکرین پر آہستگی سے انگوٹھا پھیرا اور مڑ کر دائیں جانب بنے کمروں میں سے ایک میں چلا گیا۔

اس کی نظروں نے دروازہ بند ہونے تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ پھر اپنی رسٹ واچ پر نظریں جماتا انتہائی مضبوط قدموں سے چلتا بائیں جانب لائن میں بنے کمروں میں سے ایک میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں موجود واحد ذی نفس نے اس کے قدموں کی دھمک پر سر اوپر اٹھایا تھا، لیکن وہ آنے والے کو دیکھنے سے قاصر تھا۔

✡ ✡ ✡

اس کے دو خاص آدمی اسلحے اور دیگر "سامان" کے ساتھ پکڑے گئے تھے اس سے وفاداری کا عہد کرنے والے۔۔۔ نے محض تین گھنٹوں کے جسمانی ریمانڈ پر اس کے خلاف بہت کچھ اگل دیا تھا۔ مصیبت کبھی اکیلے نہیں آتی۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کے بعد اسے اور کون سی بری خبر سننے کو ملنے والی ہے؟ وہ کسی بپھرے شیر کی مانند نرم قالین کو اپنے پیروں تلے روندتا مسلسل ایک ہی نہج پر سوچ رہا تھا۔ "کس نے کی ہے مخبری؟" اس کے علاوہ اگر کوئی دوسرا مال سپلائی کرنے والے راز سے واقف تھا تو وہ گردیزی تھا۔

"تو کیا یہ سب گردیزی نے۔۔۔؟"

آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت۔۔۔ اس نے پوری قوت سے موبائل سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔

✡ ✡ ✡

گردیزی کا ذہن اس وقت کسی سلیٹ کی مانند صاف تھا۔ جس پر کسی قسم کی کوئی بھی تحریر ابھرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس وقت اگر اس کی کوئی حس کام کر رہی تھی تو وہ تھی حس سماعت! اس کا پورا وجود مضبوط رسیوں سے کرسی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ اسے لگتا وہ آئندہ شاید اس کالے رنگ کے سوا زندگی کا کوئی اور رنگ نہیں دیکھ پائے گا۔

کمرے کے اندر کسی نے قدم رکھا تھا۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین! وہ آنے والے کے قدم گننے لگا۔ ساتواں قدم کہیں اس کے آس پاس ہی رکا تھا پھر وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔

"اپنے ذہن میں کلبلاتے سوالوں میں سے پہلے کے زبان دینا چاہو گے؟" آنے والے نے پوچھا تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ ایک بات اور، یا تو کام کیا جاتا ہے یا کروا لیا جاتا ہے اور ہمیں یہ سب کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔" مقابل نے گہری لجاجت سے بھرپور نگاہیں گردیزی کے چہرے پر جما دیں۔

"کس نے کہا ہے؟" گردیزی نے ایک لمحہ کا توقف کیے بنا سوال داغا تھا۔

"تم بتاؤ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی صریح دشمن یا دوست نما دشمن!" جس قسم کے کاروبار میں وہ ملوث تھا وہاں نہ تو دوستیاں منظر عام پر لائی جاتی تھیں اور نہ ہی دشمنیاں، مخالف کو جب بھی موقع ملتا تاک کر وار کر ڈالتا۔ گردیزی کے ذہن کی صاف سلیٹ پر ایک ساتھ کئی تحریریں ابھری تھیں۔

سب کچھ اس کی سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق ہی تو ہو رہا تھا۔ وہ سرمستی کے عالم میں ڈولتے قدموں کے ساتھ اپنے بیچ والے بنگلے پر اس پری کا منتظر تھا جسے پہلی نظر دیکھتے ہی وہ خود پر قابو کھو بیٹھا تھا۔ گھڑیال نے دس بجنے کا شور مچایا تو اس کا دل کسی اور لے پر دھڑکنے لگا۔ وہ اسے "وارم ویلکم" کرنے کے لیے خود چل کر دروازے تک آیا تھا۔ اس نے دانستہ تمام ملازمین کی ڈیوٹیاں تبدیل کر کے یہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔

وہ ایک ایک کر کے پیسج کی سیڑھیاں اتر رہا تھا جب کسی نے اچانک اسے عقب سے دبوچ لیا یہ افتاد اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ خود کو سنبھال نہیں پایا تھا یا شاید مقابل نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اس وقت اس کی یہاں موجودگی سے صرف ایک ہی شخص واقف تھا۔

سیٹھ اکرام!

"تو کیا یہ سب۔۔۔؟" اس کے تنے عضلات مزید کشیدہ ہو گئے۔ بند مٹھی کو ہونٹوں پر رکھے وہ بہت گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کے تاثرات ملاحظہ کر رہا تھا۔ اسی وقت میز پر پڑا گردیزی کا موبائل اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔

"سیٹھ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس نے کال ریسیو کر کے لاؤڈ اسپیکر کا بٹن دبایا اور موبائل گردیزی کے کان سے لگا لیا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو گردیزی؟" گردیزی کے جبڑے بھینچ گئے تھے۔

"مجھے اس حالت میں پہنچا کر تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے؟" دوسری طرف سے زوردار قہقہہ لگایا گیا۔ گردیزی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

"بہت بڑا گدھا ہوں میں جو پہلی بار "پوری طرح" صرف تم پر اعتبار کر بیٹھا۔"

"اونہوں! گدھے اتنے ذہین نہیں ہوتے۔"

"کیوں کیا تم نے ایسا؟" اسے فوری طور پر صرف اسی ایک سوال کا جواب درکار تھا۔

"دھوکہ! کوئی مجھے دھوکہ دے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا اور تم نے مجھ سے ہاتھ کرنے کی کوشش کی۔ مجھ سے؟"

"کیا دھوکہ دیا ہے میں نے تمہیں؟"

"اتنے بھولے کیوں بن رہے ہو؟ خود سے پوچھو گردیزی! تمہیں آج اپنے اس حال میں پہنچ جانے کی ساری وجہ سمجھ میں آجائے گی۔"

"میں نہیں جانتا تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ ہاں البتہ یہ بتا دوں احمد آباد والی فیکٹری میں مال سپلائی کرنے سے میں نے تمہارے آدمیوں کو روک دیا تھا کیونکہ مجھے وہاں پولیس کا چھاپہ پڑنے کی خبر مل چکی تھی۔ اور راجا حامدی کے ساتھ ہونے والی ہماری ڈیل کے کاغذات میں نے تمہارے حوالے کرنے کی بجائے جلدی میں اپنے لاکر میں رکھ دیے تھے۔ وہ اس ماہ کی چوبیس کو "آکاش" والے بیسمنٹ میں نیا سامان رکھوانے کے معاہدے پر دستخط کر چکا ہے اور۔۔۔ اور تمہارے علم میں لائے بغیر "نایاب پارلر" کی روبی کو میں نے اس لیے منظر سے غائب کر دیا تھا کہ اس نے ہمارے خلاف کچھ ثبوت کسی سیکرٹ ایجنٹ کے ہاتھ فروخت کیے تھے۔ اس لیے مجھے فوری طور پر اپنا کام رکوا کر پارلر میں پارلر والا کام کروانا پڑ گیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم دونوں کا برابر کا نقصان ہوا ہے۔ پھر مجھے سمجھ میں نہیں آرہی اس سب میں دھوکہ کہاں سے آگیا؟"

گردیزی کی آواز پھٹی پڑ رہی تھی۔ بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ پورا زور لگا کر رسیوں میں بندھے اپنے ہاتھ پاؤں چھڑوانے کی لاحاصل سعی بھی کر رہا تھا۔

ساتھ کھڑے خوبرو جوان نے بہت اطمینان سے موبائل اس کے کان سے ہٹا کر آف کر دیا۔

"جب تک سیٹھ کو تمہاری وفاداری کا یقین نہیں آتا تب تک تم ہماری مہمان نوازی سے لطف اٹھاؤ۔" موبائل جینز کی جیب میں گھساتے وہ فاتحانہ قدموں سے چلتا باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت دائیں جانب بنے کمروں کی قطار میں سے وہ نوخیز لڑکا باہر نکلا۔ دونوں آہستہ آواز میں بات کرتے آگے بڑھ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہلکے سے کھٹکے پر ماہی نے گھٹنوں پر رکھا سر اوپر اٹھایا تھا۔ پورے کمرے میں زیرو پاور کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اندر آنے والے نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر ایک ساتھ کئی بٹن گرائے تھے۔ پل بھر میں کمرہ دودھیا روشنی سے بھر گیا۔ اس نے آہستگی سے گردن موڑ کر سامنے دیکھا تھا۔

براؤن شلوار قمیص پر جیکٹ پہنے لمبا چوڑا مرد جسے وہ پچھلے تین دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے بیڈ کے ساتھ پڑی چھوٹی سی میز پر کھانے کی ٹرے رکھ دی۔ ماہی نے محض ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر رخ پھیر لیا۔ میز پر دن کو لائے گئے کھانے کی ٹرے جوں کی توں پڑی تھی۔ ماہی نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

"کھانا کیوں نہیں کھایا آپ نے؟" اس نے باسی کھانے کی ٹرے اٹھالی تھی۔

"مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" ماہی نے اس کی بات نظرانداز کر کے ایک بار پھر وہی مدعا دہرایا تھا جو وہ پچھلے تین دنوں سے دہرا رہی تھی۔

"آپ کا زیادہ دیر تک بھوکا رہنا ٹھیک نہیں پہلے کھانا کھالیں۔" وہ بیڈ سے قدرے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے دو اسٹولوں کو ملا کر ایک میز کی شکل دے دی تھی اور اب وہ اس پر اپنی بندوق رکھے اس سے چھیڑخانی کر رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" ماہی نے اپنی بات پر زور دیا تھا۔

"آپ کیوں بار بار ایک ہی بات کی تکرار کرتی ہیں؟ کوئی تکلیف نہیں ہوگی آپ کو یہاں۔ آرام سے رہیں اور کھانا کھالیں اب۔" وہ نظریں اٹھائے بغیر اپنے کام میں مگن بولا تھا۔

"تمہیں سنائی نہیں دے رہا میں کہہ رہی ہوں مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" ماہی بیڈ سے اتر کر پوری قوت سے چلائی تھی۔

"آپ کھانا۔۔۔" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ماہی نے ٹرے اٹھا کر سامنے دیوار پر دے ماری تھی۔ سالن کے کچھ چھینٹے اس آدمی پر بھی پڑے تھے وہ فوراً اٹھا۔

"دیکھیں بی بی! غصہ مت دلائیں۔ آپ یہاں میری مرضی سے نہیں لائی گئیں اور نہ ہی میری مرضی سے جائیں گی۔ ہمیں اوپر سے آرڈر ملا ہے۔" وہ کپڑے جھاڑتا تیز لہجے میں بولا۔ ماہی منہ پر ہاتھ رکھے رونے لگی۔ وہ کچھ دیر بے بس نظروں سے اسے روتا دیکھتا رہا پھر دو چار قدم اٹھا کر اس کے قریب آکر ٹھہر گیا۔

"دیکھیں! آپ کو جس کسی نے بھی اغوا کیا ہے اس کا مقصد آپ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔"

"اور کس طرح پہنچاتے ہیں نقصان؟" ماہی چلائی تھی۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔" اس کے عجیب سے لہجے پر ماہی ٹھٹکی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ لاشعوری طور پر وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"آپ کو یہاں لانے والے کا مقصد آپ کو نہیں بلکہ آپ سے وابستہ کسی گہرے رشتے کو زک پہنچانا ہے۔"

"ماما جی کو؟" بلاارادہ اس کے منہ سے پھسلا تھا۔

"میں نہیں جانتا، بس یہ بتا دوں اس طرح شور مچانے اور ہنگامہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، جب اس کا مقصد پورا ہوگا وہ خود ہی آپ کو چھوڑ دے گا۔ چاہے ایک دن بعد۔۔۔" ماہی کی آنکھوں میں مسرت بھری بے یقینی پھیلی تھی۔

"چاہے ایک سال بعد۔۔۔" مسرت کے ٹمٹماتے دیوں کو کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا تھا۔

"کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟" اس نے سر اوپر اٹھایا تھا۔

"آپ کی مدد! یعنی اپنے کام سے غداری۔ نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر قدرے جھک کر زمین پر گرے برتن اور روٹیاں اٹھانے لگا۔

"بہت لمبی رات ہے آپ کو بھوک ستائے گی میں اور کھانا لاتا ہوں۔"

"مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" ماہی ایک بار پھر چلائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے تو اب بھی یہ سب اپنے کسی بھیانک خواب کا حصہ لگ رہا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ ابھی بنتو آکر اسے جگا دے گی۔

"بی بی! صبح ہوگئی ہے اٹھ جائیں۔" وہ جاگتی آنکھوں سے اس ایک پکار کی منتظر تھی جس کے بعد پھر سے سب کچھ پہلے جیسا ہو جانا تھا، اس سے بے انتہا پیار کرنے والے ماما جی، ہر دم جان چھڑکنے پر تیار بنتو شاندار سا گھر اور سب سے بڑھ کر زیاد!

اس کے یوں غائب ہونے پر سب کتنے پریشان ہو گئے ہوں گے۔ کتنا ڈھونڈا ہوگا ان سب نے اسے اور ان میں سے کوئی بھی تو نہیں جانتا ہوگا کہ وہ اس چھوٹے سے خستہ حال مکان کے ڈربے نما کمرے میں بے یار و مددگار پڑی ان سب کے لیے کتنا تڑپ رہی ہے۔

اس کے واپس نہ آنے پر فاریہ لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ ان تین دنوں میں سینکڑوں بار یہ سب سوچ چکی تھی اور ہر بار ہی اسے اپنی بے بسی کا پہلے سے بڑھ کر احساس ہوا۔ یہی بے بسی تو اسے رلا رہی تھی۔ اس نے زندگی کا یہ روپ کب دیکھا تھا بھلا؟

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ وہ کروٹیں بدل بدل

کر تھک گئی تھی۔ آخر تنگ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"جب اس کا مقصد پورا ہو گا وہ خود ہی آپ کو چھوڑ دے گا چاہے ایک دن بعد۔۔۔" وہ دانستہ اس کی بات کے دوسرے حصے کو نظر انداز کر رہی تھی۔
"صرف ایک دن!" وہ ٹہلتے ہوئے مسلسل ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔
"ایک دن سے زیادہ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" اچانک اس کے قدم رکے تھے اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔
"وہ یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ کڈنیپر میرے کسی گہرے رشتے کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟ گہرا رشتہ! ماما جی۔۔۔ یا پھر۔۔۔ یا پھر نیاد!" اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں میں منہ چھپاتا سورج اپنا سفر تمام کر کے مغرب کی گود میں سر رکھ کر سو گیا تھا۔ دانہ دنکا چگتے پنچھیوں نے ایکدم سر اوپر اٹھایا انہیں اپنے آشیانوں میں لوٹ جانے کا اذن ملا تو سب ایک ساتھ پنکھ پھیلائے پھر سے اڑ گئے۔
شام کا رنگ کچھ اور گہرا ہوا تو گھٹنوں پر سر ٹکائے سیڑھیوں پر بیٹھی بنتو گہری سانس کھینچتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی لاپتا شہزادی کے سوئے ہوئے محل میں ایک ایک کر کے ساری بتیاں جل گئی تھیں، لیکن تاریکی پھر بھی کم نہ ہوئی اور کم ہو بھی تو کیسے۔۔۔؟ وہ ڈھیلے ڈھالے قدموں سے ایک ایک سیڑھی طے کرتی اندر کمرے میں آ گئی۔ جہاں برسوں سے سنبھالی گئی یادیں ایکدم انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔
"اففوہ! بنتو کیوں ہر وقت میرے سر پر سوار ہو جاتی ہو کتنی بار کہا ہے اگر مجھے ضرورت پڑی تو خود تمہیں آواز دے کر بلا لوں گی۔"
"بنتو! جلدی سے ادھر آؤ مجھے تمہیں ایک بات بتانی ہے۔" اسے جھڑکنے کے محض دو منٹ بعد وہ جوش سے اسے پکار رہی تھی۔
"اففوہ نیچے کیوں بیٹھ رہی ہو؟ ادھر آؤ پتا ہے نیاد کو میں کالے رنگ کے کپڑوں میں بہت اچھی لگتی ہوں تم ایسا کرو میری الماری میں کالے رنگ کے سوا باقی سارے کپڑے نکال دو۔"
بنتو کی آنکھوں کی سطح ایک بار پھر گیلی ہو رہی تھی۔ وہ ماہین سے عمر میں بڑی تھی اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب ماہین پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی تھی۔ ایک دن وہ یونہی بغیر کسی سہارے کے اٹھ کھڑی ہوئی اور ابھی ایک قدم اٹھایا ہی تھا کہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ اس نے بھاگ کر جلدی سے اس ننھی پری کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اسے وہ معصوم سی گڑیا اتنی بھائی کہ وہ بھنورے کی مانند اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی اور ماہی بھی اس سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ اگر کچھ دیر کے لیے اسے وہ مہربان مسکراہٹ والی سانولی سلونی لڑکی نظر نہ آتی تو رونا شروع کر دیتی۔
جب اماں نے اسے بتایا کہ چھوٹی بی بی کے ماں باپ کار حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو وہ رات کو ماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی کہ "ننھی چھوٹی بی بی کو اپنی ماں کے بغیر نیند کیسے آتی ہو گی؟" اس ایک سوچ نے اسے کئی راتوں تک بے کل کیے رکھا تھا۔
وقت گزرنے کے ساتھ ان میں خون کے علاوہ ایک ایک کر کے سارے رشتے یوں استوار ہوئے کہ ایک دوسرے کے بغیر رہنے کا تصور ہی سوہان روح لگتا۔
بنتو پر یہ تین دن تین صدیاں بن کر بیتے تھے۔ وہ اپنے دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

☼ ☼ ☼

"کھانا کون پکاتا ہے یہاں؟" ماہی نے ٹرے میں رکھے سالن کے ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے اپنی نگرانی پر مامور نواز سے پوچھا۔ وہ جو خاموشی سے پلٹ رہا تھا اچانک اس کی غیر متوقع بات سن کر ٹھٹک کر رکا پھر پوری طرح اس کی جانب مڑ گیا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟"
"کسی بھی قسم کے ذائقے سے خالی انتہائی بدمزا کھانا کھلاتے ہو تم۔" وہ یوں ریلیکس انداز میں بول رہی تھی گویا یہ سب کچھ اس کے معمول میں شامل ہو۔
"کیا تم مجھے سرخ مرچ لا دو گے؟"
"سرخ مرچ۔۔۔؟"
وہ دانستہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ وہ بنا کچھ کہے خاموشی سے پلٹ گیا پھر کچھ دیر بعد اسے چھوٹا سا سرخ مرچ پاؤڈر کا ڈبا لا کر دے دیا۔
"شکریہ!" اس بار وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ نواز کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھتا سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماہی نے سب سے پہلے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا جگ سے تھوڑا سا پانی گلاس میں انڈیل کر گلاس لبوں سے لگا لیا۔ پھر پانی سے آدھے بھرے جگ میں سالن الٹا، پھر مرچوں سے بھرا ڈبا بھی اس میں انڈیل دیا اور چمچے سے اس سارے ملغوبے کو ہلانے لگی۔ اسے اب دن کے بارہ بجنے کا شدت سے انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی چھٹی حس کچھ غلط اطلاع نہیں دے رہی تھی۔ مصیبت اس بار بھی اکیلے نہیں آئی تھی۔ ایک کے بعد ایک بری خبر اسے سننے کو مل رہی تھی۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا، لیکن اس بار اسے اپنے اعصاب چٹختے محسوس ہوئے تھے۔
احمد آباد والی فیکٹری پر پولیس کا اچانک چھاپہ، راجا ملدی کے گرفتار ہونے کے ساتھ "آکاش" والے بسمت کو بھی تحویل میں لے لیا گیا۔ اور پھر نایاب پارلر کی "روبی" کی دھماکہ خیز پریس کانفرنس!
یہ سب کس کی پشت پناہی پر کیا جا رہا تھا؟ اس نے ایک بار پھر گردیزی کا نمبر ملایا۔
"کہاں مر کھپ گیا یہ الو کا۔۔۔" اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر مخصوص کھٹکا ہوا تو وہ چوکس ہو گئی اور جگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ نواز اپنی دھن میں چلتا اندر آ رہا تھا کہ اس نے پوری قوت سے جگ میں بھرا ملغوبہ اس پر اچھال دیا۔ نواز کے ہاتھ میں تھامی ٹرے گر گئی تھی۔ چہرے پہ دونوں ہاتھ کیے وہ اس اچانک افتاد پر گھبرا گیا اور ماہی نے اسی موقع سے فائدہ اٹھایا۔
وہ تیر کی سی تیزی سے باہر نکلی یہ ایک مختصر سی ملحقہ عمارت تھی بیرونی دروازہ اس کی توقع کے عین مطابق لاکڈ تھا۔ اس نے متلاشی نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ وقت بہت کم تھا اور اسے اس چار دیواری سے باہر نکلنا تھا۔
اس کی نگاہ تھوڑے سے فاصلے پر رکھے ایک اسٹول پر پڑی تھی۔ اسٹول بہت وزنی تھا وہ بہت مشکل سے اسے اٹھا کر گیٹ تک لائی تھی پھر جلدی سے اوپر چڑھ کر لوہے کی ڈیزائن والی سلاخوں پر اندازے سے پاؤں رکھے اور بنا کچھ دیکھے باہر کی طرف نیچے چھلانگ لگا دی۔
اسے کہاں چوٹ لگی، کہاں درد ہوا وہ سب کچھ بھلائے سرپٹ بھاگنے لگی اور اندھا دھند بھاگتی رہی۔ یہاں تک کہ کچی پکی آبادی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ایک تانگہ آتا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھ ہلا کر اسے رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ جونہی تانگہ قریب آ کر رکا وہ تیزی سے اس پر سوار ہو گئی۔
"چلو! جلدی چلو۔۔۔" اس کا سانس بری طرح الجھ رہا تھا اور دل کی دھڑکن اس کی رفتار کا اندازہ نہیں رکھا۔
"کہاں جانا ہے مائی؟" تانگے والے نے الجھ کر اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ ماہی نے ایک نظر پیچھے سڑک پر دیکھا پھر قدرے خود کو سنبھالتے ہوئے تانگے والے کی طرف متوجہ ہوئی جو ابھی تک سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما جی۔۔۔!" وہ بھاگ کر ان کے سینے سے جا لگی

تھی۔ انہوں نے بہت حیرت سے اپنے گلے لگی پھوٹ پھوٹ کر روتی ماہی کو دیکھا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر سات دنوں کے بجائے تین دن بعد آنے والی ماہی نے انہیں سخت اچھنبے میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جو طے شدہ پلاننگ کے مطابق اس کے آنے پر "رد عمل" ظاہر کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے سب چوپٹ ہو گیا۔ ماہی کے سر پر ہاتھ پھیرتے وہ کچھ اور سوچ رہے تھے۔ خاصی دیر رونے کے بعد ماہی خود ہی ان سے الگ ہو کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

"میں نے آپ کو بہت مس کیا ماما جی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے صوفوں کی جانب بڑھ گئے۔ اگر ماہی اس وقت ان کے چہرے کو بغور دیکھتی تو اسے وہاں ٹینشن ختم ہونے کی بجائے ٹینشن شروع ہونے والے تاثرات ضرور چونکاتے۔

"ماہی۔۔۔! تم یہاں کیسے۔۔۔؟" ماہی نے ایک بار پھر ان کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ اس سے وہاں کی نہیں بلکہ یہاں پہنچنے کی بابت پوچھ رہے تھے۔ ماہی ہچکیوں کے درمیان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہیں ساری کتھا سنانے لگی۔ وہ جوں جوں بتاتی جا رہی تھی ان کا چہرہ رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

"اگر یہ گردیزی کے پاس نہیں تھی تو پھر کس نے۔۔۔ تو کیا گردیزی سچ مچ غائب ہے۔۔۔؟" ان کا وجدان جو کچھ انہیں بتا رہا تھا وہ پہلے سے بڑھ کر پریشان کن تھا۔

"ماہی! انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی۔۔۔!" ماہی کی نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔ پھر وہ انگلیاں چٹخاتی نفی میں سر ہلاتے آہستگی سے کہنے لگی۔

"نہیں۔۔۔ ماما جی! میں جیسے گئی تھی ویسے ہی واپس آئی ہوں۔ وہاں صرف ایک آدمی میری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ جو صرف کھانا وغیرہ دینے کمرے میں آتا۔ نہ نگاہ اٹھا کر دیکھتا اور نہ ہی کوئی غیر ضروری بات کرتا۔" ماما جی بغور اس کے چہرے کو تک رہے تھے۔ وہاں صرف سچ لکھا نظر آ رہا تھا۔

"ماما جی! اس نے مجھے کہا تھا کڈنیپر کا مقصد مجھے نہیں، بلکہ مجھ سے وابستہ کسی رشتے کو نقصان پہنچانا ہے۔ آپ کو یا پھر۔۔۔" روانگی میں بولتی وہ ایک دم چپ ہو گئی تھی۔

"یا پھر۔۔۔" ماما جی نے بے چینی سے پوچھا۔ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نہیں جانتی ہوں!"

"میں سب دیکھ لوں گا، تم فکر مت کرو۔" وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ماہی نے بہت حیران ہو کر ان کی پشت کو دیکھا تھا۔

"بس یہی کچھ۔۔۔" اسے ایک دم سب کچھ خالی خالی سے لگا۔ کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور رہ گئی تھی۔ اسے ماما جی آج بہت بدلے بدلے سے لگے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے اور بہت کچھ بدلنے والا ہے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یقین نہیں آ رہا ماہی! تم ہم سب کے درمیان ہو۔ میں ہاتھ بڑھاؤں تو تمہیں چھو سکتی ہوں۔" فاریہ نے مسرت سے چور لہجے میں کوئی چوتھی بار یہ بات دہرائی تھی۔ ماہی نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

وہ خود بھی تو ابھی تک بے یقین تھی۔ وہاں تھی تو لگتا وہ کوئی خواب ہے۔ اب واپس آ گئی تھی تو ڈر رہتا کہ یہ کوئی خواب نہ ہو۔ آزادی کا بے پایاں احساس تھا جو یہاں آ کر جاگا تھا۔ وہ دونوں بازو اوپر اٹھائے گول گول گھومتی اپنے سارے گھر میں اڑتی پھر رہی تھی۔

وہ بہت نفیس طبیعت کی مالک تھی۔ آئینے میں اتنے دنوں بعد اپنا حلیہ دیکھ کر فوراً" سے پیشتر باتھ روم میں گھسی تھی۔ اچھی طرح شاور لینے کے بعد سرخ سیاہ امتزاج کا نفیس کڑھائی والا سوٹ زیب تن کیا۔ نتو بہت پیار سے آہستہ آہستہ اس کے بال سنوارنے لگی۔ ہاتھ اور زبان ایک سی رفتار سے چل رہے تھے۔ اس کی محبت پر ماہی کی آنکھیں بار بار نم سی ہو جاتیں۔

اس کی آمد کی اطلاع سن کر سائرہ اور فاریہ تو تقریباً" بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔ فاریہ تو اس کے گلے لگی اونچی آواز میں رونے لگی۔ بہت دیر لگی تھی ان سب کو نارمل ہونے میں۔ ماہی نے انہیں شروع سے لے کر آخر تک ایک ایک بات بتائی تھی۔

"وہ فرشتہ صفت تھا کون جس کی آنکھوں میں تم مرچیں جھونک کر آئی ہو۔ حالانکہ تمہیں اس کے ساتھ یہ سلوک کرنا چاہیے تھا۔"

"میں خود بھی گلٹی فیل کر رہی ہوں فاری! میں نہیں جانتی میں نے وہ سب کیسے کیا۔ بس مجھے وہاں سے نکلنا تھا۔ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑتا۔"

وہ سب اس وقت بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ ماہی کا سر افشین کی ٹانگوں پر تھا۔ جنہیں وہ مسلسل ہلا رہی تھی۔

"اُفوہ! مجھے لگ رہا ہے جیسے میں کسی ٹرین میں سفر کر رہی ہوں۔" اس نے سر اٹھا کر فاریہ کی گود میں رکھ دیا۔

"اُف! اللہ کی بندی میرا موبائل بے چارہ نیچے رہ گیا۔" فاریہ نے ہڑبڑا کر اسے پرے دھکیلا تھا۔

"بی بی۔۔۔ کھانا لگ گیا ہے۔" نذیراں کی اطلاع پر وہ سب اٹھ کر کپڑے درست کرتیں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

"سنو! میرا بیگ اور موبائل۔۔۔؟" ماہی نے فاریہ سے پوچھا تھا۔

"وہ تو ہم نے انکل کو دے دیا تھا اسی دن۔"

"اچھا۔۔۔" کھانا کھاتے وقت اس کا ذہن مسلسل اپنے موبائل اور زیاد کی جانب لگا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماما جی کی طرح زیاد کا رد عمل بھی اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ وہ سینے پر بازو باندھے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا بہت خاموشی سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ماہی کو نہیں ٹوکا تھا اور وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہی تھی۔

"زیاد! آپ کو کیا لگتا ہے ان لوگوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہو گا؟"

"ان کا مقصد تمہیں نہیں بلکہ تم سے وابستہ کسی رشتے کو نقصان پہنچانا تھا۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"ابھی تم نے خود ہی تو بتایا ہے۔"

"اچھا۔۔۔؟ مجھے لگا شاید میں نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی۔" اس کا لہجہ کچھ کچھ بے یقینی لیے ہوئے تھا۔

"لیکن انہوں نے ماما جی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"تمہیں کیا معلوم؟"

"میں سب جانتی ہوں ماما جی، کچھ پریشان ضرور ہیں۔ لیکن مجھے نہیں لگتا ان کا کوئی نقصان ہوا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو میرے ساتھ پیش آئے اس حادثے پر کوئی شدید رد عمل ظاہر نہیں کیا۔"

"ہو سکتا ہے وہ سچ میں ان کا کوئی نقصان کر چکے ہوں۔" ماہی اس کی بات پہ توجہ دیے بنا بہت افسردگی سے کہہ رہی تھی۔

"میں ڈر گئی تھی زیاد! مجھے لگا کہیں وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ حالانکہ میں نے تو ابھی ماما جی کے سامنے بھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔" زیاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اچھا کیا جو نہیں بتایا۔ میں خود ہی ان سے جب ملوں گا سب کچھ بتا دوں گا۔"

"کیا؟ کیا بتائیں گے؟" ماہی نے قدرے حیران ہو کر استفسار کیا تھا۔

"یہی کہ مجھے آپ کی بھانجی سے محبت ہو گئی ہے۔ کیا آپ میری محبت میرے حوالے کریں گے؟" اس نے بوگن ویلیا کی بیل سے لٹکتے گچھوں میں سے ایک گچھا توڑ کر اس کی جانب بڑھایا تھا۔

"زیاد۔۔۔ دس از ناٹ فیئر۔۔۔ آپ کو ان خوشبو سے عاری پھولوں کی بجائے ایک مہکتا ہوا گلاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کسی اچھی سی جگہ پر یہ خوب صورت الفاظ ادا کرنے چاہیے تھے۔ آپ نہیں

جانتے میں بہت رومانٹک لڑکی ہوں اور مجھے انتہائی غیر رومانٹک انداز میں آپ کا ان ڈائریکٹ اظہار محبت بالکل پسند نہیں آیا۔" بچوں کے سے انداز میں خفگی سے بولتی وہ اسے اس دنیا کی سب سے پیاری لڑکی لگی تھی۔

"وہ کیا ہے نا ماہی ڈارلنگ! کہ مجھے پہلی بار کسی سے اس قسم کی محبت ہوئی ہے۔ تو میں اظہار محبت کے آداب سے قطعی نابلد ہوں۔ تمہاری کمپنی میں رہا تو آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤں گا۔" اس بار اس نے دماغ کی ہر تاویل رد کر کے صرف دل کی بات پر کان دھرا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ماہی اس پر خوش ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہوں... تو کوئی ہمارے ساتھ ڈبل گیم کھیل گیا۔" سیٹھ اکرام کو معاملے کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ جس طرح ماہی غیر متوقع طور پر واپس آگئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح گردیزی بھی منظر عام پر ظاہر ہو گیا تھا۔ اس پر بے تحاشا چیخنے چلانے کے بعد وہ بے دم سا ہو کر صوفے پر گر گیا۔

"دھوکا... کون سا دھوکا دیا ہے میں نے تمہیں جس کے بدلے تم نے یوں مجھے بری طرح پھنسوا دیا۔ کیا بک رہے تھے اس دن فون پر۔"

"بات سنو گردیزی! میں نے تمہیں کوئی فون نہیں کیا۔ بلکہ میرا تو کوشش کے باوجود ایک بار بھی تم سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔"

"کیا؟" گردیزی چونکا تھا۔

"میں کیسے مان لوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ حالانکہ مجھے تمہارے آدمی نے خود تمہارا فون سنوایا تھا۔"

"میرا آدمی؟ کیا واقعی تم اب بھی اصل بات سمجھے گردیزی! یا جان بوجھ کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟ تم نے اپنے موبائل پر میرا نمبر دیکھا تھا؟ نہیں... تم نے میرے آدمی کا چہرہ دیکھا تھا؟ نہیں تو پھر؟"

"اوہ شٹ..." گردیزی کو وہ سمجھ میں آگیا تھا جو وہ اسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔

"ہمارا دشمن ایک ہی ہے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے ہمارے درمیان بے اعتباری کا بیج بو کر ہماری سالوں سے کھڑی اعتبار کی فصل پر درانتی چلا دی۔" وہ دونوں ایک بار پھر متحد ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ماما جی! آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز..." دھاڑ سے دروازہ کھول کر جوش سے بولتی اندر داخل ہوئی تھی۔ لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر لمحہ بھر کو بھونچکی رہ گئی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد وہ زور سے چلائی تھی۔

"یہ گھٹیا آدمی یہاں کیا کر رہا ہے ماما جی؟ ابھی اسے نکال باہر کریں۔"

"ماہی..." ماما جی ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھے تھے۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا ماما جی! اس خبیث انسان نے اس دن میرے ساتھ..."

"ماہی... بی ہیو یور سیلف۔" ماما نے دانت پیسے تھے۔

"ماما جی... یہ..." وہ اس کی بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔

"ماہی! تم جاؤ یہاں سے۔ میں بعد میں تم سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں... پہلے اسے باہر نکالیں۔ سخت زہر لگتا ہے مجھے یہ آدمی۔" وہ بضد تھی۔

"تم آن بے بی! اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟ چلو ہم خود ہی باہر چلے جاتے ہیں۔ بس تم خوش ہو جاؤ۔" وہ عین اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑستا سخت واہیات نظروں سے اسے دیکھتا باہر نکل گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ آج اسے اس آدمی کی دست درازی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پتھرائی آنکھوں سے اس آدمی کے پیچھے باہر نکلتے ماما جی کی پشت کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے ماما جی پہلے جیسے نہیں رہے زیاد! بہت بدل گئے ہیں وہ۔"

"ہو سکتا ہے وہ ہمیشہ سے ہی ایسے ہوں اور تمہیں اب پتا چلا ہو۔" وہ اپنے ازلی لاپروا انداز میں کہہ رہا تھا۔

"نہیں، پہلے وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اب... اب اس گردیزی کی وجہ سے انہوں نے مجھے..." حلق میں اٹکے آنسوؤں کے گولے نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے زیاد! نہ جانے کیوں لگتا ہے کچھ نہ کچھ برا ہو کر رہے گا۔" وہ کافی کے مگ پر انگلیاں پھیرتی آزردگی سے کہہ رہی تھی۔

"لازمی ہے کچھ برا ہی ہو؟ اچھا بھی تو ہو سکتا ہے۔" ماہی استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"میں سوچ رہا ہوں اب تمہیں اپنے گھر مجھے انوائٹ کر ہی لینا چاہیے۔ نہیں؟"

"اوہ! رئیلی زیاد؟" پل بھر میں اس کا موڈ بدلا تھا۔

"کب... کب آؤ گے؟"

"جب تم کہو۔"

☼ ☼ ☼

خود کو تم پہ وار دیتے ہیں
چلو تمہارا صدقہ اتار دیتے ہیں

آج کا دن اس کے لیے بہت اہم تھا۔ زیاد پہلی بار اس کے گھر آ رہا تھا اور اس کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پہ نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے ٹخنوں کو چھوتے سلور گرے کلر کے نفیس فراک کے ساتھ سلور رنگ کا چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ساتھ میں ہم رنگ بڑا سا دوپٹا لیے بالوں کی چوٹی دائیں کندھے پر ڈالے وہ پورے گھر میں تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھی۔ انتہائی اپر کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے کبھی مغربی لباس نہیں پہنا تھا۔ اس کے پہناوے میں حد درجہ مشرقیت جھلکتی تھی۔

زیاد کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے اسے ماما جی کے آفس سے اسلام آباد چلے جانے کی اطلاع ملی تھی۔

"آئی ایم سوری زیاد! آپ کی آج ماما جی سے ملاقات نہیں ہو پائے گی۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں، تمہیں دیکھ لیا، سمجھو میرا آنا رائیگاں نہیں گیا۔" وہ اس کی ہمراہی میں قدم آگے بڑھاتا بہت خاص بات کہہ گیا تھا۔

بنتو سمیت گھر کے سارے ملازم ایک ایک کر کے زیاد سے ملنے لگے تھے۔

"بہت ٹرینڈ لگتے ہیں تمہارے گھر کے ملازم۔"

"آپ کو اچھا نہیں لگا ان سب کا آکر ملنا؟"

"ارے نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ بس مجھے یوں خاص طور پر کسی کی نظر میں آنا عجیب سا لگتا ہے۔" اس نے بلوریں گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

"ویسے تمہارے گھر کی لوکیشن اور انٹیریر بہت خوب صورت ہے۔" وہ یوں ہی گلاس تھامے ٹہلتا ہوا کھلی کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔

"یہاں سے کیا نظر آئے گا بھلا۔ آپ ادھر آئیں، میں آپ کو اپنا پورا گھر دکھاتی ہوں۔" وہ بچوں کے سے اشتیاق سے اس کا ہاتھ کھینچتی باہر لے آئی تھی۔

"اچھا تو گویا رعب ڈالنے کا ارادہ ہے؟"

وسیع و عریض رقبے پر بنا یہ شان دار سا بنگلہ قدیم و جدید امتزاج کا بہترین نمونہ تھا۔ بڑے بڑے دالان، طویل راہ داریاں، چکر کھاتا زینہ، ٹیرس پر کھڑے ہو کر سامنے نظروں کو تراوٹ بخشتا خوب صورت لان۔ غرض ہر چیز اتنی شان دار تھی کہ زیاد سراہے بنا نہیں رہ سکا۔

"تمہارے ماما جی کس حصے کو رونق بخشتے پائے جاتے ہیں؟" وہ گلابی و کاسنی رنگ کے پھولوں والی بیلوں سے لپٹی گرل کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ گھر میں ٹکتے ہی کہاں ہیں؟ جب بھی آتے ہیں اپنے کمرے میں گھس جاتے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی اور آہستگی سے سیڑھیاں اتر کر لکڑی کا بھاری منقش

دروازہ ذرا سا دھکیلا تو وہ ہلکی سی مخصوص چرر کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

"ہوں! نائس روم" زیاد کی آنکھوں میں توصیف کا رنگ جھلکا تھا۔

"یہ بارعب شخصیت تو یقیناً" تمہارے ماما جی ہیں۔ ساتھ والے حضرت کون ہیں؟" وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر کی طرف اشارہ کرتا پوچھ رہا تھا۔

"یہ حیدر ہے میرا ماموں زاد' پڑھائی کے سلسلے میں لندن مقیم ہے اور کچھ دنوں میں اس کی پاکستان واپسی متوقع ہے۔"

"اچھا تو انہیں تمہارے اکلوتے کزن ہونے کا شرف حاصل ہے پھر تو یقیناً" دوستی بھی ہوگی؟"

"بات چیت تو ہوتی رہتی ہے پر دوستی۔۔۔ نہیں ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولتی بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی' کافی دیر گھومتے رہنے سے اس کی ٹانگوں میں درد ہونے لگا تھا جبکہ زیاد بہت اشتیاق اور توجہ سے اس کے گھر اور گھر والوں کے بارے میں تبصرے کر رہا تھا اور ماہی کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"مجھے لگا ایج فیلو ہونے کی وجہ سے شاید تمہاری اس سے دوستی ہو۔"

"جی نہیں مردوں میں مالی بابا' خانساماں اور ڈرائیور چاچا کے علاوہ میری دوستی صرف آپ سے ہے۔" اس نے ناک چڑھائی تھی۔

"شکر! تم نے ان خوش نصیبوں کی لسٹ میں مجھے شامل تو کیا۔" زیاد کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یونہی ریلیکس انداز میں چلتے بائیں دیوار میں نصب چھوٹے سے دروازے کی ناب گھمائی تو دروازہ کھل گیا۔ اس نے تھوڑا سا جھانک کر دیکھا تھا نیچے بہت نیچے تک جاتی سیڑھیاں اندھیرے میں گم ہو رہی تھیں۔

"ماہی! یہ۔۔۔" اس نے گردن موڑ کر اپنی جانب تکتی ماہی کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھی۔

"یہاں کیا ہے میرا مطلب ہے۔۔۔"

"تہ خانہ! پتا نہیں کتنے سالوں سے ماما جی نے یہاں کاٹھ کباڑ جمع کر رکھا ہے۔" وہ ناک سکوڑتے ہوئے ناگواری سے بولی تھی۔

"تہ خانہ! گریٹ! جانتی ہو مجھے بچپن میں تہ خانوں میں گھس کر اندر چھپی اشیا کے ڈھیر میں کار آمد چیزیں ڈھونڈنے کا بہت کریز تھا۔" وہ پہلی بار اس سے اپنی کوئی پرانی عادت شیئر کر رہا تھا۔

"اس تہ خانے میں آپ کو کاٹھ کباڑ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔" وہ نیم تاریک سیڑھیاں اترتی وثوق سے بولی تھی۔

"کیا پتا کوئی خزانہ ہاتھ لگ جائے۔" وہ ازراہ مذاق بولا تھا پھر قدرے سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"میں صرف اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" ڈھیر ساری سیڑھیاں پھلانگنے کے بعد ان دونوں کے قدم ایک ساتھ مقفل دروازے پر آکر تھمے تھے۔

"تمہارے پاس اس کی کوئی چابی ہے یا "کھل جا سم سم" سے کام چلاؤ گی؟"

☼ ☼ ☼

"جو کچھ ہوا وہ بھلایا جا سکتا ہے' لیکن اگر ہمیں اپنے رشتے میں پہلے جیسی مضبوطی اور استحکام لانا ہے تو تمہیں اپنی بھانجی میرے حوالے کرنا ہوگی ہمیشہ کے لیے!" تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ گردیزی کا مطالبہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا اور اب اس نے جو بھی فیصلہ کرنا تھا خوب سوچ سمجھ کر اور جلدی کرنا تھا۔

ماہی نے بہت آزردگی سے ماما جی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا تھا' پہلی بار ہوا تھا کہ وہ ان سے خفا تھی اور انہوں نے اسے منانے میں پہل نہیں کی وہ تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

"بی بی! آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو زیاد صاحب کے متعلق بڑے صاحب کو بتا دینا چاہیے۔" بنتو نے تکیہ اس کی کمر کے پیچھے درست کرتے ہوئے کہا تو وہ ناسمجھ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"دیکھیں نا! بڑے صاحب آپ کے ماں باپ کی جگہ پر ہیں۔ انہوں نے یقیناً" آپ کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کریں آپ کو انہیں اعتماد میں لے کر اپنے دل کی بات بتا دینی چاہیے۔" بنتو جو اسے سمجھانا چاہ رہی تھی وہ سمجھ گئی۔ اور صبح ناشتے کی میز پر ماما جی کا انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی ان کے کمرے میں چلی آئی۔

"ماما جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انہیں یوں بستر میں لیٹا دیکھ کر اس نے پریشانی سے پوچھا' لاکھ خفا سہی پر وہ ان سے بہت محبت کرتی تھی۔

"ہاں بیٹا! بالکل ٹھیک ہوں' بس رات ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئی تو اس وقت طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔" وہ تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گئے۔ ماہی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

"اور رات نیند کیوں نہیں آئی تھی؟"

"تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا' وقت بیتتا رہا اور سوچ کا پنچھی کچھ یوں اڑا کہ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا۔"

"میرے بارے میں؟ میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے قدرے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

"تم میری بھانجی نہیں بیٹی ہو اور جن کے گھر بیٹیاں ہوں انہیں سکون کی نیند کہاں آتی ہے جب تک۔۔۔"

"جب تک؟" ماہی نے ان کی ادھوری بات کا سرا پھر سے جوڑا تھا۔

"جب تک وہ اپنے گھر کی نہ ہو جائیں۔" ماہی نے بے اختیار سر جھکا دیا تھا۔ جس موضوع پر وہ ان سے بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی انہوں نے خود ہی وہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔

"ماما جی! ایک بار آپ نے کہا تھا نا کہ آپ میری ماں باپ سب کچھ ہیں؟"

"آف کورس بیٹا!"

"تو کیا میں آپ کو ماں سمجھ کر اپنے دل کی بات بتا سکتی ہوں؟"

"ایسی کیا خاص بات ہے؟" ماما جی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

کچھ تھا ایسا جو انہیں ٹھٹکا گیا۔ اس نے جھکا سر مزید جھکاتے ہوئے اپنی نگاہیں گود میں دھرے ہاتھوں پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"میں زیاد سے محبت کرتی ہوں اور ان ہی سے شادی کرنا چاہوں گی۔" بہت مشکل مرحلہ تھا جو اس نے سر کیا' کچھ دیر کے لیے گمبھیر چپ نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا' ماما جی بہت عجیب نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ میری کل کائنات ہیں ماما جی! میرے بارے میں آپ کا ہر فیصلہ سر آنکھوں پر کیونکہ میں جانتی ہوں آپ میرے دل کی خوشی کا ضرور خیال کریں گے۔"

"(ہوں! تو ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں؟)"

"تم نے صحیح کہا تمہاری خوشی کا خیال میرے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔" انہوں نے بہت جلد خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے سرپرائز دینا ہمیشہ سے پسند رہا تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ اسے اپنے سرپرائز کے بدلے ایک اور سرپرائز ملتا۔

وہ مبہوت سا کھڑا اس پری پیکر کو دیکھ رہا تھا جو جھولے پر آڑی ترچھی لیٹی سکون سے آنکھیں موندے خود سے بھی بے خبر تھی۔ اس کا گلابی دوپٹہ جھولے سے نیچے لٹک رہا تھا کسی قسم کی زیبائش سے عاری چہرے پر عجیب سی ملائمت تھی' پنکھڑیوں جیسے لب یوں نیم وا تھے گویا وہ سوتے میں ہلکا سا مسکائی ہو۔ شاید بے خبر ہونے سے پہلے کسی خوب صورت یاد نے اس کا پلو تھاما تھا۔ وہ خود فراموشی کے عالم میں اسے دیکھے گیا۔

"حیدر! مائی سن۔۔۔!" دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتے ماما جی والہانہ انداز میں اس کی جانب بڑھے تھے۔ حیدر آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گیا۔

"آئم ایم سرپرائزڈ مائی چائلڈ!" ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں حیدر کی سرپرائز آمد بہت اچھی لگی ہے۔

"آئی ایم ٹو سرپرائزڈ ڈیڈ!" اس نے پر شوق نگاہوں سے ماہی کو دیکھا تھا جس کی آنکھ ان دونوں کی آواز سے کھل گئی تھی اور اب وہ بہت محویت سے باپ بیٹے کا پرتپاک انداز دیکھ رہی تھی۔ حیدر کے اپنی جانب متوجہ ہونے پر وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"کیسے ہو حیدر؟" چہرے پر آئے بال سمیٹ کر کیچر میں مقید کرتی وہ ان کے قریب آگئی تھی۔

"بالکل فٹ! تم سناؤ؟" حیدر کے استفسار پر وہ کندھے اچکا کر مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"کیا۔۔۔؟" وہ تینوں ایک ساتھ پوری قوت سے چلائی تھیں ماہی نے بے اختیار انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں۔

"یعنی کہ بنتو صاحبہ کے مشورے پر تم نے ماما جی تک سے بات کرلی۔ اتنا کچھ ہوگیا اور تم ہمیں اب بتا رہی ہو؟" فاریہ کے تیور خونخوار تھے۔

"اگر پہلے بتا دیتی تو تم لوگوں کے ایسے ہونق چہرے کیسے دیکھ پاتی بھلا؟" وہ کندھے اچکاتی مزے سے بولی تھی۔ وہ تینوں اسے بری طرح گھورتی ہنس پڑیں۔ اسی اثناء میں بنتو لوازمات سے بھری ٹرالی لیے نظر آئی۔

"ارے بنتو! تم نے خوامخواہ اتنا اہتمام کرلیا۔ ابھی ہم ایک مزے کی ٹریٹ اڑانے ریسٹورنٹ جانے والی ہیں۔" فاریہ کی بات پر ماہی چونکی۔

"ٹریٹ؟"

"تو تمہیں کیا لگتا ہے اتنی بڑی خبر سنانے کے بعد ہم تمہیں ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟ ہرگز نہیں، پہلے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ سے مزے کی ٹریٹ اڑاتے ہیں پھر اس کے بعد شاپنگ!" ماہی نے مسکراتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

"چلو پھر۔" لان چیئر پیچھے کھسکاتی وہ اٹھی تو تینوں اس کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہیلو گرلز! کین آئی جوائن یو؟" راہداری سے گزرتے حیدر کی ان پر نظر پڑی تو ماتھے پر بکھرے گھنگھریالے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتا ان ہی کی طرف چلا آیا۔ فاریہ نے کوفت سے سر جھٹکا تھا۔ اسے کسی بھی حوالے سے لڑکوں کا لڑکیوں سے خوامخواہ فری ہونا سخت برا لگتا تھا۔

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" وہ بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

"ماہی سے ایک زبردست قسم کی ٹریٹ لینی ہے اور اس کے بعد شاپنگ بہت لمبا پروگرام ہے۔" افشی نے خوش دلی سے بتایا تھا۔

"وہ کس خوشی میں بھئی؟" افشی ایک بار پھر جوش سے شروع ہونے والی تھی کہ فاریہ نے زور کی کہنی اس کے پہلو میں ماری۔

"ہماری آپس کی بات ہے، آپ نہیں سمجھیں گے۔" فاریہ نے "آپس کی بات" پر زور دے کر کہا تو ماہی کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ حیدر بے خود سا اسے دیکھے گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ماہی کی شادی گردیزی کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" ڈیڈ کی بات پر اس نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"آپ کو یقین ہے وہ اس شادی پر آمادہ ہو جائے گی؟"

"اسے آمادہ ہونا پڑے گا۔ میں مزید گردیزی کی ناراضی افورڈ نہیں کرسکتا۔" ان کے قطعی انداز پر وہ گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔

"بہرحال، مجھے نہیں لگتا آپ کی ایسی کوئی کوشش کامیاب ہو پائے گی۔" نا چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ انہوں نے ابرو اچکا کر استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ خود سوچیں ڈیڈ! کہاں گردیزی "انکل" کہاں وہ کوئی تک بنتی ہے بھلا؟" اب کی بار وہ بری طرح ٹھٹکے تھے۔ جانچتی نگاہوں سے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔

"حیدر۔۔۔!"

"میں ماہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ!"

☼ ☼ ☼

"آج کا اخبار دیکھا ہے تم نے؟"

"نہیں، کوئی خاص خبر؟" سگار کی راکھ جھاڑتے وہ ریلیکس انداز میں بولا تھا۔

"اخبار دیکھو خود ہی پتا چل جائے گا۔" گردیزی نے لائن ڈسکنیکٹ کردی۔ سیٹھ اکرام نے ہاتھ بڑھا کر رول کیا اخبار اٹھالیا۔

"معروف بزنس مین سیٹھ اکرام کا امپورٹ ایکسپورٹ کی آڑ میں اسمگلنگ کا کامیاب کاروبار۔" شہ سرخی پر نظر پڑتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"امپورٹ ایکسپورٹ کی آڑ میں اسمگلنگ کا کامیاب کاروبار کرنے والے سیٹھ اکرام کے خلاف ٹھوس شواہد ملے ہیں۔ جن کی تفصیل ایک دو روز میں جاری کردی جائے گی۔ حکومت کا ان کے خلاف حتمی کارروائی کا اعلان۔۔۔" وہ جوں جوں پڑھتا جا رہا تھا اس کے چہرے کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔ سخت طیش کے عالم میں اخبار رول کرکے دور اچھالا اور گردیزی کا نمبر ملانے لگا۔

"گردیزی! یہ سب کیا ہے؟ کس کا ہاتھ ہے اس کے پیچھے۔ مجھے لگتا ہے غدار ہمارے بیچ میں ہی ہے۔"

"مجھے خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ آخر ہمارے خفیہ ٹھکانوں کا پولیس کو پتا کیسے چلا؟"

"خیر! اس جگسا پزل کو حل کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے یقین ہے گھر کے ہی کسی بھیدی نے لنکا ڈھایا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"ڈیڈ! آپ ماہی کی شادی گردیزی انکل سے نہیں کریں گے۔"

"حیدر! تم جانتے ہو میں اس وقت کس مشکل میں گرفتار ہوں؟"

"اوہ کم آن ڈیڈ! جو ایسے خطرناک کام کرتے ہیں وہ ان خطروں سے نبٹنا بھی جانتے ہیں۔" اس نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔

"بہرحال! میں آپ سے ایک بار پھر کہہ رہا ہوں مجھے ماہی سے ہی شادی کرنی ہے۔ گردیزی انکل کو آپ خود نبٹالیں۔" باپ کی "ٹینشن" سے بے پروا بے فکری سے کہتا وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ سیٹھ اکرام نے بمشکل اپنا ذہن اس پر سے ہٹایا تھا۔

اس نے بے شمار منتشر نقطوں کو یکجا کیا۔ کڑی سے کڑی ملی تھی اور جو نقشہ ابھر کر سامنے آیا وہ بہت واضح تھا۔ یکے بعد دیگرے پیش آنے والے واقعات کو ترتیب دیا تو جو ہلکا سا ابہام تھا وہ بھی جاتا رہا۔ وہ بے چینی سے ٹہلتا دروازے پر آن ٹھہرا۔

"بنتو۔۔۔!" اس کی پکار میں کچھ تو ایسا تھا کہ بنتو کا دل تھمنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے تمہارا ایک سیکرٹ شیئر کرنا ہے۔"

اس نے دو تین بار الجھ کر میسج پڑھا تھا۔

"میرا ایسا کون سا سیکرٹ ہے جو زیاد جانتا ہے اور میں نہیں جانتی۔" وہ سچ مچ بہت الجھ گئی تھی اور ابھی اس کو کال ملانے ہی والی تھی کہ ہلکی سی دستک دے کر ماما جی اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماما جی! آپ۔۔۔؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" وہ اس کے بیڈ کے کنارے ٹک گئے۔

"ضروری بات؟" وہ کچھ فاصلے پر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"تم جانتی ہو زیاد کون ہے؟" ان کی اگلی بات سن کر

وہ سخت اچنبھے میں مبتلا ہو گئی۔

"چند سال پہلے میں نے اپنے ایک دوست کے کہنے پر عمار ہمدانی کے ساتھ ففٹی ففٹی شیئرز پر ایک بزنس اسٹارٹ کیا تھا۔ تب میں نہیں جانتا تھا وہ غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔ اس نے بہت ہوشیاری سے مجھے بھی اپنے ساتھ انوالو کر لیا' جب مجھے پتا چلا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ پولیس کو اس کے دھندے کی بھنک پڑی تو لپیٹ میں میں بھی آگیا۔ المختصر بہت دقتوں سے میں نے اس سب گورکھ دھندے سے اپنی جان چھڑوائی تھی۔ عمار ہمدانی سے بزنس الگ کیا' لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ گناہ کی سیاہی جاتے جاتے ہی جاتی ہے۔ عمار ہمدانی کی مہربانی کہ میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نگاہوں میں اپنے لیے "مشکوک فرد" کا لیبل کبھی نہیں ہٹا سکا۔ سال بیت گئے لیکن آج بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ کی عقابی نگاہیں میرے شفاف بزنس پر لگی ہیں۔ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ ہے جو میرے اردگرد جاری ہے۔" ماہی بہت خاموشی سے ان کی کتھا سن رہی تھی' لیکن ان ساری باتوں کو زیاد سے کیا تعلق ہے؟ اس کے ذہن میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا۔

"انہوں نے کئی خفیہ کارندے میرے پیچھے لگا رکھے ہیں اور یہ "زیاد احمد مصطفیٰ" بھی انہی میں سے ایک ہے' پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سیکرٹ ایجنٹ! جس نے مجھ تک پہنچنے کے لیے بہت کامیابی سے تمہیں اپنا "مہرہ" بنایا۔" وہ سانس روکے بنا پلک جھپکے بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔

"اس کا تم سے ٹکرانا' شناسائی سے دوستی اور دوستی سے محبت کا جھانسہ! یہ سب اس کی ایک چال تھی۔ اس کی پلاننگ میں کہیں کوئی جھول کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ تم ایک ایک کر کے اس کی ساری توقعات پر پورا اترتی چلی گئیں۔ اس نے طے شدہ پلاننگ کے تحت تم سے اس گھر اور اس گھر سے میرے کمرے تک کا سفر بہت کامیابی سے طے کیا۔"

"نہیں...! نہیں ماما جی پلیز ایسا مت کہیں' زیاد ایسا نہیں ہے۔" اس کا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر کہے' لیکن قوت گویائی نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

"تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آرہا نا؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر یقین سے مسکرائے تھے۔

"چلو آزما لیتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"میرے لیے دعا کرنا بنتو! آج میں اپنی محبت کو آزمانے جا رہی ہوں۔" وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور کار اسٹارٹ کر دی۔

کل کی رات اس کے لیے بہت صبر آزما ثابت ہوئی تھی۔ بہت طویل اور گہری! اگرچہ ماما جی کی باتوں کو اس نے اسی وقت پوری شدت سے جھٹلا دیا تھا پھر بھی ایک نامانوس سی بے چینی نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ جب تک زیاد سے مل کر ماما جی کی ساری غلط فہمیاں دور نہیں کر دیتی تب تک اسے سکون نہیں ملے گا۔

گہری کالی رات کے بعد صبح کا تصور کتنا خوش کن ہوتا ہے۔ یہ اسے آج پتا چلا تھا۔ کالی گھنگھور گھٹاؤں نے سارے آسمان پر قبضہ جما رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ آن کی آن میں برس پڑیں گے۔ شاہ مشرق بہت خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑتا کالی بدلیوں کی اوٹ میں منہ چھپا گیا۔

"زیاد! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔" کتنے دنوں سے اس کا کوشش کے باوجود زیاد سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تب اس نے سوچ لیا تھا جب وہ اس سے رابطہ کرے گا تو وہ اس سے یوں بغیر بتائے غائب ہو جانے پر خوب جھگڑا کرے گی' لیکن آج جب اس کی کال مل گئی تھی تو اس کے "ہیلو" کے جواب میں اس نے کتنے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"زیاد! میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میں بھی ابھی تم سے یہی کہنے والا تھا کیونکہ..."

"مجھے ابھی اور اسی وقت آپ سے ملنا ہے۔" اس نے زیاد کو بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"اوکے! پھر کہاں ملیں؟" دوسری طرف نارمل لہجے میں پوچھا گیا۔

"جہاں پہلے ملا کرتے تھے۔" اسے ایک بار پھر اپنی بے تاثر آواز سنائی دی تھی۔

وہ زیاد سے اس لہجے و انداز میں بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور اب...!

اسے خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔ کوئی بات نہیں جب ماما جی کی ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی تو میں خود اس سے معذرت کر لوں گی۔ وہ یقیناً" مان جائے گا۔ وہ سارے راستے خود سے الجھتی آئی تھی۔

زیاد اپنی مخصوص سیڑھیوں پر بیٹھا یقیناً" اسی کا منتظر تھا۔ ماہی نے سائیڈ پر گاڑی روک دی۔ اسے اپنے قدم من من بھر کے محسوس ہوئے تھے۔ چار قدموں کا فاصلہ گویا چار صدیوں میں طے ہوا تھا۔

"تو گویا اب مجھے تمہاری ڈانٹ پھٹکار سننے کے لیے خود کو تیار کر لینا چاہیے۔ نہیں؟" اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش تھا۔

"زیاد! آپ کا پورا نام کیا ہے؟" وہ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر پہلو سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ بازو سینے پر باندھے' نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کیے۔

"تو تم نے اتنا اہم سوال پوچھنے کے لیے مجھے یہاں بلوایا ہے' میں تو سمجھا تھا..."

"زیاد! آئی ایم سیریس!" اب کی بار وہ ٹھٹکا تھا۔

"بات کیا ہے؟" شکن زدہ لباس' الجھے بکھرے بال' متورم آنکھیں اور ستا چہرہ! اسے شدید قسم کی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

"ماہی...!" وہ سیڑھیوں سے اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"پلیز زیاد! آپ نہیں جانتے' میں اس وقت کس اذیت سے گزر رہی ہوں' جو پوچھوں سچ سچ بتائیے گا۔" اتنی سی بات کہنے میں اس کی آنکھیں بری طرح بھیگ گئی تھیں۔

"و اس رونگ ماہی...؟"

"اس سے کیا پوچھتے ہو؟ میں بتاتا ہوں۔" ماما جی کار کا دروازہ بند کر کے دبنگ قدموں سے چلتے ان کے قریب آگئے تھے۔

"مجھے تو یقیناً" پہچانتے ہو گے تم؟" ماہی نے واضح طور پر اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ امید کا دامن مضبوطی سے تھامے کھڑی رہی۔

"کیا خوب گیم کھیلا ہے تم نے زیاد احمد مصطفیٰ! سچ میں داد دینے کو جی چاہ رہا ہے۔ پر افسوس اینڈ تمہاری خواہش کے مطابق نہیں ہوا۔" استہزائیہ انداز میں کہتے آخر ان کا لہجہ بدل گیا تھا۔ زیاد لب بھینچے انہیں گھورنے لگا۔

"اس ساری بکواس کا میں کیا مطلب لوں؟"

"یہی کہ ایک حساس ادارے کے سیکرٹ ایجنٹ کو اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے سیڑھی بنانے کو میری بھانجی ہی ملی تھی؟" ماہی کے سفید پڑتے چہرے پر نگاہ غلط ڈالے بغیر انہوں نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کا پلندہ اس کے سامنے پھینکا تھا۔ وہ یونہی اتنے پر یقین نہیں تھے' اس کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی آئے تھے۔ ماہی کی نگاہیں ہوا سے ادھر ادھر اڑتے ان صفحوں پر بھٹکنے لگیں جو اس کے بدترین خدشات کی تصدیق کر رہے تھے۔

"ٹھیک کہا تم نے' تمہارے جیسے مجرموں تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنی اصل شناخت چھپانی پڑتی ہے۔" سات آسمان بھی اس کے سر پر آکر ٹوٹتے اسے تب بھی اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی زیاد کے اس ایک جملے سے ہوئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا مطمئن چہرہ دیکھے گئی۔

"ہاہ! مجرم!" انہوں نے ہنکارا بھرا تھا۔

"تمہاری نگاہ میں اگر میں کوئی مجرم ہوں تو دھوکا دہی کے حساب سے تم بھی میری بھانجی کی نگاہوں میں مجرم ہو۔" انہوں نے ایک بار پھر ماہی کو تپتی ریت پر گھسیٹا تھا جواب بھی شدید بے چینی کی سی کیفیت میں یک ٹک اس شخص کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی جس سے وہ بے انتہا محبت کرتی تھی اور محبت تو وہ بھی اس سے کرتا تھا۔

"محبت... انہیں!"

"میں تسلیم کرتا ہوں مجھے تم تک پہنچنے کے لیے ماہی کا سہارا لینا پڑا۔" اس کے اندر محبت کرلائی تھی۔

"کیونکہ تمہاری گردن تک ہاتھ ڈالنے کے لیے..."

"اس کا تم سے ٹکرانا' شناسائی سے دوستی اور دوستی سے محبت کا جھانسہ یہ سب اس کی ایک چال تھی۔"

"لیکن یہ ایک آدھا سچ ہے پورا سچ یہ ہے کہ..." وہ بنا پلک جھپکے اسے صرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے الفاظ اس کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔

"اس نے مجھ تک پہنچنے کے لیے بہت کامیابی سے تمہیں اپنا مہرہ بنایا۔" ماما جی اب کسی بات پر بری طرح اس پر چلا رہے تھے۔ اس کی ساکت پتلیوں میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔

"اب چیخنے چلانے کا کوئی فائدہ نہیں' قانون کی نظر میں تم مجرم ثابت ہو چکے ہو۔ تم نے سچ کہا میرا کھیل اب ختم ہوا لیکن اینڈ میری توقع کے عین مطابق ہی ہوگا۔"

اس کے لہجے میں متوقع فتح کا خمار چھلکنے لگا تھا۔ ماہی کے اندر کیا کچھ ٹوٹ کر کرچی ہوا اسے خبر نہ ہو سکی۔

"ماہی...!" وہ اب اس کی جانب پلٹا تھا جس کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ چکا تھا اور آنکھیں...!

وہ لمحہ بہ لمحہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بت میں جان پڑنے لگی۔ وہ آہستگی سے دو قدم پیچھے ہٹی اور بنا کچھ کہے پلٹ کر اندھا دھند بھاگتی سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ماہی...! رکو...!" ماما جی چلائے تھے۔ نیاد تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

ماہی نے جھٹکے سے کار کا دروازہ بند کیا اور فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑا دی۔ ساری آوازیں سارے مناظر پیچھے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا' لیکن آسمان اس کے دکھ پر خوب رویا۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ نجانے کتنی دیر سے یونہی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ ایک ایسے جواری کی مانند جس نے جوئے میں اپنی سب سے قیمتی متاع ہار دی ہو۔

وہ جو یہ سوچتی تھی کہ اس نے انجانے میں ایسی کون سی نیکی کی تھی جس کے بدلے اسے ایسا پیارا شخص ملا' اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس نے ایسا کون سا گناہ جان بوجھ کر کیا جس کی ایسی بھیانک سزا ملی ہے؟

"دیکھیں ہر کسی پر اعتبار کرنا اچھی بات نہیں' لیکن ضرورت پڑنے پر کسی ایک پر اعتبار کر لینا چاہیے۔"

"اور اگر وہ کوئی ایک بھی ناقابل اعتبار نکلے تو؟"

اس وقت اس کے دل میں جنم لیتے خدشے نے کتنی جلدی دم توڑ دیا تھا۔ کاش کہ نہ توڑتا' کاش وہ اس پر اعتبار نہ کرتی۔

"اس کا تم سے ٹکرانا' شناسائی سے دوستی..."

باباجی کی سفاک آواز اس کے اندر کہیں چھید کر رہی تھی۔

"سنو ماہی! زیادہ ہنسا مت کرو ورنہ میری نظر لگ جائے گی۔"

"آپ نے یہ کیوں نہیں کہا تھا کہ زیادہ ہنسا مت کرو بہت جلد یہ ہنسی تم سے چھن جائے گی؟" باہر چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا۔ زور کی بجلی کڑکتی دوسرے ہی لمحے بارش میں بھیگتا ہر منظر تاریکی میں ڈوب جاتا۔

"ہو سکتا ہے کوئی خزانہ ہاتھ لگ ہی جائے!"

"تو آپ نے اس خزانے تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنی سیڑھی بنایا اور میں سمجھی آپ میری محبت میں۔" کیا محبت یوں بھی دھوکا دیتی ہے؟ نہیں' محبت دھوکا نہیں دیتی دھوکا تو انسان دیتے ہیں۔ وہ بھی تو ایک انسان تھا۔ اپنی خواہشات' اپنی کامیابی کے لیے سب کچھ کر گزرنے والا۔

"آپ کو پیسے کے متبادل بہترین چیز کیا لگتی ہے؟"

"سکون' خوشی اور کامیابی!"

"ایسی کامیابی جس سے دوسروں کا سکون ملیامیٹ ہو جائے خوشی کا باعث ہوتی ہے؟" ماہی کو اس حالت میں دیکھ کر بنتو کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ کتنی دیر سے

اسے خود سے جنگ کرتا دیکھتی رہی' لیکن اب مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"بی بی...!"

"نہیں جس محبت کو آزمانے نکلی تھی وہ محبت نہیں تھی بنتو! وہ تو محبت ہی نہیں تھی...!" وہ گھٹنوں میں سر چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ اس کی کمر سہلاتی بنتو کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

حیدر شاکڈ سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ سیٹھ اکرام نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات بتا دی تھی اور اسے اس ساری تفصیل میں صرف "زیاد" والے قصے سے سروکار تھا۔

وہ یہ کیوں سمجھ بیٹھا تھا کہ میدے سے گندھی اس بے انتہا پیاری لڑکی پر گردیزی کے علاوہ صرف اس کا اپنا دل ہی آ سکتا ہے؟

"ڈیڈ! آپ نے صحیح کیا جو اس زیاد کا پتا کاٹ دیا۔" اسے ماہی کے سامنے نیاد کی ساری حقیقت کھل جانے والی بات سن کر یک گونہ اطمینان ملا تھا۔

"ہاں کاٹ تو دیا' لیکن وقت پر نہیں کاٹا۔ وہ میرے خلاف بہت اوپر تک معاملہ لے جا چکا ہے۔ پولیس کسی بھی وقت میرے خلاف ایکشن لے سکتی ہے۔" سیٹھ اکرام سگار سلگاتا بے چینی سے بولا تھا۔

"ویسے دیکھ لیں جس طرح میرے راستے سے نیاد نامی کانٹا نکل گیا اسی طرح گردیزی انکل بھی پرابلم نہیں بنیں گے۔" وہ اس سارے معاملے کو صرف اپنے مطلب کے رخ پر دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ اکرام نے اس بار اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ کسی اور سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

"میں ذرا ماہی کو دیکھ لوں۔" نارمل انداز میں کہتے وہ بالوں میں انگلیاں چلاتا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماہی...!" وہ بے تکلفی سے دروازہ کھولتا اندر آ گیا تھا۔ ماہی کے سرہانے بیٹھی بنتو فکر مندی سے کھڑی ہو گئی۔

"شش! آہستہ بولیں۔ بی بی کی ابھی آنکھ لگی ہے۔" حیدر اسے سرتاپا گھورتا آگے بڑھ آیا تھا۔ اس کے قدم بیڈ کے قریب آن رکے تھے۔ شہابی رنگت میں گھلی زردیاں' چہرے پر آنسوؤں کے واضح نشان' پژمردہ اور مضمحل وجود!

تو یہ سارا سوانگ اس بہروپیے کے لیے! اسے ایکدم شدید غصہ آیا تھا' نجانے کس پر؟

"تم جاؤ!" اس نے بنتو کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا جو اس کا حکم سن کر بھی اپنی جگہ جمی کھڑی رہی۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟ جاؤ یہاں سے۔" وہ دھاڑا تھا۔ ماہی کی آنکھ فوراً کھلی تھی اس نے ایک نظر غصے سے سرخ پڑتے حیدر کو دیکھا پھر بے بسی سے انگلیاں چٹخاتی بنتو کو' وہ اٹھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"اوہ ماہی! میں اتنے عرصے بعد پاکستان آیا ہوں اور تم بجائے مجھے کہیں گھمانے پھرانے کے یا کمپنی دینے کے مزے سے بستر پکڑے پڑی ہو۔" وہ اسٹول گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"آؤ کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"نہیں میرا موڈ نہیں ہو رہا۔" اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"اوکے! اس بستر کی جان چھوڑو۔ نیچے کچن میں چل کر مزے کی کافی پیتے ہیں۔"

(میں کافی صرف ایک ہی شخص کے ساتھ پیتی تھی)

"اٹھو نا؟" وہ زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر اٹھانے لگا۔

"میں کافی نہیں پیتی حیدر!" اس نے سختی سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا تھا۔ حیدر کو بہت برا لگا۔ ساتھ کھڑی بنتو پر نظر پڑی تو اسی پر الٹ پڑا۔

"تم کیوں ابھی تک منہ اٹھائے کھڑی ہو؟ جاؤ یہاں سے۔"

"حیدر! بنتو اس لہجے کی عادی نہیں ہے اور ویسے بھی میں نے خود اسے یہاں رکنے کے لیے کہا تھا۔" حیدر کی برداشت کی حد بس یہیں تک تھی۔

"تم اور تمہارے ملازم!" اس نے غصے سے سر جھٹکا تھا۔
"ویسے اس بہروپیے کے سوگ سے جتنی جلدی نکل آؤ تمہارے لیے اتنا بہتر ہے۔" جاتے جاتے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال گیا تھا۔
"بہروپیا!" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ زیاد کے لیے ایسا لفظ استعمال کرنے والے کا سر پھاڑ ڈالتی۔ لیکن اب کرب سے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ حیدر جاتے جاتے اس کے زخم چھیڑ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

خوب برسنے کے بعد ہلکے پھلکے ہو کر بادلوں نے رخت سفر باندھا تو شاہ خاور پوری آب و تاب سے آسمان کے فراخ سینے پر چمک اٹھا۔ ہر منظر دھل کر نکھر گیا تھا۔
ماہی منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر دوپٹے کے پلو سے چہرہ خشک کرتی باہر آگئی۔
پشت پر پھیلے الجھے بکھرے پریشان حال بالوں کو آہستگی سے سنوار کر ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی گوندھی اور دوپٹہ درست کرتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ گئی۔
بلا ارادہ اس کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اپنے موبائل پر پڑی تھی۔ نجانے کتنے دنوں بعد اس نے آج اسے ہاتھ لگایا تھا۔
زیاد کے لاتعداد میسجز اور مسڈ کالز! اس نے پڑھے بغیر سارا ان باکس خالی کر دیا اور آخر میں اس کا نمبر ڈیلیٹ کرنے کے بعد موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتی باہر نکل آئی۔
ڈسٹنگ کرتی نذیراں نے اسے نیچے آتا دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجالی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لان کی جانب بڑھ گئی۔
"آپ کے قدم رکھتے ہی بہار نے آکر نجانے کتنے دنوں سے میرے باغ پر چھائی خزاں کو رخصت کر دیا۔" پودوں کو نہلاتے مالی بابا کی پُر شفقت نگاہوں نے اس کے اداس چہرے کا بوسہ لیا تھا۔ وہ یونہی آہستگی سے سرخ روش پر ٹہلتی آگے بڑھ گئی۔ چوکیدار کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ڈرائیور چاچا مستعدی سے اٹھ کر اس کی جانب آگیا۔
"بی بی۔۔۔! مجھے معاف کر دیں! اگر اس دن میں آپ کو چھوڑ کر نہ جاتا تو آج یہ سب یوں نہ ہوا ہوتا۔"
"آپ کا کیا قصور چاچا!"
"سارا قصور میرا ہے۔ اس رات جو کچھ بھی ہوا، میں بھی اس منصوبے میں شامل تھا۔ آپ کو چھوڑنے کے بعد میں اپنے گاؤں نہیں گیا تھا کیونکہ مجھے اپنے گاؤں جانا ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھے مجبور کیا تھا جھوٹ بولنے پہ۔۔۔" ماہی چپ چاپ شہتوت کے پتوں میں شور مچاتی بھوری چڑیوں کو دیکھے گئی۔ اسے شاید اب کوئی بھی بات حیران نہیں کرتی تھی۔
"آپ نے سچ کہا تھا میری بیٹی کی خوشی اس وقت زیادہ اہم تھی، میرا ہونے والا داماد شہر میں اپنے کسی آوارہ دوست کے ساتھ ڈکیتی کے جرم میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ہمارے گاؤں اور خاندان والے اس بات سے بے خبر تھے۔ صرف میں جانتا تھا، لیکن اپنی عزت اپنے ہاتھ میں کے تحت، بہت صفائی اور خاموشی سے اس بات کو دبا گیا۔ لیکن وہ میرا کچھ نہیں لگتا تھا۔ اس نے اس واقعے کو میری مجبوری بنایا، اگر میں اس کی بات نہ مانتا تو وہ عین شادی والے دن ساری برادری کے سامنے میرے داماد کی چوری اور تھانے تک جانے والی بات بتا دیتا۔ میں اس بے عزتی سے ڈر گیا تھا۔ میں مجبور ہو گیا تھا بی بی۔۔۔! مجھے معاف کر دیں۔" وہ دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ تا رو پڑا تھا۔ ماہی نے خاموشی سے اس کے دونوں ہاتھ الگ کیے۔
"میں نے آپ سے کچھ کہا ہے چاچا؟"
"اسی بات کا تو دکھ ہے آپ نے کچھ نہیں کہا۔ آپ کو چاہیے مجھ پر چیخیں، چلائیں مجھے برا بھلا کہیں میں بھی تو آپ کے قصورواروں میں شامل ہوں۔"
"غلطی تو پھر میری ہی ہوئی نا چاچا! مجھے انسانوں کی پہچان نہیں ہے۔" وہ سکون سے کہتی واپس مڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بچھڑنا ہے تو خوشی سے بچھڑو
سوال کیسے، جواب چھوڑو
کسے ملی ہیں جہاں کی خوشیاں؟
ملے ہیں کس کو عذاب چھوڑو
نئے سفر پہ جو چل پڑے ہو
مجھے خبر ہے کہ خوش بڑے ہو۔۔۔
ہے کون اجڑا تمہارے پیچھے
یا کس کے ٹوٹے ہیں خواب چھوڑو
محبتوں کے تمام وعدے۔۔۔
نبھائے کس نے بھلائے کس نے
تمہیں پشیمانی ہو گی جاناں!
جو میری مانو حساب چھوڑو

وہ آج نجانے کتنے دنوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی۔ تارکول کی سیاہ شفاف سڑک کے دونوں اطراف بلند و بالا درختوں کے سائے عجیب سی ٹھنڈک بخش رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا ننگے پاؤں بہت دور تک چلتی جائے۔
دونوں کندھوں پر پھیلائے اس کے دوپٹے کا ایک پلو نیچے جھول رہا تھا۔ مخالف سمت سے آنے والی نرم ہوا اس کے بالوں سے چھیڑ خانی کر کے گزر جاتی۔ وہ یونہی ہر چیز سے بے نیاز سینے پر بازو باندھے چلتی رہی۔
"ماہی!" اسے اپنے عقب میں اپنے نام کی پکار سنائی دی تھی۔ وہ نظر انداز کر کے چلتی رہی۔
"ماہی! پلیز رکو" اس نے بھاگ کر درمیانی فاصلہ طے کیا تھا اور مزید دو چار قدم آگے چل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
"ماہی! میری بات سنو پلیز!" یوں بھاگنے سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔
"کون ہیں آپ؟ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔" وہ سپاٹ تاثرات لیے سرد لہجے میں کہتی آگے بڑھ گئی۔
"پلیز ماہی۔۔۔ اس طرح مت کرو۔ ایک بار میری بات تو سن لو اس کے بعد چاہے جو بھی۔۔۔"
"آپ کو میری بات سمجھ میں نہیں آرہی؟ میں نے کہا میں تمہیں جانتی، آپ کو پھر آپ کیوں بار بار میرے راستے میں آرہے ہیں۔" بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کا یہ روپ دیکھنا۔ زیاد نے دکھ سے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے کتنا بدل گئی تھی شاید سرتاپا۔ لیکن اس میں قصوروار تو وہی تھا۔ اس نے خوابوں کے جزیرے پر رہنے والی بہاروں کی شہزادی کو خزاں میں لا کھڑا کیا۔ قصور تو واقعی اسی کا تھا۔
"ماہی۔۔۔"
"کوئی حق نہیں ہے آپ کو یوں میرا نام لینے کا، سمجھے آپ؟" وہ چلا کر کہتی پلٹی اور بھاگنے کے سے انداز میں اس سے دور ہوتی گئی۔ زیاد وہیں کھڑا بے بسی سے اسے دور جاتا دیکھتا رہا۔
"میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں۔ ایک مختصر سی مدت کے لیے آنکھوں کے جھروکے میں سجنے والے کسی خواب کی طرح۔ اس نے جو چاہا وہ اسے مل گیا۔ اب وہ کیوں بار بار میری راہ میں آتا ہے؟ کچھ نہیں رہا میرے پاس۔ سب کچھ تو چھین لیا ہے۔ اس نے مجھ سے میرا سکون، میرا مان، میرا اعتبار اور۔۔۔ اور میری محبت! اس نے کتنا مفلس کر دیا ہے مجھے۔" وہ گھٹنوں میں سر دیے بے آواز روتی گئی۔
رونا اس وقت نہیں آتا جب آپ کسی کو یاد کرتے ہیں۔ بلکہ رونا تو اس وقت آتا ہے جب آپ کسی کو بھول جانا چاہیں، پھر بھی وہ یاد آئے۔ وہ ساری باتیں، سارے مناظر جنہیں بھولنے کے جتن میں وہ خود کو ہلکان کرتی دوسرے ہی پل تمام تر شدتوں کے ساتھ زندہ ہو جاتے۔
سیٹھ اکرام نے خود کو بچانے کے لیے اپنا تمام تر اثر و رسوخ استعمال کیا تھا۔ قانون کے ہاتھ لمبے سہی پر قانون شکنی کرنے والوں کے تعلقات کچھ کم نہیں ہوتے۔ آج اسی سلسلے میں اس کی گردیزی کے ساتھ اپنے کسی خاص دوست کے ہاں میٹنگ تھی۔ وہ حیدر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے لاکھ کترانے

اور جھنجلانے کے باوجود۔ وہ آہستہ آہستہ حیدر کو اپنے بزنس سیٹ اپ کے بارے میں بریف کرتا رہتا۔ تاکہ وہ ہر قسم کے کاروباری داؤ پیچ سے آگاہ ہو کہ کل کو اسی نے سب کچھ سنبھالنا تھا۔

"بی بی۔۔۔ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" وہ جھولے پر بیٹھی مختلف سوچوں کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی لاشعوری طور پر کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔ چونک کر نذیراں کو دیکھنے لگی۔

"میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"تم ابھی تک کوارٹر نہیں گئیں؟" وہ جھولا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں بی بی! بڑے صاحب نے کہا تھا جب تک وہ واپس نہ آئیں۔ تب تک میں یہیں رکوں۔ آج ان کی کوئی ضروری میٹنگ تھی خدا معلوم کب واپسی ہو؟" دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی نذیراں نے مفصل جواب دیا تھا۔

"تم جاؤ اپنے کوارٹر۔۔۔ بچے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ویسے بھی تھوڑی دیر میں بنتو آجائے گی۔"

"پر بی بی۔۔۔" نذیراں متذبذب تھی۔

"میں نے کہا نا سب ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" اب کی بار وہ قطعی لہجے میں کہتی ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

سارے گھر پر اس وقت خاموشی کا راج تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ جو دروازے کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر ایک دم پلٹا۔

"آپ۔۔۔؟" ماہی کے لبوں سے بے اختیار پھسلا تھا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ دبے دبے انداز میں چلائی۔ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ زیاد نے سرعت سے آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔ ماہی ششدر رہ گئی۔

"جب تک تم میری بات نہیں سنو گی۔ میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔" اس نے گرفت مزید سخت کر دی۔

"چھوڑیں میرا بازو۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔"

"تم جانتی ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ آپ جیسے لوگ اپنا کام نکلوانے کے لیے وقت، لوگوں اور حالات کو بدلنے میں دیر نہیں کرتے۔" ترشی سے کہتے آخر میں اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ نمکین پانی سے بھرے نین کٹورے چھلکنے کو بے تاب ہوئے۔

"اس وقت تمہارا جو کرنے کو دل چاہ رہا ہے وہ کرو۔" زیاد نے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا اور ماہی خود پر اختیار کھوتی اس کے بازو سے سر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا؟ کیا گناہ تھا میرا آپ سے محبت کرنا۔ آپ پہ بھروسا کرنا؟ اتنا بڑا گناہ تو نہیں تھا میرا جس کی آپ نے اتنی بڑی سزا دی مجھے۔" کافی دیر رونے کے بعد اسے احساس ہوا تو خود ہی اس کا بازو چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دل میں اپنی بے اختیاری کو کوستی دانستہ قدرے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ زیاد اس کے آنسوؤں سے بھیگی اپنی آستین دیکھ کر مسکرا دیا۔

"میں نے آپ کو اپنا سب کچھ جان کر اپنی زندگی کا ہر اک لمحہ آپ کے نام کر دیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں چھپایا تھا اور آپ نے ایک بار کہا۔ میرا نام زیاد ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ اور پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ آپ کا نام زیاد ہے۔" وہ اب اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔

"جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا۔ اس کے بدلے اگر تم ساری زندگی بھی مجھے باتیں سناتی رہو۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔ لیکن پلیز ایک بار مجھے وضاحت کا موقع تو دو۔" ماہی خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ سچ ہے کہ سیٹھ اکرام تک پہنچنے کے لیے میں نے جس سیڑھی کا انتخاب کیا وہ تم تھیں۔ سیٹھ اکرام کی بھانجی ماہین خان! تب تم میرے لیے صرف سیٹھ اکرام کی بھانجی ہی تھیں۔ تمہارے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر کے میں نے سب کچھ پلان کر لیا تھا۔ میرا تم سے ٹکرانا صرف تم سے شناسائی حاصل کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ شناسائی سے دوستی اور دوستی سے محبت کا ڈرامہ! یہ سب میری پلاننگ میں شامل تھا۔ لیکن تم میری توقع سے بھی زیادہ معصوم نکلیں۔ تمہاری بے نیازی اور معصومیت نے بہت جلد میرا سارا کام آسان کر دیا۔ لیکن تب مجھے احساس ہوا کہ میری پلاننگ میں کوئی جھول آگیا ہے۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ کئی دن اسی ادھیڑبن میں گزر گئے۔ اپنے مقصد تک تو میں بہت جلدی پہنچ گیا تھا۔ لیکن میں ابھی یہ سب جاری رکھنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ تب ہی مجھے اپنی پلاننگ کا جھول سمجھ آگیا۔

سیٹھ اکرام کی بھانجی ماہین خان سے محبت کا ڈرامہ کرتے کرتے نہ جانے کب مجھے اس معصوم دل موہ لینے والی ماہی سے محبت ہو گئی۔ جنون کی سرحدوں کو چھوتی بے پایاں محبت! جس کے بغیر رہنے کا میں تصور ہی نہیں کر سکتا۔ بہت جلد مجھ پر منکشف ہوا کہ تم سے دستبرداری مجھے کسی طور گوارا نہیں۔ اگرچہ یہ سب میرے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔ میں تمہیں اعتماد میں لے کر یہ سب بتانا چاہتا تھا۔ لیکن عین وقت پر نہ جانے کیسے تمہارے ماما جی کو اس سب کی خبر ہو گئی اور۔۔۔"

ماہی جو ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بغور اس کا لفظ لفظ سن رہی تھی چونک گئی۔ پھر قدرے نروٹھے انداز میں کہنے لگی۔

"میں یہ کیسے مان لوں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہی سچ ہے؟"

"ایک بار اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرو خود ہی جواب مل جائے گا۔" اور اسے جواب مل گیا تھا۔ دل سے بڑھ کر کون سی گواہی معتبر ہو سکتی ہے؟

"لیکن زیاد! میرے ماما جی مجرم نہیں ہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو کئی سال پہلے عمار ہمدانی نے انہیں۔"

"تم واقعی بہت معصوم ہو۔" زیاد ہلکے سے مسکرایا تھا۔

"کاش میرے بس میں ہوتا تو تمہیں اس ننگی تلوار جیسی بے رحم حقیقت سے بچا لیتا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ برائی ایک دن خود ہی اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔"

"کیا اب بھی ایسا کچھ ہے، جو میں نہیں جانتی؟"

"بعض اوقات بے خبری کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔"

"لیکن اب میں مزید بے خبر نہیں رہنا چاہتی۔" وہ

ایک دم کچھ بے چین سی ہوگئی تھی۔ زیاد گہری سانس کھینچتا سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"زیاد۔۔۔"

"تم جانتی ہو تمہارے پیرنٹس کی ڈیتھ کیسے ہوئی تھی؟" زیاد کو لگا اب مزید چھپانا بے کار ہوگا۔

"ان کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔"

"اور یہ تمہیں یقیناً" تمہارے ماما جی نے بتایا ہوگا؟"

"ہاں۔۔۔"

"وہ صرف ایک ایکسیڈنٹ نہیں تھا۔ بلکہ۔۔۔ بلکہ تمہارے ماما جی کے کہنے پر۔۔۔" ماہی سانس نہیں لے سکی تھی۔

"تمہارے پاپا اکلوتے تھے اور ایک مشہور بزنس ٹائیکون! تب تمہارے ماما جی کے معاشی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ وہ روزگار کے سلسلے میں اپنی بہن یعنی تمہاری ماما کے پاس آگئے تھے۔ وہ شروع ہی سے چھوٹے موٹے غیر قانونی کاموں میں ملوث رہے تھے۔"

پھر ایک دن انہیں ڈرگز اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ اگرچہ بعد میں تمہارے پاپا کی کوششوں سے وہ رہا تو ہوگئے تھے۔ لیکن ڈھیر سارا پیسہ کمانے کی ہوس اور زعم نے انہیں کچھ یوں اندھا کیا کہ اچھے برے کی تمیز باقی نہ رہی۔ تمہارے پیرنٹس کے سمجھانے، دھمکانے کے باوجود جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو انہوں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ باز وہ پھر بھی نہیں آئے تھے۔ بلکہ ان کے شاطر ذہن نے انہیں ایک اور راہ سجھائی اور انہوں نے اپنے بہن، بہنوئی کو راستے سے ہٹا کر ایک تیر سے دو شکار کرلینے چاہے۔ ایک طرف تمہیں اپنی تحویل میں لے کر ان کی ساری جائیداد، بزنس، بنگلہ اور گاڑیوں وغیرہ پر قبضہ جمالیتے اور دوسری طرف ان کے جرم کے عینی گواہ بھی مٹ جاتے۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہ سب کچھ نہ تو انہیں وراثت میں ملا ہے اور نہ ہی انہوں نے اپنی محنت کے بل پر حاصل کیا۔ بلکہ یہ سب تمہارے پاپا۔۔۔"

ماہی کو لگا اس کا دل بند ہوجائے گا۔ وہ کیسے مان لیتی یہ سب۔۔۔ اگر یہ سچ بھی ہے تو آسمان کیوں نہیں کانپا، زمین کیوں نہیں پھٹی۔ اب تک تو سب کچھ ملیٹ ہوجانا چاہیے تھا۔ اچانک باہر کچھ نامانوس سا شور بلند ہوا اور دھاڑ سے دروازہ کھلا اور دونوں اپنی جگہ چونک گئے۔

"تم۔۔۔؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی؟" ماما جی غضب ناک ہوکر زیاد کی جانب بڑھے تھے۔ جبکہ حیدر وہیں دروازے کے بیچ و بیچ کھڑا رہا۔

"کچھ حساب رہتا تھا میرا تمہاری طرف، وہی پورا کرنے آیا تھا۔" زیاد سینے پر بازو باندھے اطمینان سے گویا ہوا تھا۔

"کیسا حساب؟" ماما جی ٹھٹکے۔

"کچھ زیادہ نہیں بس ماہی کو یہ بتا رہا تھا کہ ماضی میں اس کے ماما جی کا کردار کیا رہا تھا؟ اور یہ کہ اس کے ماں، باپ کی حادثاتی موت کے پیچھے کیا وجہ کارفرما تھی؟" ماما جی کی نگاہیں بلا ارادہ ماہی کی جانب اٹھی تھیں۔ اس کے چہرے پر لکھے لاتعداد سوال ان سے جواب کے منتظر تھے۔

"ماما جی۔۔۔!" اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ زیاد نے اسے جو کچھ بتایا تھا وہ ان سے اس سب کی تردید کروانا چاہتی تھی۔

لیکن ماما جی تمام مصلحت بالائے طاق رکھ کر بیخ پا ہوگئے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ماہی زیاد کی باتوں پر یقین کرنے سے اب بھی گریزاں ہے اور ان سے اس سب کی تردید چاہتی ہے۔ شدید غصے نے ان کی ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والی صلاحیت کو اس وقت مفلوج کردیا تھا۔ تب ہی آپے سے باہر ہوتے ہوئے زور سے چلائے تھے۔

"تو یہ تمہیں سب کچھ بتا چکا ہے؟ ٹھیک! مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد اس قتل کیس کی فائل منوں گرد تلے دب چکی ہے۔ پولیس کبھی بھی اس کے اصل مجرم تک نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ مجرم نے کوئی ثبوت چھوڑا ہی نہیں تھا۔" وہ سفاکی سے ہنسے تھے۔

"ہاں یہ سچ ہے۔ میں اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا، چاہے وہ رکاوٹ میری سگی بہن ہو یا بہنوئی۔" ماہی کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پہلو میں گرائے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

"اور تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بلکہ کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، سن لیا تم نے؟" انہیں دیکھ کر یوں لگتا گویا وہ اپنا دماغی توازن کھو رہے ہوں۔

اسی وقت ادھ کھلا دروازہ پوری طرح کھول کر دو پولیس اہلکار اندر داخل ہوگئے تھے۔

"مسٹر اکرام! آپ کو ڈرگز اسمگلنگ اور بیس سال پہلے اپنے بہن، بہنوئی کے قتل کے حالیہ اقبال جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔" ڈی ایس پی وحید لغاری نے ہتھکڑی ان کے سامنے کی تھی پیشانی پر پھوٹتی پسینے کی ننھی منی بوندوں کو پونچھتا وہ کپکپاتے ہاتھوں سے کوئی نمبر ملانے لگے۔

"کسے فون کر رہے ہو گردیزی کو؟ جو پہلے ہی اپنی گرفتاری پیش کرچکا ہے۔" ان کا ہاتھ پہلو میں گر گیا تھا۔ ساری کوششیں، ساری مزاحمت اکارت گئی تھی۔

"دیکھ لوں گا ایک ایک کو دیکھ لوں گا میں۔" ہتھکڑی میں بندھے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے وہ عجیب جنونی لہجے میں بولے۔

"حیدر! میرے بچے۔۔۔ تم سب سنبھال لوگے نا؟" جاتے جاتے بھی وہ گردن موڑے آس بھری نگاہوں سے حیدر کو دیکھے گئے۔

"جسے آپ سنبھالنا کہتے ہیں ڈیڈ! افسوس کہ میں نہیں کرسکتا۔ آئی ایم سوری۔" حیدر نے شکستگی سے کہہ کر سر ہلایا تھا۔ ماہی بے دم ہوکر صوفے پر گر سی گئی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھے سسکیاں روکنے کی سعی کرنے لگی۔

"ماہی!" حیدر گھٹنوں کے بل قالین پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"وہ تمام عیش و عشرت وہ سارا پیسہ جو میں اپنا حق سمجھ کر لٹاتا رہا۔ درحقیقت میرا نہیں بلکہ۔۔۔ آئی ایم سوری فار ایوری تھنگ۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آواز لرز رہی تھی۔ وہ بھی تو آج اپنے باپ کے اصل چہرے سے آشنا ہوا تھا۔

"ڈیڈ نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ ناقابل تلافی ہے۔ معذرت کا کوئی لفظ، شرمندگی کا کوئی اظہار تمہاری محرومی تمہاری حق تلفی کا مداوا نہیں کرسکتا۔" اس کی ذات پر چھایا خود غرضی اور بے حسی کا خول چٹخ گیا تھا۔ کچھ حادثے بھلے انسان سے سب کچھ چھین لیتے ہیں، پر انسان کو انسان ضرور بنادیتے ہیں۔

"دوسروں کی ذات اور ان سے وابستہ ہر اک چیز پر زبردستی تسلط جمانے کی عادت شاید مجھے ورثے میں ملی ہے۔ کاش کہ نہ ملی ہوتی۔" اس نے آنسوؤں سے تر اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تھا اور گردن موڑ کر کونے میں کھڑے زیاد کو دیکھا۔

بعض اوقات بہت تیز روشنی بھی انسان کو اندھا بنا دیتی ہے اور پھر گھپ اندھیرے کے بعد روشنی کی ہلکی سی کرن امید کا دیا روشن کردیتی ہے۔ جس سے ایک کے بعد ایک سارے دیے جل اٹھتے ہیں۔ اس نے ماہی کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا اور دوسرا بازو زیاد کے کندھے پر پھیلائے مان بھرے اعتماد سے بولا۔

"تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔ بیچ میں آئے "تیسرے سرپھرے" کو راستہ بھولا مسافر سمجھ کر منزل کا پتا دوگے نا؟" زیاد نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا اور ماہی بھیگی پلکوں سے مسکرا دی۔ کچھ کھونے، لیکن بہت کچھ پالینے والے احساس سے مہکتی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ۔

☆ ☆

رفاقت جاوید

حلیمہ پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر جھانکنے لگیں۔ گرمی کی شدت دھوپ کی جلا دینے والی تمازت محسوس کرتے ہوئے آسمان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بڑبڑائیں۔

"ہائے ہائے بادل کا نام و نشان نہیں۔ نجانے یہاں کے موسم میں دوزخ کی جھلک کیونکر عود کر آئی ہے۔ مارگلہ ہلز کے پڑوس میں آباد یہ شہر بھی ہمارے اپنے ہی گناہوں کی نذر ہو گیا کتنے افسوس کی بات ہے۔" وہ دکھ سے بڑبڑاتی ہوئی واش روم کی طرف چل دیں۔

وہ وضو کر کے جائے نماز پر کھڑی ہی ہوئی تھیں کہ ساجد نے حیرت و تجسس سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ کون سا وقت ہے نماز کا۔ ویسے عورت کی نماز کی ادائیگی میں اس کی مرضی شامل ہوتی ہے کبھی تو طویل سے طویل تر تو کبھی نہایت مختصر اور کبھی بے وقت۔"

"نفلی نماز کسی وقت کی پابند نہیں ہوتی؟" وہ سنجیدگی سے بولیں۔ "بارش کی بھیک مانگنے جا رہی ہوں باری تعالیٰ کے حضور۔ آپ بھی دعا کیجیے موسم کے خوشگوار ہونے کی۔ اس جھلسا دینے والی گرمی میں نہ باہر نکلے چین نہ گھر بیٹھے سکون۔ طبیعت میں خلجان کی سی کیفیت ہے۔"

"یہ تو ہے سب ہی دعا گو ہیں۔ سبھی منہ اٹھائے آسمان پر بادلوں کی تلاش میں ہیں۔" وہ بظاہر مسکرا کر بولے۔

"لگتا ہے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں موسم کی خوشگواری کی دعا بھی شامل ہے۔ بیگم جو دل میں لالچ بسائے الٹی سیدھی ہو رہی ہو وہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اللہ بہتر ہی کرے گا۔"

"اتنی طویل مدت کی قربت کے کچھ فوائد اور کچھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ آپ مجھے خوب سمجھے کیا کروں واجبی شکل و صورت کی بچی وبال جان سے کم نہیں ہوتی۔ بیٹی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ آخری بار بمشکل بیٹی کو منایا ہے اس رشتے کے لیے اللہ کرے کامیابی ہو جائے۔ بس اپنی اس آخری کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گی۔ گرد و پیش کے ماحول کا دوسروں کے مزاج پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ دیکھیے گا اس بار ہماری بیٹی رشتہ مسترد نہیں کرے گی۔ اللہ کرے ان لوگوں کو ہم سے ملنے اور رشتہ جوڑنے کا پچھتاوا نہ ہو۔ آپ دیکھیے گا کہ دوستی سے رشتہ داری کا تعلق اٹوٹ ہو جائے گا۔ سوچ مثبت ہو تو تاریکی میں بھی روشنی کا گمان ہوتا ہے مجھے بھلے کی امید ہے۔"

حلیمہ کا لہجہ امید و بیم سے کبھی دھیما پڑتا کبھی تیزی آجاتی۔

"حوصلہ رکھو یار! جن حالات پر ہمارا اختیار نہیں۔ ان کے لیے پریشان ہونا یا پیچھے بھاگنا سراسر حماقت ہے۔ تم بہت ٹینس لگ رہی ہو۔ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھو۔ پھر کاہے کی پریشانی۔" ساجد نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "نہ موسم پر اختیار نہ ہی مہمان کے موڈ پر کنٹرول اور نہ ہی عیشہ کے رشتے پر۔ اتنی گہرائی میں مت سوچو۔"

"بات تو درست ہے۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر اپنی جبلت پر بھی ہمارا اختیار نہیں ہے نا۔ میں طبع" ہی ایسی ہوں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"ہمارے گھر میں ہر وقت مہمانوں کی بہتات رہی ہے' آج تک ایسا رد عمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ ان دیکھا مہمان خاصی اہمیت کا حامل لگتا ہے۔ یہ رشتہ دوستی تک ہی محدود رہتا تو بہتر نہیں تھا کیا؟ عیشہ کے مزاج کو تم جانتی تو ہو تمہاری دوستی بھی جائے گی۔ انسانوں سے امیدیں وابستہ رکھنے والے زندگی میں ہمیشہ گھاٹے میں ہی رہتے ہیں۔ اللہ سے لو لگا کر دیکھو۔"

"ارے میاں مت بھولیے۔ عمر کے اس حصے میں کی جانے والی دوستیاں بڑی سچی اور کھری ہوتی ہیں کیونکہ ہم میں بیماریاں' پریشانیاں اور اکیلے پن کا کرب ایک جیسا ہوتا ہے ایام جوانی کے ان گنت دوست یار جو زندگی کے سفر میں ہمراہ تھے کہاں چلے گئے۔ اپنی باری پر سبھی اپنے اپنے اسٹیشن پر اتر گئے۔ آہ یہ

ریٹائرمنٹ بھی کیسا دکھ ہے؟ فقط دوستوں کی جدائی، تنہائی اور یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ اب اس درد میں رہ کر زندگی گزارنا تو ناشکری ہے۔ میری یہ دوست بالکل ویسی ہی خوبیوں کی مالک ہے جیسی میں خواہش رکھتی تھی۔ ایسے نیک پرور، مخلص اور مربی لوگوں کی قربت میں گردو پیش کا ماحول ہی بدل جاتا ہے۔ انسانی فطرت تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر عیشہ ایسی حسن اخلاقیات سے بھرپور خاتون کی بہو بن جاتی ہے تو یہ ہماری عزت افزائی ہوگی۔ ساجد! دعا کریں کہ ہم اس آخری ذمہ داری سے خوش اسلوبی سے سبک دوش ہوجائیں۔ بس عیشہ کا دماغ درست رہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہی رنگ میں بھنگ ڈال دے۔" وہ سنجیدگی سے بول رہی تھیں۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری مراد پوری کرے۔ لیکن یہ یاد رکھنا لوگوں کے ظاہر اور باطن میں بہت تضاد ہوتا ہے۔ بعض اوقات خوش نمائی کے پس پردہ بھیانک اور خوفناک روپ ہوتے ہیں۔" وہ بھی سنجیدگی سے بولے۔

"سب جانتی ہوں بڑے میاں۔ کچھ سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھایا ہے۔ کامیابی ہوگئی تو واہ بھلا ورنہ دوستی تو ہے ہی نا۔"

"حلیمہ! کیا شادی ہی ہر غم کا مداوا ہے۔ عیشہ پر زبردستی، زور آوری کا میں ہرگز قائل نہیں ہوں۔ تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔" وہ ناگواری سے بولے۔

"یہ سب آپ کی شہ ہے اسے۔ خدا کے لیے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں اپنی زبان پر قابو ہی رکھیے گا۔" وہ تلملا کر بولیں۔ "ماں ہوں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ کاش میری پریشانیوں کو آپ محسوس کرسکتے۔ یہ زندگی مرد کے بغیر گزر سکتی تا تو میں بھی شادی کے جھمیلوں میں نہ پڑتی۔ نوکری کرتی چاہے پرائمری اسکول کی ہی ہوتی۔"

"تم زیادہ ہی سیریس ہوگئی ہو۔ تم فکر نہ کرو ابھی اسے میں بھی سمجھائے دیتا ہوں کہ مین میخ نکالنے سے وہ بھی باز رہے۔ ہاں تو بیگم میرے لیے کیا حکم ہے تمام کارروائی میں کیا مدد کرسکتا ہوں تمہاری۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"ڈائننگ روم میں اے سی لگوا دیجیے۔ آپ کی سستی کی وجہ سے اسٹور میں پڑے پڑے خراب ہوگیا ہوگا۔ قسم سے آپ جیسا سست اور سہل پسند خاوند کسی کا نہ ہو نجانے یہ گھر کیسے بنوا دیا؟ معجزہ ہی رونما ہوا ہے۔" انہوں نے اپنی دیرینہ ضرورت کا فوراً" اظہار کیا۔

"ہاں آخر تم اپنے مہمان کو ایک کھانا تو گھر پر کھلاؤ گی۔ ڈائننگ روم کا ٹمپریچر درست ہونا چاہیے۔ ورنہ بیگم کا ٹمپریچر ناقابل برداشت ہوجائے گا۔ میں آج ہی الیکٹریشن کو بلاتا ہوں تم فکر نہ کرو۔" وہ اپنی ترنگ میں بولے۔

"اور کوئی حکم ہو تو فرمایئے بیگم صاحب جی۔"

"آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ جاؤ جاکر برتن دھو لو باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ اتنے سالوں کے پرانے ملازم ہونے کی وجہ سے سر پر چڑھ گئے ہو۔ اتارنا مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے سنا ہے تم نے۔" حلیمہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تو دونوں قہقہہ لگا اٹھے۔

"اب مجھے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا، اتنا دنیا کے کاموں میں لگا دیا۔" کہہ کر وہ دوبارہ واش روم چلی گئیں۔

گھر میں ہفتہ صفائی منایا جارہا تھا جبکہ دو ہفتے پہلے سے انہوں نے اس عمل میں نوکروں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ سب ناک منہ چڑھائے گھر کا کونا کونا چمکا رہے تھے۔ حلیمہ خود الماریوں میں منہ دیے ترتیب و تزئین سے لٹکے ہوئے ڈریسز اور تہ شدہ کپڑوں میں خوامخواہ الجھی ہوئی اپنا وقت اور انرجی ضائع کررہی تھیں۔ کچن کی باری آئی تو برتنوں کا شور شرابا شروع ہوگیا۔ الماریوں کی سیٹنگ، فریج اور فریزر کی صفائی غرضیکہ ہر کونا صاف کیا گیا۔ لان کے ایک ایک پودے کی صفائی، ستھرائی اور کٹنگ کا کام حلیمہ علی الصبح خود سر انجام دینے لگیں اور مالی کے لیے گملے رنگنے اور انہیں سلیقے سے سیٹ کرنے کی ہدایات پر گھنٹوں صرف کردیتیں۔ میاں یہ دیکھ کر شاداں و فرحاں تھے کہ وہ اس پراجیکٹ میں مصروف رہ کر خاصی خوش و مطمئن نظر آرہی ہیں۔ بہت دنوں سے بوریت کا لفظ ان کی زبان پر نہ آیا تھا رشتہ طے ہو نہ ہو۔ دوستی تو قائم دائم رہنے کے چانسز نظر آرہے تھے۔

"حلیمہ کیا تمہارا مہمان تمہارے سلیقے و قرینے کا امتحان لینے آرہا ہے جو اپنی اور ان مظلوموں کی جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے۔" انہوں نے چھیڑا وہ ان کی جلی کٹی باتیں سن کر محظوظ ہونا چاہ رہے تھے۔

"آپ تو خوامخواہ ہی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ہائے ذرا یہ کندھا تو دبا دیں درد ہونے لگا ہے تھک کر چور ہوگئی ہوں۔" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے بولیں۔ "ویسے آپس کی بات ہے اتنی محنت و مشقت کی ضرورت تو نہیں تھی۔ مہمان ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم سے آگے کہیں نہیں جاتا۔" وہ پیار سے ان کا کندھا دباتے ہوئے بولے۔

"بے شک نہ جائے آخر سلیقہ طریقہ بھی کوئی چیز ہے۔" وہ رسان سے بولیں۔ "بس اے سی لگوانا مت بھولیے گا ورنہ خفا ہوجاؤں گی۔"

"عورتیں اس عمر میں ایک ہی بات کو بار بار کیوں دہراتی ہیں؟ لگتا ہے انہیں خود پر اختیار نہیں رہتا۔ زبان بے قابو اور قینچی کی طرح تیز ہوجاتی ہے اور حد درجے کی شکی اور خبطی ہوجاتی ہیں۔" وہ پھر چھیڑتے ہوئے بولے۔

"آپ کو اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہے۔ میں آپ کی کون سی خامی گنواؤں ایک ہو تو بات بنے۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"یار میری باتوں پر ناراض نہ ہوا کرو۔ جاؤ سیڑھیوں کے نیچے والا اسٹور صاف کروالو۔ بے چارا تمہاری راہ تک رہا ہوگا۔ آخر اس کی انسپکشن ہونے کو ہے۔" شوہر نے شوخ انداز میں کہا تو وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں اور نپے تلے قدموں سے بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"کبھی جو تعریف کی ہو، ہنستے مسکراتے جوتیاں لگانا کوئی ان سے سیکھے۔"

☆ ☆ ☆

"ذرا میرا موبائل تو مجھے پکڑا دیں۔ کب سے بیل بجے جارہی ہے، اٹھا لینے میں آپ کی شان میں فرق نہیں آجائے گا۔" وہ دور سے باآواز بلند بولیں۔

"ریٹائر کیا ہوا ہوں۔ بیوی نے پی اے کی جاب پر بغیر تنخواہ کے بھرتی کرلیا ہے۔ سچ ہی کہا تھا دوستوں نے کہ اپنا رعب و دبدبہ اسی بریف کیس میں محفوظ کرکے بیوی کے مدمقابل جانا اور پھر کبھی اس بریف کیس کو کھولنے کی ہمت نہ کرنا ورنہ گھر کے دروازے تم پر بند ہوجائیں گے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے موبائل انہیں دے کر بولے۔

حلیمہ ان کی بات کی طرف توجہ دیے بغیر فون پر بات کرنے لگیں۔ لہجے میں بلا کی حلاوت تھی انہیں انداز گفتگو سے علم ہوگیا کہ یہ ان کی نئی دوست مریم کا فون ہے۔ جو حلیمہ اتنی تھکن کے باوجود زبان میں چاشنی بھرنا نہیں بھولی تھیں۔

"کس کا فون تھا؟" انہوں نے انجان بن کر پوچھا۔

"میرے مہمان کا وہ دونوں کل رات کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔ بھائی کی شادی اٹینڈ کرنے کے بعد میرے غریب خانے پر تشریف لائیں گے۔ میں نے انہیں لنچ کے لیے انوائٹ کرلیا ہے۔" لہجے میں خوشی تھی۔ "اور چھوٹا بیچلر بیٹا بھی ساتھ ہی ہوگا بس دعا کریں کہ کام بن جائے۔"

"میری مانو تو اگلی ہی صبح تم ملاقات کا شرف حاصل کرلو۔ آخر چھ مہینے ہوگئے تم نے فقط آواز پر گزارا کیا ہے۔ اللہ خیر کرے یہ موبائل کی دوستی قابل اعتبار نہیں ہوتی۔" وہ ناقدانہ انداز میں بولے۔ "کل ہی تمہیں ان کے میکے لے چلوں گا۔ مل کر اندازہ لگالینا کہ خاندان کیسا ہے؟ فقط زبان کی مٹھاس پر تو ایسی امید میں رکھنا سراسر نادانی ہے۔ ویسے تم ہو تو بڑی گھاگ قسم کی

اڑتی چڑیا کے پر گن لو۔" ان کے لہجے میں فوراً ہی ملائمت آگئی۔

"ویسے آپ بھی کمال کی خصلتوں کے مالک ہیں۔ کبھی آسمان کی سیر تو اگلے ہی لمحے زمین کا اک معمولی سا ذرہ بنانے میں کیسی مہارت رکھتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولیں۔ اسی اثنا میں چھناکے کی دلسوز آواز پر حلیمہ بھاگنے کے انداز میں اٹھیں چمکتے ہوئے صاف ٹائلز والے فرش پر ان کا پاؤں پھسلا ہی تھا کہ میاں نے انہیں بانہوں میں بھر کر گرنے سے بچالیا۔

"اس عمر میں ہڈی ٹوٹ جائے تو انجام جانتی ہو نا خدا کے لیے ذرا دھیمی پڑ جاؤ۔" وہ فکر مندی سے بولے۔

"اب تمہاری عمر بھاگنے دوڑنے والی نہیں رہی۔"

"ہائے لگتا ہے میرا پیرس والا وہ گلدان کم بخت نوکر نے توڑ ڈالا ہے جسے میں بچے کی طرح دوپٹہ میں چھپا کر لائی تھی۔ اگر ایسا ستم ہوا تو اس نوکر کی ابھی سے چھٹی کیا یاد کرے گا۔" لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"شکر کرو تم گرنے سے بچ گئی ہو۔ ایک چھوڑ گھر کے تمام گلدان ٹوٹ جائیں مجھے کوئی پروا نہیں۔ نوکر کو نکالنے کی غلطی نہ کرنا برتن دھو دھو کر گھس جاؤ گی۔ نیا نوکر بلائے جان ہوتا ہے تم خود جانتی ہو ہمیشگی اور بقا نیلی چھت والے کی ہے یہ سب کچھ فنا ہونے والا ہے بمعہ تمہارے۔" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

"خبردار جو ایسی منحوس باتیں منہ سے نکالیں۔ اللہ میرے گھر کو اور اس کی ہر چیز کو سلامت رکھے۔ کان کھول کر سن لیں میاں۔ آج اے سی ہر صورت لگ کر رہے گا۔ اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" غیظ و غضب میں حلیمہ نے دیوار کے ساتھ سیڑھی لگائی اور ڈسٹر لے کر اپنی جوانی کی تصویر کو صاف کرنے لگیں۔ زبان بجلی کی رفتار سے چل رہی تھی۔ چہرے کا تناؤ طبیعت کی بدمزگی کی غمازی کر رہا تھا اس دوران وہ کئی بار سیڑھی پر لڑکھڑائی تھیں اور سنبھلی تھیں۔

نوکر اپنی ناقابل فراموش بے عزتی کرانے کے بعد کئی بار سیڑھی کے پاس سے کندھا مار کر گزرا تھا۔ آج اس نے اپنی بیگم صاحبہ کو گرانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ میاں اس کے ارادوں کو بھانپ کر اس کے قریب آکر سختی سے بولے۔ "تمہایت ناعاقبت اندیش ذات ہے یہ عورت جھگڑالو اور بے صبری۔ ان خصلتوں کے بغیر بالکل ہی نامکمل۔ فوراً" نیچے اترو اپنی عمر دیکھو اور یہ پھرتی اور تیزی ملاحظہ فرماؤ کیوں اپنے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو مجھ پر ہی رحم کھالو۔"

"آپ بات بات پر عمر کو درمیان میں کیوں لے آتے ہیں؟ جو بھی ہوں آپ سے دس سال چھوٹی ہوں ایسے تو اتنی چاق و چوبند نہیں ہوں جناب۔" وہ مجبوراً" ان کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترنے لگیں۔ "گھر میں گہما گہمی اور چہل پہل کا آپ کے موڈ پر رتی بھر اثر نہیں ہوا۔ جل ککڑ بنے بیٹھے ہیں۔ مجھے خوشی خوشی تیاری کرتا دیکھ کر آپ کا دل ٹھکانے ہی نہیں رہا۔ اے خدا کے بندے عمر کے ہر حصے میں حالات کی تبدیلی بہت اہم ہوتی ہے۔ ورنہ زندگی ساکت و جامد ہو جاتی ہے۔ یکسانیت بوریت کا دوسرا نام ہے۔ ذہنی اختراعات فرصت کی بیماری ہے اب اس گھر میں ایسی ایکٹوٹیز ہمیشہ جاری و ساری رہیں گی۔" وہ اپنی منطق جھاڑتے ہوئے بولیں۔

"اس لیے تو کئی بار التجا کر چکا ہوں کہ کسی بڑی تبدیلی کے وارد ہونے کا پروگرام بناتے ہیں۔ اس نئے مہمان کا کیا فائدہ؟ چند گھنٹے تمہارے ساتھ گزارنے کے بعد رخصت ہو جائے گا۔ بلکہ تم تو اپنے گھر کی اکلوتی رونق بھی اس کی آغوش میں بھرنے کو تیار رہو۔ ہم تو بالکل ہی اکیلے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جائیں گے۔"

"ایک آپ ہی تو ہیں جو میری سن لیتے ہیں۔ جنہیں پیدا کیا تھا وہ ہی بڑھاپے کا سہارا نہ بنے۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔ "وہ تو سب کے سب سسرال کے ہو گئے۔ ایک جو اللہ کی رحمت گھر میں موجود ہے اب اسے نکالنے کے چکر میں ہو۔ وہ شادی کے خلاف ہے تو یہ ہمارے حق میں بہت خوب ہے ہاں تم اجازت دو میں تمہارے دل بہلاوے کا انتظام کیے دیتا ہوں۔ یقین کرو میرے اس عہد پر حکمرانی تمہاری ہی رہے

گی۔ وہ تو محض انٹرٹینمنٹ ہو گی ہم دونوں کے لیے۔" وہ ہنسی دبائے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ مرجھائی ہوئی آنکھوں میں جوانی کی چمک اور شرارت ناچ رہی تھی۔

"نان سینس۔ اپنی شکل کبھی دیکھی ہے آئینے میں' گریبان میں جھانکا ہے۔ کبھی' چلے ہیں دوسری شادی کرنے۔ یہ مضحکہ خیز باتیں کرنے کا وقت نہیں نہ ہی چھیڑ خانیوں کی ضرورت ہے بڑھاپا آگیا شوخی نہ گئی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"اس میں میرا کیا فائدہ ہے بھلا؟ تمہارے جمود اور یکسانیت کے خاتمے کا انتظام کرنا چاہتا ہوں ایک تو بھلے کا زمانہ ہی نہیں۔" وہ دبی دبی مسکراہٹ میں بولے۔

وہ میاں کو غصے سے گھورتی باہر نکل گئیں۔ لیکن دل ہی دل میں میاں کی باتوں کو انجوائے بھی کیا کرتی تھیں انہی سے تو گھر میں رونق اور زندگی کی لہر دوڑا کرتی تھی۔ ان کی درازیٔ عمری کی دعائیں کرنے لگیں۔

گھر کا اچھی طرح جائزہ لے کر وہ خوش ہو گئیں۔ ان کا قرینہ اور سلیقہ بول رہا تھا۔ بیٹی اول جلول بنی ہر کام سے لاتعلق مووی دیکھنے میں مصروف تھی۔

"کام تو تمام نبٹا لیے ہیں میں نے۔ ذرا دیکھیے میرا گھر ماشاءاللہ' اللہ نظر بد سے بچائے۔ عیشہ بچے تم بھی اچھا سا تیار ہو جاؤ۔ آنٹی کو تپاک سے خوش آمدید کہنا۔ میری بہت پیاری دوست ہیں۔" وہ طمانیت سے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔

"میں آج تک تمہاری سائیکی نہیں سمجھ پایا۔ اتنا کچھ کرنا کیوں ضروری تھا؟ بالکل ہی ہانپ ہو جاتی ہو گھر کے معاملے میں مسجد بنا رکھا ہے اسے۔" وہ قدرے ہوشنگی سے بولے۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ دراصل آپ فطری طور پر کافی بے حس واقع ہوئے ہیں ذرا ذہن پر زور دیں۔ مسجد ہی جنت کے رستے کا تعین کرتی ہے جناب۔ ہاں تو اپنی بات کریں ابھی تک اے سی نہیں لگا۔ آپ کی سوچ میں میری ہر بات غیر ضروری اور بے وقعت ہے۔ اب مہربانی فرما کر لنچ کا انتظام کلب میں ہی

کرادیجیے۔ حد ہی تو کردی ہے آپ نے ریٹائر کیا ہوئے؟ بالکل ہی بے کار و بے مصرف ہو کر رہ گئے ہیں۔" ان کے لہجے میں مایوسی وناامیدی تھی اور طرہ یہ کہ مجھے بھی ہر وقت مصروف رہنے پر ٹوکتے رہتے ہیں۔"

"زندگی بھر بہت کام کیا ہے میں نے۔ اب میں کچھ کرنے والا نہیں ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"تم بھی میری اور عیشہ کی طرح زندگی کی حقیقت کو سمجھ جاؤ۔ بکھرتا ہے گھر تو پروانہ کرو۔"

"مطلب یہ کہ اے سی نہیں لگے گا۔" وہ بے کل سی ہو گئیں۔ "بہت عجیب و غریب انسان ہیں آپ۔ یہ عیشہ تو آپ پر پڑ گئی۔"

"جہاں اتنے سال اس کے بغیر بیت گئے ہیں وہاں کل کا دن بھی گزر ہی جائے گا۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولے۔

"فکر وفاقہ چھوڑو اور عیش کرو میری طرح۔ اپنی عمر کا ہی لحاظ کرو جوانی کی دوپہر گزر گئی اب تو شام ڈھلنے کو ہے ذرا سی مدھم پڑ جاؤ۔ صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"آپ سے کبھی نہیں بولوں گی عین ٹائم پر دھوکہ دیا ہے مجھے۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"میری دوست پہلی بار میرے گھر آرہی ہے۔ کیا سوچے گی کیا ان کے گھر کھانا نہیں پکتا۔ جو فرسٹ ٹائم ہی باہر لے کر چل پڑی ہیں کس قدر بدسلیقہ اور پھوہڑ گردانی جاؤں گی۔ ویسے آج کل تو کھانے کے لیے مشہور ریسٹورنٹ میں مدعو کرنا بھی فیشن بن گیا ہے۔ چلو پرانے لوگ نئی راہ پر چل نکلتے ہیں مجبوراً۔"

میاں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی۔ کیونکہ بات کی سچائی سے کیسے انکار کرسکتے تھے۔

حلیمہ طوعاً "کرہاً" ہی مریم کو باہر لے جانے کا سوچ کر خود کو تسلی دینے لگی تھیں۔

حلیمہ نے فون اٹھایا اور کل کے لنچ کی بکنگ کروا کر اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئیں۔

☼ ☼ ☼

سب کی پہلی ملاقات تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے حدودِ اربع سے بخوبی واقف تھیں۔ دونوں کے شوہروں کی بھی کچھ دلچسپیاں مشترکہ نکل آئیں مگر دونوں بچوں کے چہروں پر سخت ناگواری تھی۔ جسے حلیمہ نے محسوس تو کرلیا۔ دل بھی کچھ بجھ سا گیا تھا۔ اس دوران وہ یہی سوچتی رہیں کہ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ بچہ بھی ہینڈسم اور سلجھا ہوا۔ نجانے ہماری بیٹی شادی کرنے سے کیوں بھاگتی ہے۔ ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرکے انکار کر ڈالتی ہے۔ میں ہی پھر پچھلی تمام ناکامیوں کو فراموش کیے نئے جذبے سے کوشاں ہو جاتی ہوں۔ باپ بیٹی ایک ہی جیسے نکلے نادان اور احمق میری تو تمام محنت اکارت گئی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کم از کم نئے لوگوں سے دوستی تو ہوئی۔ زندگی میں نیا پن آجائے گا۔ کیا یہ کم ہے۔

یہ دوستی موبائل پر رانگ نمبر مل جانے کا کمال تھی دونوں موبائل کی ایجاد کو دعائیں دے رہے تھے اور ہمیشہ رابطے میں رہنے کے وعدے وعید ہو رہے تھے۔

کھانا تناول کرتے ہوئے میاں کے موبائل پر گھر کے ملازم کا فون آیا۔ حلیمہ کے کان بھی کھڑے ہوئے۔ وہ بے قراری سے میاں کو دیکھنے لگیں لیکن ان کا انداز بے حد نارمل تھا کسی قسم کے اندیشے کا امکان نہ تھا۔ لیکن حلیمہ کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔

سویٹ ڈش کھانے کے بعد حلیمہ نے چائے یا قہوہ گھر پر ہی پینے کی تجویز پیش کی تاکہ مریم کا کچھ وقت تو گھر پر گزر سکے باہر سے ہی پک کرنا کھانا کھلانا اور باہر ڈراپ کردینا غیر مناسب اور مہمان کی شان میں سراسر گستاخی لگی۔ دوسرا اپنا سلیقہ، رنگ ڈھنگ دکھانا بھی تو مقصود تھا۔ جو عورت کا حقیقی حسن و جمال سمجھا جاتا ہے پھر رشتے کی امید بھی تو تر و تازہ تھی۔ حلیمہ کے اصرار پر سب ہنسی خوشی گھر کی جانب چل پڑے۔ ساون موسم مہمان کی آمد پر ہی کافی خوشگوار ہو چکا تھا۔ ساون کی بارش نے خوب رنگ جما رکھا تھا۔ حلیمہ کی اس مخلصانہ دعا کی قبولیت کا وقت تھا کچھ اور بھی مانگ لیتیں۔"

دل میں ہی سوچ کر مسکرادیں۔

سچ مچ مہمان موسم انجوائے کررہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بڑے درخت اور چھوٹے پودے بارش میں نہا کر عجیب سماں پیش کررہے تھے۔ چاروں اطراف کا نکھرا اجلا ماحول سب کو دلی تقویت پہنچا رہا تھا۔ حلیمہ نے اپنے بیٹ مین کو فون کیا چائے کے برتن ٹرالی پر لگانے کی تلقین کی۔ چائے دم دینے کی ہدایت کے بعد چوکیدار سے بات کی کہ وہ گیٹ کھول دے تاکہ مہمان کو پل بھر کے لیے بھی گیٹ پر انتظار کی کوفت سے نہ گزرنا پڑے۔ امپریس کرنا بھی تو بہت لازم تھا۔

حلیمہ نے نہایت لگاوٹ اور تفاخر سے اپنے مہمان کا ہاتھ پکڑا اور پورچ سے مین دروازے کی جانب بڑھیں۔ آس پاس سجائے ہوئے خوبصورت پودے بارش سے مزید قابل دید لگ رہے تھے۔ مہمان نے ستائش نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ بس حلیمہ کو مہمان کی آمد کی عقیدت اور مسرت کے اظہار سے محنت کا اجر پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی مل گیا۔ مریم کے چہرے پر خوشی رقص کررہی تھی۔ بیٹے کے لیے یہ لوگ اور یہ گھر خاصا مناسب لگا تھا۔ انہوں نے جونہی مین ڈور سے اندر قدم رکھا تو حلیمہ کی دبی سی چیخ حیرت میں بدل گئی۔ وہ ہوا تھا جس کا — وہم و گمان نہ تھا۔

مین ڈور سے چند قدم کے فاصلے پر لکڑی کا بوسیدہ کریٹ جس پر مکڑی کے بے حساب جالوں کا بسیرا تھا مٹی سے آلودہ انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ کوریڈور کے تمام ہینڈ میڈ قالین بے ترتیبی سے الٹے سیدھے آگے پیچھے بکھرے ہوئے لنڈا بازار کے چیتھڑے لگ رہے تھے۔ کوریڈور میں سجائے ہوئے تمام ڈیکوریشن پیس اسٹڈی کے ننگے فرش پر نہایت بے دردی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ صوفے پر تشریف فرما تھے۔ اور فرنیچر پر دھول کی اک تہہ جمی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ گھر میدان کارزار کا سماں پیش کررہا تھا۔ وہ مہمان کو فراموش کیے منہ میں انگلی دبائے کلس کر رہ گئی تھیں کہ ملازم کی آواز پر چونکیں۔

"بیگم صاحبہ مبارک ہوا ہے سی لگ گیا۔ میں نے چائے کے برتن ٹرالی کے بجائے ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیے ہیں۔ ٹھنڈے کمرے میں ٹیبل پر چائے پینے کا اپنا ہی مزا ہے جی۔ آپ خوش ہو جائیں آپ کی دلی مراد تو پوری ہوئی۔" حلیمہ نے شعلہ بار نظروں سے میاں کو گھورا۔

"کریٹ باہر بھی تو کھل سکتا تھا عجیب سر پھرا نوکر ہے کہ ذرا سے کام کے لیے گھر بکھیر کر رکھ دیا۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولیں تو وہ دوسری طرف منہ کرکے ہنسی دباتے ہوئے مہمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جہاندیدہ اور عقابی نگاہ رکھنے والی خاتون حسب حال ظہور پذیر ہونے والے اس حادثے کو نظر انداز کیے حلیمہ کا ہاتھ تھامے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

"حلیمہ! مجھے آپ اور آپ کا گھر بہت پسند آئے۔ آج کے اس نفسانفسی کے دور میں خاص کر عمر کے اس حصے میں ایسے پرخلوص اور بغیر طمع ولالچ کے ملنے والے لوگ نایاب ہو گئے ہیں۔ میں بہت امپریس ہوئی ہوں۔ آپ سے ایک التجا کرتی ہوں غور ضرور فرمایئے گا۔"

"مریم آپ فرمائیں تو۔" حلیمہ نے تجسس سے کہا۔

"مجھے آپ سے رشتہ داری بنانی ہے۔" وہ جھجک کر بولیں۔

"میں سمجھی نہیں۔" وہ تمام مدعا سمجھ کر انجان سی ہو کر بولیں۔

"مجھے آپ کی بیٹی عیشہ کا ہاتھ چاہیے۔ آپ جانتی تو ہیں کہ میرا بیٹا امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے۔ شادی والدین کی پسند سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ان خیالات کی بنیاد پر آپ اس کی شرافت کا بھروسہ کرسکتی ہیں۔ بہت نیک خصلت سچا اور کھرا بچہ ہے۔ کیا مجال کہ کبھی فریب و دھوکہ دیا ہو کسی کو۔ دو حج اور کئی عمرے کرچکا ہے۔" وہ شیریں لہجے میں بولیں۔

"آپ کو دیکھ لیا تو سمجھیں کہ بیٹے کو پرکھ لیا۔" وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر بولیں۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔
ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"تھینک یو حلیمہ اچھے اور نیک کام کی شروعات تو ہوئی نا۔ عموماً "بیٹی ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔" وہ بھی مسرت آگیں لہجے میں بولیں۔

"تھینک یو سوچ میں تو آپ کی عقلمندانہ باتوں سے ہی متاثر ہو چکی تھی۔ آپ جیسے کھرے لوگ اب کہاں تب ہی میں سوچوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیونکر ملا دیا ہے۔ میں اتنی بے قرار کیوں ہوں آپ سے ملنے کے لیے۔ آپ کی باتوں میں تو جادو ہے اور آج کی ملاقات میں بے پناہ خوشی' نیک لوگوں کی قربت کا اپنا ہی فسوں ہوتا ہے۔ ایسی ہی دوستیاں دل کو اطمینان بخشتی ہیں۔" وہ کیف آگیں لہجے میں بولیں۔

"بھئی خواتین میں کیا گفت و شنید چل رہی ہے؟ وہ بھی سرگوشیوں اور راز داری میں۔" ساجد نے مشکوک لہجے میں کہا۔ مگر خواتین نے ان کی بات پر دھیان دیئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

"آپ کے بیٹے کو تو اعتراض نہیں۔ میں ابھی اور اسی وقت عیشہ سے بات کر کے اس کے خیالات کے بارے میں معلوم کر لیتی ہوں۔" حلیمہ نے نہایت ملائمت سے کہا اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئیں۔ آنکھوں میں وحشت کے ساتھ مایوسی بھی تھی۔ اپنے اندرونی جذبات پر قابو پاتے ہوئے قدرے بے صبرے پن سے بولیں۔

"چائے تیار ہے ڈائننگ روم میں ہی چل کر بیٹھتے ہیں۔ گپ شپ بھی رہے گی چائے بھی چلے گی۔"

"جی ہاں کیوں نہیں۔" مریم مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئیں اور سب چائے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔

حلیمہ بمشکل چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچ میں پڑ گئیں اور بیٹی کے الفاظ ان کی سماعتوں میں زہر گھولنے لگے۔

"ممی آپ جس لڑکے کی بات کر رہی ہیں۔ یہ ہماری یونیورسٹی سے تین مہینے بعد ہی نکال دیا گیا تھا۔ کیونکہ جناب کی ڈگری سراسر جعلی نکلی تھی۔ اس نے سب کو خوب بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے تو آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ اس کی بولتی بند تھی اور میں تو ویسے ہی بے زار ہو گئی تھی اس کی شکل دیکھ کر ظاہری چمک دمک اور شیریں زبان سے امپریس ہونا چھوڑ دیں۔ ممی اب آپ کو سمجھ آجانی چاہیے کہ میں شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی' لڑکی کا رشتہ مانگنے سے لے کر اسے گھر لے جانے تک کا تمام دورانیہ سراسر ایکٹنگ پر مبنی ہوتا ہے۔ سب بہروپیے ہیں ممی۔ آپ نے اپنی زندگی کے کھرے تجربوں سے بھی کچھ نہ سیکھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ کا جو دوستی کا رشتہ استوار ہوا ہے ایک دوسرے کو جانے' سمجھنے اور پرکھنے کے بغیر اسے نباہ لیں وہی کافی ہے اور آئندہ کے لیے میری شادی کا کبھی خواب میں بھی مت سوچیے گا۔ میری زندگی بہت پر سکون اور فرحت بخش ہے۔ میں شطرنج کا مہرہ بننے سے بہت گھبراتی ہوں میری اپنی زندگی پر میرا حق ہے۔ اسے میری پسند کے مطابق بسر کرنا لازم ہے۔ شادی تو باہمت' بلند حوصلہ اور بہادر لڑکی کا کام ہے۔ ایسی کوئی خوبی مجھ میں ہے نہ ہی آئندہ رونما ہونے کے امکان ہیں۔"

"حلیمہ تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" ساجد نے ان کی سوچتی آنکھوں کو غور سے دیکھ کر کہا۔ تو وہ اچنبھے سے سب کو دیکھنے لگیں۔

"چائے ہی نہیں میں بذات خود سر تا پا ہی ٹھنڈی پڑ گئی ہوں۔" حلیمہ نے دل میں ہی سرگوشی کی اور لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆ ☆

”پتر! شاہ سائیں یا میران کے آنے تک حویلی سے نہ جائیں۔“

”لیکن بابا سائیں تو دو تین دن سے حویلی میں نظر نہیں آئے اور۔۔۔“

”ہاں آج رات تک آجائیں گے اور میران‘ رب جانے کیوں ابھی تک شہر والے فلیٹ پر ہے۔“

”اُسے فون کریں نا، اب میں اس کے آنے کے انتظار میں بیٹھی تھوڑی رہوں گی۔“

”او پتر۔۔۔! کوئی بات نہیں، کسی کم (کام) سے ہی ٹھہر گیا ہوگا نا، پوچھوں گی تو ایویں ای غصہ کرے گا، بس خریت (خیریت) سے ہو، مجھے تو یہ دکھ لگ جاتا ہے نا۔“

اسی دوران مہربانو کو کھڑکی سے میران کی جیپ مین گیٹ کے اندر آتی نظر آئی تھی۔

”اماں سائیں، بھائی آگیا۔“

”آگیا ہے؟ او ماں صدقے، ماں واری، میرا پتر آگیا ہے۔“

آن کی آن میں ملکانی سائیں کے چہرے پر بے پناہ چمک ابھری تھی۔ بیٹے کی آمد کی خوشی اُن کے چہرے پر رقصاں دیکھ کر مہربانو بھی مسکرائی تو ضرور مگر دل ساتھ دینے سے انکار کر رہا تھا۔ جبھی عجیب نظروں سے ملکانی کو جاتے دیکھتی رہی اور پھر کھڑکی کی طرف مڑ گئی، جہاں میران کی آمد پر تمام ملازمین لمحہ بھر میں چوکنا ہو چکے تھے۔

☆☆☆

زندگی کھیل ہے اور کھیل میں اگر
چوٹ لگ جائے تو رونا کیسا
کچھ نہ پانے پہ شکایت کیسی
کچھ نہ پایا تو پھر کھونا کیسا

زندگی ندی کے لیے ایسی ہی پہیلی ثابت ہوئی تھی، کب اس کے ساتھ کیا ہو جائے۔۔۔ وہ بڑی ہی بے یقینی کا شکار رہنے لگی تھی، وقت سے بھی اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ساری زندگی ساتھ رہنے اور اپنی جان اس پر نچھاور کرنے والے رشتے اب انجان بن چکے تھے تو بھلا اور کسی کا وہ کیا یقین کرتی اور پھر وقت کا۔۔۔ جو بھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا، جو ہمیشہ ساتھ رہنے والوں کو بھی پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانے کا عادی تھا اور پھر پچھلے چند روز سے پے در پے ہونے والے تمام ناخوشگوار واقعات نے اس کی زندگی مکمل طور پر بدل کر رکھ دی تھی۔

اور سب سے بڑھ کر بابا کی یوں اچانک وفات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اور یہی واقعہ جیسے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔

یوں بھی وہ اس کے لیے صرف باپ کا رول ہی ادا نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اس کے لیے سب ہی کچھ تو تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک جس طرح انہوں نے ندی کو ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا اس کی مثال پورے خاندان میں نہیں ملتی تھی۔ باپ بیٹی میں دوستوں جیسا پیار تھا اور انہی کے دیے گئے مان کے بل بوتے پر ہی اس کی ذات میں بلا کا اعتماد نظر آتا۔

اس کی ہر چھوٹی سی چھوٹی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے والے بابا اسے اب کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ وہ زندگی بھر ان کا لمس محسوس نہیں کر پائے گی۔۔۔ یونیورسٹی سے واپسی پر لان میں پائپ ہاتھ میں لیے پودوں کو پانی دیتے ہوئے بھی نہیں، صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے بھی نہیں، رات کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بھی نہیں۔۔۔ کیا واقعی اب وہ آسمان کے اُس پار، اس سے دور بہت دور چلے گئے ہیں۔

بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے کھلی کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا، دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ کلیجہ منہ کو آنا اور جگر چھلنی ہونا جیسے محاورے اسے اب سمجھ آئے تھے۔

کھڑکی سے نظر آتا ہمیشہ تازہ اور سرسبز و شاداب لان جسے صبح اٹھ کر دیکھتے ہی روح میں زندگی اور تازگی کی ایک نئی لہر سرائیت کرنے لگتی تھی اب اجڑا ہوا تھا۔

سامنے دائیں طرف دیوار کے بالکل ساتھ نل اور ساتھ ہی پانی کی موٹر موجود تھی۔ نل کے اوپر موجود پائپ بخار آنے سے ایک روز پہلے بابا نے ہی رکھا تھا سو تب کا اب تک وہیں رکھا تھا۔

سامنے ہی آسٹریلین توتوں کے پنجرے میں پانی کی کٹوریاں سوکھی اور پنجرے میں انتہائی گند موجود تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بابا کتنے شوق اور محبت سے یہ توتے لائے تھے۔ اب ان کی یہ حالت دیکھ کر اس نے چاہا کہ لان میں جا کر اُن کا پنجرہ ہی کم از کم صاف کر دے اور انہیں کچھ کھانے کو دے مگر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانے سے خواہش حقیقت کا روپ دھارنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور وہ وہیں نیچے کارپٹ پر بیٹھی تو پھر بیٹھتی ہی چلی گئی۔ اس بار خود اسے اپنی ہی حالت پر رونا آگیا تھا۔ یہ سب اس کے ساتھ جانے کیا ہو رہا ہے اور اب آگے زندگی میں کیا ہونے والا ہے۔ سر سے سائبان چھن ہی چکا تھا اب تو بس ظاہری طور پر دیواریں کھڑی تھیں اور دیواریں بھی وہ جو مسلسل آندھیوں کی زد میں تھیں اور اپنی کمزور بنیادوں پر بھی تکیہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

یہ سب باتیں مل کر اسے رلائے دے رہی تھیں باوجود اس کے کہ دھاڑیں مار مار کر رونے کی وجہ سے آواز ساتھ چھوڑ گئی تھی اور جسم ہر وقت بے دم سا محسوس ہوتا رہتا مگر امی کے علاوہ کوئی بھی اسے گلے لگا کر تسلی دینا گوارا نہ کرتا۔ ان کے علاوہ کوئی کندھا ایسا نہ تھا جس پر سر رکھ کر وہ اتنا روتی کہ ذہن و دل کی تمام کثافت آنسوؤں کے سنگ بہہ نکلتی۔

کوئی سایہ اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
مر جاؤں گا اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
سانولی رت میں خواب جلے تو آنکھ کھلی
میں نے دیکھا اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
اب کے موسم یہی رہے تو مر جائے گا
اک اک لمحہ اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
کوئی سایہ آگ میں جلنے والوں پر بھی
کوئی دھیان اچھے سائیں دھوپ بہت ہے
اچھے سائیں مان لیا دنیا ہے روشن
لیکن یہ کیا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

وہ ندرت جس کی خوش مزاجی کے ساتھ ساتھ خوش لباسی بھی اپنی مثال آپ تھی اب الجھے بالوں اور ملگجے کپڑوں میں چپ چاپ امی کے کمرے میں بیٹھی انہیں نماز اور قرآن پاک پڑھتے دیکھتی رہتی۔ سجدے میں جا کر کتنی ہی دیر روتی ہوئی ماں کو دیکھتی تو دل چاہتا زندگی ایک سلیٹ ہوتی تو ایک پل کی تاخیر کیے بنا سب مٹا کر رکھ دیتی۔ صبح یا رات کو آفس آتے جاتے ہوئے اچانک کبھی لاؤنج یا کچن میں ناصر بھائی سے آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ واپس پلٹ جاتے اتنی دفعہ سامنا ہونے کے باوجود کوئی دستِ شفقت نہ بڑھا تھا جس کے تلے وہ خود کو محفوظ اور پرسکون خیال کرتی۔

ثروت آپا، ناصر بھائی، عائشہ بھابھی سمیت تمام لوگ اسے بابا کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ خاندان کے وہ تمام لوگ جو پہلے کبھی اس کی خوب صورتی اور خوبیوں کے معترف تھے اب اس کے لیے ”شکل مومناں کرتوت کافراں“ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اس کی طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے اور کیوں نہ اٹھاتے جب خود ثروت آپا اور ان کے ساتھ عائشہ بھابھی بین کرتے ہوئے لوگوں سے مخاطب تھیں کہ بابا اخبار میں بیٹی کی تصویر چھپنے کا صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ نظروں کے تیر اور زبان کے نشتر، ہمہ وقت ندرت پر چلتے ضرور مگر وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھی کہ یہ سب باتیں یا رویے

محسوس کرپاتی۔

اس کے سر سے تو چلچلاتی دھوپ میں سائبان چھن گیا تھا۔

وہ جو امی بابا کے اعتماد کے سہارے ساری دنیا سے مقابلہ کرنے کو تیار تھی اب اس کی ہمت بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔۔۔۔ بہت کمزور پڑ گئی تھی وہ۔۔۔

یوں بھی جنہیں اپنوں کا ساتھ حاصل ہو وہ زمانے کی تلخیاں اور مصائب ہنس کر جھیل جانے کی بھی قوت رکھتے ہیں مگر اکیلا بندہ سرسراتے پتوں کو چھیڑتی نرم ہوا سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔

اور یہ بھی سچ تھا کہ اب امی کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو اکیلا ہی جان رہی تھی کہ ناصر بھائی کا بدلا ہوا رویہ اسے اُسی شام بہت کچھ سمجھا گیا تھا جب وہ یونیورسٹی سے جلدی گھر آ گئی تھی۔

اُسی شام شاہ زین سے ملنے کے بعد عائشہ نے صبا کو بھی ندرت ہی کے موبائل سے میسج کر دیا تھا کہ ہوسکتا ہے کچھ روز کے لیے رابطہ نہ ہو پائے کیونکہ وہ ماحول تبدیل کرنے اور ذہنی سکون کے لیے کچھ دن ثروت آپا کے پاس رہے گی۔ جواباً صبا نے اسے ٹینشن نہ لینے اور مکمل ریسٹ کرنے کا کہا تھا۔

☆☆☆

"بیٹا ان کی شوگر تو نارمل سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے اور جہاں تک مجھے لگتا ہے کہ پرہیز بھی باقاعدگی سے کرتی ہیں پھر ایک دم۔۔۔؟"

ڈاکٹر نے اماں کی شوگر چیک کرنے کے بعد تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ بول نہیں پایا۔ اماں کی شوگر نارمل لیول سے کہیں زیادہ ہے اس کا اندازہ اسے بھی ان کے چہرے کی سوجن اور سر درد کی شدت سے ہو گیا تھا۔

"اماں جی ٹینشن نہ لیا کریں کسی بھی بات کی۔۔۔ آپ کو پتا ہے نا شوگر کی ایک نمایاں علامت بہت زیادہ ٹینشن بھی ہے۔۔۔ خوش رہا کریں۔"

ڈاکٹر نے پہلے سے استعمال کردہ دوائی کی مقدار اور اوقات کو چند روز تک بڑھا کر لینے کی ہدایت کی ساتھ ذہنی سکون کی بھی گولی لکھ دی تھی۔

"اور پھر جن ماؤں کے اتنے قابل اور سلجھے ہوئے بچے ہوں ان پر تو پریشان ہونا واجب ہی نہیں۔۔۔ کیوں اماں جی درست کہہ رہا ہوں؟"

ڈاکٹر شفیق نے ہلکے پھلکے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

اپنے نام کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ اکثر مریض گھر سے روہانسے آتے اور ان سے ملنے اور باتیں کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے واپس لوٹتے۔ شہر کے چند قابل ڈاکٹرز میں شمار ہونے کے باوجود غرور کی چڑیا کو بھی اپنے نزدیک پر تک مارنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور شاہ زین کے والد کو تو وہ یوں بھی اپنا محسن خیال کرتے تھے کہ میڈیکل کالج میں داخلے کے وقت اُن کے پاس فیس دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے شاہ زین کے والد نے ہی انہیں نہ صرف اس وقت فیس کی رقم دی بلکہ واپس لینے سے بھی انکار کر دیا۔

ان کے اسی احسان کے پیش نظر وہ کبھی بھی ان سے فیس نہ لیتے تھے کہ بقول ان کے اگر اس وقت اللہ کی ذات شاہ زین کے والد کو وسیلہ نہ بناتی تو وہ آج ہرگز ڈاکٹر نہ بن پاتے۔

کلینک سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اماں کو رکشے میں بٹھایا اور رکشے والے کو کچھ دیر انتظار کرنے کا کہہ کر دوائی لینے کی غرض سے میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا ہی تھا کہ ہاتھ میں دوا کا شاپر پکڑ کر باہر نکلتے پروفیسر خورشید سے ملاقات ہو گئی چونکہ وہ یونیورسٹی میں ہونے والے تمام معاملات سے واقف تھے اسی لیے جب انہوں نے شاہ زین سے اس متعلق بات کرتے ہوئے چند دن سے یونیورسٹی نہ آنے کا پوچھا تو ہمدرد جان کر اس نے اس واقعہ کے ردِعمل کے طور پر ٹیوشنز کے ختم ہونے کا بتا کر آج کل نئی ٹیوشنز ڈھونڈنے کی مصروفیت بتا ڈالی۔

ندرت کے بغیر اس کا یونیورسٹی جانے کا دل نہیں چاہتا تھا، یہ بات وہ بڑی خوب صورتی سے چھپا گیا تھا۔

"میری نظر میں ایک جاب تو ہے اگر تم کرنا چاہو تو۔۔۔"

پروفیسر صاحب نے اس کی پرابلم محسوس کرتے ہوئے مخلصانہ آفر کی تھی۔

"کیوں نہیں سر! جاب کیسی بھی ہو میں کرنے کو تیار ہوں کیونکہ محنت کرنے میں مجھے کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن ایک بات ہے۔۔۔"

پروفیسر صاحب اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک دم چونکے اور چہرے پر سوالیہ تاثرات لیے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

"سر میں شارٹ کٹس کی بدولت پیسہ کمانے سے محنت اور جدوجہد کے رزقِ حلال کو ترجیح دیتا ہوں۔"

"شاباش بیٹا! بہت خوشی ہوئی تمہارے خیالات سن کر۔" وہ مسکرائے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ جاب کے ساتھ ملنے والی ممکنہ مراعات یا تنخواہ کے متعلق پوچھنا چاہتا ہے مگر اپنے خیال کا غلط ثابت ہونا انہیں متاثر کر گیا تھا۔

"تم ایسا کرنا کل صبح میرے گھر آ جانا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

رکشے والے کے پکارنے پر اس نے صبح وقت پر پہنچنے کا وعدہ کرتے ہوئے شکریے کے ساتھ ان سے اجازت لی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا رکشے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

عمر بھر کو داغ دے جاتی ہے ادنیٰ بھول بھی
جرم ثابت ہو نہ ہو الزام پھر الزام ہے

اور آخر کار زندگی نے ایک بار پھر سست روی سے ہی سہی مگر آگے کی طرف قدم بڑھانے شروع کیے تو ندرت کے دل میں سب سے پہلے شاہ زین سے بات کرنے اور اس کے ساتھ اپنے اندر کا دکھ شیئر کرنے کا خیال آیا اور تبھی ندرت کو محسوس ہوا کہ اس نے کئی روز سے موبائل نہیں دیکھا۔ اپنے کمرے میں تلاش بسیار کے بعد وہ امی کے پاس آ گئی جو اذان ہونے کے انتظار میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو آیت مبارکہ ختم کرنے کے بعد قرآن پاک بند کر دیا۔

سفید شلوار دوپٹے کے ساتھ پرنٹڈ قمیص پر بالوں کی ڈھیلی سی پونی۔ ندرت کے چہرے پر آج ایسی سرخی اور سفیدی پاؤں پسارے بیٹھی معلوم ہو رہی تھی۔

"بیٹا کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"امی وہ۔۔۔ دراصل میرا موبائل پتا نہیں کہاں ہے؟"

"یہیں کہیں ہوگا، جانا کہاں ہے۔"

"لیکن میں نے ہر جگہ ڈھونڈا ہے مگر نہیں ملا۔ پی ٹی سی ایل نمبر سے کال کر کے دیکھا تو بیل جا رہی ہے مگر ریسیو نہیں ہو رہا۔"

اسی دوران مغرب کی اذانوں کی آواز چاروں طرف سے آنے لگی تو دوپٹا سر پر جمائے وہ ایک دم خاموش ہو گئی تاکہ عقیدت و احترام سے اذان سنی جا سکے۔

اور یہی بات بچپن سے امی بابا نے سکھائی بھی تھی کہ اذان شروع ہونے پر اگر جملہ ادھورا بھی رہتا ہے تو چھوڑ دو اور صرف اذان کی طرف دھیان دو۔ آج بھی حسبِ عادت وہ اذان سن تو خاموشی سے رہی تھی لیکن دھیان مفقود تھا۔ ذہن میں اس روز کی فلم چل رہی تھی جب وہ آخری دن یونیورسٹی گئی تھی۔ واپسی پر پوائنٹ میں اس نے شاہ زین کو میسج کرنے کے بعد موبائل بیگ میں ڈالا تھا اور اور پھر۔۔۔ پھر گھر کے قریب پہنچ کر موبائل پر ہی ٹائم دیکھا تھا اور دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔ یعنی موبائل گھر پر ہی تھا اور اتنے دنوں سے چارج بھی مسلسل ہو رہا تھا۔ اسی لیے اس کے کال پر بیل تو جا رہی تھی مگر ریسیو نہیں کیا گیا۔

"مانا کہ گھر میں ہے مگر۔۔۔"

"آؤ بیٹا! نماز پڑھ لیں۔" اذان ختم ہونے پر امی نے جائے نماز بچھاتے ہوئے اسے بھی بلایا تو وہ الجھی الجھی سی نماز کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

پروفیسر خورشید کے توسط سے شاہ زین کو ایک گارمنٹ فیکٹری میں اسسٹنٹ کوآرڈینیٹر کی جاب مل گئی تھی۔ یہ ایک مشہور و معروف کمپنی تھی جس کی مین برانچ تو شہر کے وسط میں قائم تھی مگر اب آرڈر اور ڈیمانڈ بڑھنے کے پیش نظر فیکٹری کی ایک اور برانچ شہر سے تقریباً باہر قائم کی گئی تھی۔ جگہ کا ریٹ کم ہونے کے باعث ایک وسیع و عریض رقبے پر فیکٹری تعمیر کروانے کے بعد اب کام شروع کیا گیا تھا۔ وقتی طور پر تو مین برانچ کے لوگ یہاں ناصرف کام کر رہے تھے بلکہ نئے لوگوں کو بھی سکھا رہے تھے۔ اسی لیے یہاں ایسے ایمان دار اور محنتی لوگوں کی اشد ضرورت تھی جو جلد از جلد کام سیکھ کر خلوص نیت سے اپنی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

شہر سے دور ہونے کے باعث آفس ممبرز کو رہائش کی سہولت بھی دی گئی تھی جبکہ ورکرز روزانہ کی بنیاد پر ہی آیا جایا کرتے اور اب شاہ زین کو بھی فیکٹری کے نزدیک مہیا کی گئی رہائش گاہ استعمال کرنا تھی بصورت دیگر ٹریفک نارمل رفتار سے چلنے کے باوجود اسے صرف آنے میں ہی دو ڈھائی گھنٹے لگ جاتے البتہ ثمینہ کو اب کالج جانے کے لیے پوائنٹ بس کو استعمال کرنا تھا۔

وہ گھر جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا، اماں نے شادی کے بعد پہلا قدم رکھا، چھوڑنا مشکل تو تھا مگر رزق کے حصول کے لیے یہ ناممکن امر بھی اماں کی پرزور تائید سے ممکن ہو گیا کہ ان چند روز میں شاہ زین کی جو کیفیت اماں نے دیکھی تھی وہ ان کے لیے اس اذیت سے کہیں بڑھ کر تھی جو انہیں یہ گھر چھوڑنے پر ہوتی۔ جبھی شاہ زین کے ایک دو بار منع کرنے کے باوجود انہوں نے وہاں شفٹ ہونے کی بھرپور حمایت کی کیونکہ وہ کسی بھی طرح شاہ زین کو اس کیفیت سے باہر نکالنا چاہتی تھیں جس میں وہ پچھلے کئی روز سے جکڑا ہوا تھا۔ یوں بھی انسان کے لیے ہر طرح کے دکھ اور پریشانی سے پیچھا چھڑانے کا بہترین طریقہ ہی یہ ہے کہ وہ مصروف ہو جائے سو اماں بھی اسے مصروف دیکھنا چاہتی تھیں۔

خود شاہ زین کے لیے یہ گھر چھوڑنا اتنا آسان نہ تھا اور وہ بھی ایسی صورت میں جب وہ اس گھر میں ہر ہی مرتبہ ندرت کو چلتے پھرتے، اماں سے خوش گپیاں کرتے، کچن میں ثمینہ کے ساتھ کھانا بناتے، صحن میں اس کا انتظار کرتے، برآمدے میں کوئی کتاب پڑھتے اور اپنے کمرے میں اس کی کی گئی کسی محبت بھری بات پر شرماتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

لیکن اپنی ذات کے لیے وہ خود سے جڑے ان رشتوں کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس کی ایک آہ پر درد سے بلبلا اٹھتے تھے سو آج جب وہ تینوں آخری دفعہ اس گھر کو دیکھ رہے تھے تو گھر کے ساتھ ساتھ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخری دفعہ ندرت کو بھی الوداع کہنے کے لیے ایک بار پھر فون کا سہارا لیا مگر کوئی بھی رسپانس نہ ملنے پر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

دل تو بوجھل تھا ہی اس پر آنکھوں میں تیرتی نمی نے اسکرین کو بھی دھندلا دیا تھا۔

☆☆☆

"ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی شل ہیں شوقِ سفر بھی نہیں جاتا
لاکھ چاہنے کے باوجود میں تمہاری یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا، تم نے چاہے مجھے بساط کا ایک مہرہ ہی سمجھا ہو مگر میرے دل کے سنگھاسن پر اب بھی تمہارا ہی راج ہے اور آئندہ بھی کوئی یہ جگہ نہیں لے پائے گا، میرے جذبات کو محض ذریعہ تفریح سمجھ کر یقیناً تم نے مجھے ہرٹ کیا لیکن میرا دل اب بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ وہ سب محض ایک مذاق تھا اور اگر ایسا تھا بھی تو میرے لیے وہ لمحات جو کبھی تم نے میرے ساتھ گزارے ساری زندگی پر محیط رہیں گے۔۔۔ کہ تمہارے علاوہ اس دل کو نہ تو کسی کی طلب ہے اور نہ ضرورت۔۔۔
سمجھو نہ سمجھو
ہمیشہ تمہارا۔۔۔ شاہ زین۔"

رات ناصر بھائی کے آفس سے لوٹنے پر عائشہ بھابھی نے موبائل ان کے سامنے بڑھا دیا تھا، سامنے موجود پیغام پڑھ کر ناصر بھائی کے جسم کا تمام خون گویا سر پر آ کر رک گیا تھا۔ جاننے کے باوجود عائشہ کے اس عمل پر نہ تو وہ اسے جھڑک سکتے تھے اور نہ ہی ندرت کو مزید برا بھلا کہنا چاہتے تھے کہ شادی کے بعد شروع شروع میں عائشہ ہر کام میں ندرت کی پسند کو ہی ترجیح دینے پر آخر سمجھنے پر اکثر ناصر سے اختلاف کرتی بھی تو سخت لہجے میں اسے ٹوک کر یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ۔

"اپنے ذاتی فیصلوں میں تم جو چاہو کرو میں مداخلت نہیں کروں گا، لیکن ہاں بات جب گھر کی ہو تو اس میں ندرت کی ہی پسند کو مقدم رکھا جائے گا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی کیونکہ ندرت مجھے اپنی پسند ناپسند کیا بلکہ زندگی سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔"

دیواروں پر ہونے والا پینٹ ہو یا عائشہ کے بیڈ روم کے علاوہ تمام گھر کی سیٹنگ، پردوں کے کلر کا انتخاب ہو یا کسی دعوت کا مینیو، ندرت کے اوکے کرنے تک ہر کام رکا ہی رہتا اور گو کہ ندرت ہر کام میں بھابھی کے مشورے کی منتظر رہتی مگر اس سب کے باوجود عائشہ ذہنی طور پر خود کو مظلوم تصور کرتی کہ جس کی اپنے گھر میں اتنی سی بھی وقعت نہیں کہ وہ کوئی فیصلہ خود کر سکے۔ تن تنہا حکمرانی کرنے کا خواب ہی درحقیقت دوسروں کو زیر کرنے کی خواہش کا سبب بنتا ہے اور یہی کچھ آج کل عائشہ بھی کر رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اکمل کے علاوہ کسی اور کو چاہنے کا بھی کفارہ اب ندرت کے ذمے واجب الادا تھا جسے شاید اسے ادا کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

ندرت اپنے کمرے میں بچھے لائٹ پنک کارپٹ پر موجود بلیک اٹالین اسٹائل کاؤچ پر اپنی زندگی میں ہونے والی پے در پے تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب عائشہ بھابھی دستک کا تکلف کیے بغیر ہاتھ میں اپنا موبائل لیے اندر آئیں۔

"اکمل کا فون ہے تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اس کے ہاتھ میں موبائل دے کر کوئی بھی جواب سنے بغیر وہ واپس مڑنے سے پہلے پھر بولیں۔

"فون بند کرتے ہی واپس میرے کمرے میں دے جانا۔"

ندرت نے اثبات میں گردن ہلائی تو وہ طنزیہ نظروں سے دیکھتی واپس چلی گئیں۔

"اکو!"

"کیا حال ہے ندرت جی؟"

"میرا خیال ہے کہ تم سوچ سکتے ہو کیا حال ہوگا۔"

ندرت کے جواب میں وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ندرت کا دکھ شیئر کرنا چاہتا تھا مگر نہ تو وہ اس دن کچھ بول پایا تھا جب اس نے بابا کی تعزیت کے لیے اسے فون کیا تھا اور نہ ہی اس کے پاس آج الفاظ تھے جب وہ ایک دوست کی حیثیت سے اسے اپنے پن کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟"

"دراصل بچپن سے ہی آپ ہر بات میں مجھے سمجھاتی تھیں نا، گو کہ ہماری عمروں میں اتنا فرق نہیں ہے لیکن پھر بھی کھیل میں ہارنے کے بعد، کوئی کھلونا ٹوٹنے پر یا کبھی امتحان میں کم گریڈ آنے پر ہمیشہ آپ نے مجھے سمجھایا۔ میرے رونے کے تسلسل کو توڑ کر ہنسنے پر مجبور کیا۔۔۔ صرف میری خوشی کی خاطر میرے ٹوٹے کھلونے لے کر اپنے مجھے دیے مگر آج۔۔۔"

اکمل نے رک کر گہری سانس خارج کی تھی۔

"آج میں آپ کی اداسی کم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔"

چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی کی نذر ہوئے۔

"پتا ہے اکو۔۔۔" ندرت کی آواز نے خاموشی توڑی۔

"میں اداس نہیں ہوں لیکن ہاں شدید کرب ضرور ہے ایک اذیت ہے جو دن رات میرے ساتھ ہے۔۔۔ یا یوں کہہ لو کہ میرا حال تو اس انسان کی طرح ہے جو رات کو اپنے بھرے پرے خاندان کے

ساتھ خوش وخرم سوئے اور سوتے میں ہی گھر کی چھت گر جائے۔"

"ندرت جی۔۔۔!" اگو نے اس کا گلا رندھا محسوس کرلیا تھا جسے وہ بڑی خوب صورتی سے چھپا گئی۔

"ہاں اگو تصور کرو کہ چھت گرنے سے اس کے جیتے جاگتے سب رشتے ختم ہوجائیں اور وہ انسان ملبے تلے کراہ رہا ہو۔۔۔ زندہ تو ہو مگر اپنے پیاروں کے ساتھ موجود ہونے کے باوجود ان کے چھن جانے پر اس طرح نوحہ کناں ہو کہ خود اس کا دم گھٹنے کو ہو۔۔۔"

"ندرت جی پلیز! مت کہیں ایسا۔۔۔ سنبھالیں خود کو۔" ندرت کے لہجے کی سوگواریت پر وہ تڑپ اٹھا تھا۔

"یہ سچ ہے اگو۔۔۔ بلکہ یہی تو اصل سچ ہے کہ اعتماد کی مضبوط ڈھال ٹوٹنے پر بھی رشتے اور ان کا مان ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ کرچیاں پلکوں سے سمیٹنے پر اکثر آنکھوں میں کانچ سے چبھنے لگتے ہیں۔"

اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھیں بھیگ ضرور گئی تھیں مگر آنسو ان کے کنارے تک آکر رک گئے تھے اور یقینی طور پر تادم اجازت انہیں اسی ساحل پر منتظر رہنا تھا۔

"ندرت جی پلیز خود کو سنبھالیں نہ صرف اپنے بلکہ آنٹی کے لیے۔۔۔ کیونکہ وہ آپ کو اس طرح دیکھیں گی تو ان کا دکھ دوگنا ہوجائے گا اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا دکھ آپ سے چھپانے کی کوشش میں وہ خود کو کوئی روگ لگا بیٹھیں۔۔۔ اور پتا ہے نا یہ روگ انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح یوں کھوکھلا کردیتا ہے کہ اردگرد موجود لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ پتا چلتا ہے تو تب جب دیمک کا کھیل ختم ہوچکا ہوتا ہے۔"

یہی بات وہ کافی دنوں سے خود کو سمجھانے کی کوشش میں تھی۔ مگر اکمل کے کہنے پر ایک دم دل میں اتر گئی تھی کہ اپنے لیے نہ سہی مگر امی کے لیے اسے خود کو سنبھالنا ہی ہوگا۔

اور اپنی ذات کو پھر سے یکجا کرنے کا سفر وہ شاہ زین کے ساتھ شروع کرنا چاہتی تھی جبھی فوراً سے پہلے شاہ زین سے بات کرنے اپنے موبائل کی طرف ذہن دوڑانے لگی۔

☆☆☆

ملکانی کا خوشی سے نہال چہرہ اور اکلوتے بیٹے پر واری صدقے جاتی کاجل لگی آنکھیں۔۔۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آنکھوں کے ذریعے اسے اپنے دل میں اتار لیں۔ زندگی کا تصور میران کے بغیر انہوں نے کیا ہی کب تھا۔ حویلی میں ملازموں کی کھیپ موجود ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اسے ملازموں کے سر پر نہیں چھوڑا تھا۔ بیٹی ہونے کے باوجود وہ مہربانو سے تو بعض اوقات لاتعلق رہ جاتی تھیں مگر میرو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتا۔

اسی لیے اب جو چند دن اسے دیکھے بغیر گزرے تو انہیں بھلا چین کب آیا تھا۔ ان دنوں میں نہ تو وہ اپنی عزیز از جان سونی پر دھیان دے پائیں اور نہ ہی حویلی کے دیگر معاملات پر، دھیان تھا تو صرف اپنے لختِ جگر کا، جسے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باوجود بار بار ٹیلی فون کرکے اس کا غصہ مول نہیں لینا چاہتی تھیں۔

جبھی اب اسے اپنے سامنے پاکر اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔

"پتر! اتنی دیر لگادی، ماں کی کوئی یاد نہیں آئی۔"

شاور لینے کے بعد فریش ہوکر اب وہ ملکانی کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیوں نہیں اماں سائیں! آپ کی محبت کی کشش ہی تو ہے جو اتنی جلدی آگیا، ورنہ شاید کچھ دن اور شہر میں رکتا۔"

"ویسے پتر! خیر تو تھی نا۔ ایسا کیہڑا (کون سا) ضروری کام تھا؟"

ملکانی کی بات پر وہ لمحہ بھر چونکا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بھنوؤں پر انگشت شہادت پھیرتے ہوئے بولا۔

"بس کچھ ادھار لوٹانا تھا اماں سائیں! اسی میں دیر لگ گیا۔"

"او پتر! مجھے سمجھ نہیں آئی۔" ملکانی اس کے لفظوں سے کہیں زیادہ اس کے لہجے میں الجھ گئی تھیں۔

"پر چلو جو ہوا سو ہوا۔۔۔ اب تو فیر حساب برابر ہوگیا ہے کہ نہیں۔"

"حساب تو اماں سائیں برابر ہوگیا ہے مگر دل کو سکون نہیں مل رہا ابھی تک۔"

کنیزاں سونی کو نہلا کر ملکانی سائیں کے پاس چھوڑ کر گئی تو میران نے ان کی گود سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کے نرم وملائم سفید بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بھی ابھی اتنی دیر پانی میں کھیلنے کے بعد اب آغوش کا لمس پاکر اس کے ساتھ ہی لگ گئی۔

"لے تے فیر پتر یہ کون سی بات ہوئی۔ جتنا ادھار تھا اس سے کچھ زیادہ کرکے لوٹانے سے دیکھیں دل کو کیسا سکون ملے گا۔"

"کچھ زیادہ کرکے؟" سونی کو سہلاتا ہاتھ اک دم رکا اور اس نے چونک کر ملکانی سائیں کو دیکھا۔

"آہو نا، پانچ کو دس کرکے دے دے واپس، نہیں تو اٹھ (آٹھ) کردے۔"

بات کے پس منظر سے بے خبر وہ محض مشورے ہی دیئے جارہی تھیں مگر ان کا مشورہ حقیقی معنوں میں میران کے دل کو چھو چکا تھا۔

وہ ندرت جس نے اس کا کیریئر تباہ کردیا۔ ساری یونیورسٹی کے سامنے اس کی اتنی انسلٹ ہوئی کہ وہ اتنی بے عزتی سے اسے یونیورسٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ کیا یہ سب محض اخبار کی ایک خبر کے مقابلے میں تھا؟ وہ تو ظاہر ہے پہلے کی طرح ہی یونیورسٹی بھی جائے گی، ڈگری بھی لے گی اور کل کو شادی کرکے ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے گی۔

مگر اس کا کیا۔۔۔ گوکہ یہ ڈگری متوسط طبقہ کے لوگوں کی طرح اس کی زندگی کی کامیابی اور روزی روٹی کمانے کی پہلی سیڑھی نہیں تھی۔ وہ خود چاہتا تو پوری یونیورسٹی کی بنیاد رکھ سکتا تھا کہ شاہ سائیں کے سیاسی اثر ورسوخ کے باعث نہ تو منظوری لینا کوئی دشوار گزار عمل تھا اور نہ ہی پھر اس یونیورسٹی کی رجسٹریشن کروانا۔

بلکہ اس کا المیہ تو کچھ اور تھا۔ جو لوگ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ہوں، عام طور سے ان کے منہ سے باتیں بھی "میں" کی نکلتی ہیں جن کا فائدہ ان کی ذات کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ تانبے کے ظاہری چمک دمک والے چہرے اور لوہے سا دماغ جو پل بھر میں تپ کر سامنے والے کی عزت اتارنے میں لمحہ بھر نہیں لگاتے اور یہ سب اس لیے کہ دوسروں کے سامنے شرمندگی کا احساس کیا ہوتا ہے وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ جب بھرے مجمع میں کسی کو رسوا کیا جائے تو وہ آنکھیں نیچے کرکے کھڑے ہوتے ہوئے سامنے والے کو عزت نہیں دے رہا ہوتا، اسے درست ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں دے رہا ہوتا بلکہ وہ بے چارا تو زمین پر نظر گاڑے اس میں سما جانے یا لمحہ بھر میں اس ہجوم سے غائب ہوجانے کے معجزے کی لاحاصل خواہش میں گرفتار ہوتا ہے۔

اور اب جب ندی کی وجہ سے وہ احساسِ ذلت کا شناسا بنا تھا تو اس کے اندر لگی آگ دن بدن ٹھنڈی ہونے کے بجائے مزید بھڑک رہی تھی۔ انتقام کا جو دھارا اب اس کے خون میں رچ گیا تھا۔ اسے وہ کسی طور نشیب کی طرف بہنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ تاوقتیکہ وہ ندی کو خود اپنے سامنے شکست خوردہ حالت میں نہ دیکھ لے۔

فیوجی یامہ پہاڑ میں کئی دنوں سے لاوا جمع ہورہا تھا اور لاوا جتنا پرانا ہوا اتنا ہی خطرناک اور نقصان دہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

دن سہانے تلاش کرتے ہو
گم خزانے تلاش کرتے ہو
وہ پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے

جو زمانے تلاش کرتے ہو

وہ بات جو وہ خود کئی روز سے اپنے آپ کو سمجھاتا اور باور کروانا چاہتی تھی وہ اکمل سے بات کرنے کے بعد بغیر کسی دقت کے اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی اور یہ بات وہ بھی جانتی تھی کہ آخر کب تک اسی طرح زندگی گزرے گی۔ پچھلے دنوں میں جو کچھ بھی ہوا قطع نظر اس کے کہ اچھا تھا یا برا مگر وہ سب ہو چکا، اب آگے کے بارے میں سوچنا ہی ہوگا۔

امی جو بابا کے انتقال کے بعد ایک دم ہی ضعیف لگنے لگی تھیں انہیں اس کا ساتھ چاہیے تھا۔ ناصر بھائی کے رویے نے ان کے اندر جو توڑ پھوڑ کی تھی اس کا مرہم لگانے باہر سے کوئی نہیں آئے گا۔ یہ فرض ندی کا تھا اور اسے نبھانا تھا۔

اپنی ذات کی خاطر نہ سہی تو امی کے لیے سہی اسے زندگی کی طرف لوٹنا تھا اور وہ بھی اس انداز میں کہ اللہ کے حکم سے اسے زندگی دینے والی ہستی کی آنکھوں میں پھر سے زندگی نظر آنے لگے۔ یوں بھی یہ بات وہ اپنے دل کو کسی حد تک سمجھا چکی تھی کہ اپنے پیاروں سے لگائی گئی امیدوں کی مثال بھی بعض اوقات جہاز چلاتے کیپٹن کی سی ہوتی ہے اور ذرا سی غلطی سے نہ صرف خود امیدیں دم توڑ دیتی ہیں بلکہ اس امید سے پیوستہ تمام جذبات و احساسات بھی مردہ ہو جاتے ہیں۔

ایک گہری سانس لے کر آخر کار آج وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اب فوراً سے پہلے شاہ زین سے بات کرنا چاہتی تھی۔ نا صرف یہ بلکہ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ دل کا سارا بوجھ اس کے ساتھ شیئر کر کے اسے بتانا چاہتی تھی کہ اب رشتوں پر سے اس کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ بابا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اپنی ذات کے ڈانوا ڈول ہو جانے کا سارا قصہ اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اس بات کا اعتراف کرنا چاہتی تھی کہ اب اسے شاہ زین کے ساتھ، اس کے احساس کی کس قدر ضرورت ہے مگر۔۔۔

موبائل تھا کہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا، سو آج وہ ہر حالت میں موبائل ڈھونڈ لینے کا عزم کر کے سب سے پہلے اپنی وارڈ روب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ایک ایک چیز کھنگال لینے کے بعد جھنجھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوا تو بے موسم کے کپڑوں کے لیے مختص کی گئی کپ بورڈ کے پاس کمرے سے ملحق چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں جا پہنچی۔ جہاں اس کے آج کل ستعمال میں نہ آنے والے جوتے، ہینڈ بیگز، نصاب کی پرانی کتب، منرل واٹر کی بوتلیں، جوس کے چند ڈبے اور اس کے بہت فیورٹ چپس ڈسپوزایبل پلیٹس اور گلاس کے ساتھ موجود تھے۔

جوس اور چپس بابا نے خاص طور پر اس کے ننھے سے اسٹور میں اس لیے رکھوائے تھے تاکہ پڑھتے ہوئے معمولی سی بھوک محسوس ہونے پر اسے کچن نہ آنا پڑے۔

مگر ظاہر ہے موبائل ہوتا تو ملتا بھی۔ نفاست سے تہ کیے گئے کپڑے کپ بورڈ میں اب ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہے تھے۔

لینڈ لائن فون سیٹ تو بابا کی وفات کے بعد ہی امی بابا کے بیڈ روم سے ناصر بھائی کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔ یہ الگ بات ہے اس کی ایک ایکسٹینشن ڈرائنگ روم میں حسب سابق موجود تھی۔ مگر وہاں سے شاہ زین کو فون کرنا اس کے لیے قطعی طور پر ناممکن تھا۔ امی بابا نے ویسے بھی کبھی موبائل فون استعمال ہی نہیں کیا تھا کہ فون سیٹ تو ہمہ وقت کمرے میں موجود رہتا ہی تھا۔ سو جس سے بات کرنی ہوتی وہیں سے نمبر گھما کر بات کر لی جاتی۔ مسئلہ تو دراصل اب پیدا ہوا تھا جب زندگی کے رنگ ڈھنگ انداز سب بدلے گئے تھے مگر موبائل کا نہ ملنا اس کے لیے کسی معمے سے کم ہرگز ثابت نہیں ہو رہا تھا جبھی کچھ سوچتے ہوئے اسٹور سے نکل کر کمرے میں آ گئی۔

موبائل خریدنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ پاکٹ منی کی مد میں ایک معقول رقم ناصر بھائی سمیت بابا کی طرف سے بھی ملا کرتی مگر ان حالات میں وہ موبائل خرید کر کوئی نیا ہنگامہ کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ابھی اس کی اولین ترجیح اپنا ہی موبائل ڈھونڈنا تھا جس کی خاص بات وہ تمام میسج ہسٹری تھی جس میں شاہ زین اور صبا اور زبیر وغیرہ کے میسجز بھی موجود تھے۔

کچھ دیر سوچ بچار کے بعد اس نے ڈائریکٹ عائشہ بھابھی سے موبائل کے بارے میں دریافت کرنے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے مگر اس سے پہلے ہی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سرخ سنہری رنگت کی جگہ سرسوں کے پھول سی زرد اور مرجھائی ہوئی اپنی ہی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی اور رک کر بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر گویا حقیقت ہونے کا یقین کرنا چاہا۔

”یہ میں ہوں؟“ کہیں اندر سے جیسے تصدیق کرنے کے انداز میں پوچھا گیا۔

اپنی ہی آنکھیں آج اسے اجنبی لگنے لگی تھیں۔

اس کی آنکھوں کے لیے خاندان بھر میں کانچ سی آنکھوں کی تشبیہ دی جاتی تھی۔

آج اپنی آنکھوں میں تیرگی ڈیرے ڈالے معلوم ہو رہی تھی۔ چمک گویا آنکھوں میں اداسی اوڑھے سو چکی تھی۔ اسی لمحے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ شاہ زین بلا اجازت اس کے ذہن کے پردے پر آ نمودار ہوا، جیسے چق کے اس پار ہی تو کھڑا تھا۔

اس روز جب یونیورسٹی میں پیپل کے پیڑ کے نیچے باتیں کرتے ہوئے اس نے زبیر اور صبا کے سامنے ندی کو حاضر جوابی میں ایک بار پھر پیچھے چھوڑ دیا تو وہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تینوں کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی تھی۔ تب زبیر اور صبا کے قہقہوں کے دوران شاہ زین نے پیپل کا پتا اٹھا کر اس پر کچھ لکھنے کے بعد جو ندی کے سر پر رکھا تو وہ پھسل کر اس کی گود میں جا گرا۔

لوگ ٹکرا کے در و بام سے مرتے نہ اگر
دیکھ لیتے وہ کہیں تیری سمندر آنکھیں
یہ شرارت بھرا لہجہ تو میری عادت ہے
تو ہر بات پہ یوں نم نہ کیا کر آنکھیں

پیغام پڑھ لینے کے بعد سے اب تک وہ پیپل کا پتا اس کے پاس محفوظ تھا۔۔

مگر آنکھوں کا سمندر اب خشک ہونے کو تھا۔

مزید سوچوں کو ذہن میں آنے سے روکنے کی کوشش میں اس نے سست روی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور عائشہ بھابھی کے پاس جانے کو قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

فیکٹری کی طرف سے مہیا کردہ گھر بلاشبہ شاہ زین کے سابقہ گھر سے کئی درجے بہتر تھا۔ یوں بھی بنیادی فرق طرزِ تعمیر کا بھی تھا۔ تین درمیانے سائز کے کمرے آگے برآمدہ، برآمدے کے ایک کونے پر کچن سامنے صحن اور برآمدے اور صحن کو بائیں طرف سے ملاتا باتھ روم، یہ وہ گھر تھا جہاں شاہ زین کے والد اس کی والدہ کو بیاہ کر لائے۔ ان کی شادی سے پہلے گھر کو رنگ و روغن بھی کیا گیا تھا اور چھت اور دیواروں کو از سرِ نو تعمیر تو نہیں کیا گیا مگر ہاں اس جگہ کو ٹھیک ضرور کیا گیا۔ جہاں ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ مگر اپنے سلیقے، قرینے اور طبیعت کے سلجھاؤ سے شاہ زین کی والدہ نے اس مکان کو یوں گھر کا روپ دیا کہ محلے کی تمام خواتین کو یہاں آ کر اُن سے باتیں کر کے سکون ملا کرتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب اُن لوگوں کی گھر منتقلی کی خبر محلے والوں کو ملی تو سبھی کے دل میں بے چینی کی لہریں اٹھی کہ ایک کے بعد ایک پڑوسن تصدیق کی غرض سے ان کے گھر چلی آئی۔

یہی نہیں بلکہ جس روز وہ انہیں الوداع کہہ کر آنے لگے تو شدتِ جذبات سے وہ خود پر تو ضبط کرنے میں کامیاب رہیں مگر اہلِ محلّہ کی آنکھیں نم ہونے سے نہ روک پائیں۔

”اے راشدہ! ہم رہیں گے تو اسی شہر میں نا، کبھی تم لوگ آ جانا، کبھی ہم ملنے آ جائیں گے اور پھر دیکھو، گھر کو نہ تو کرایہ پر دیا ہے نہ ہی بیچا ہے۔ اسی لیے تاکہ جب دل چاہا یہاں آ کر دو چار دن رہ بھی لیں

گے۔"

پلو سے آنکھیں مسلتی راشدہ کو انہوں نے تسلی دی مگر کس دل سے یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔

"آمنے سامنے گھر ہونے اور ایک شہر میں گھر ہونے میں تو بہت فرق ہوتا ہے نا، کہاں تو یہ کہ جب دل چاہا اٹھ کر آپ کے پاس آ بیٹھی اور کہاں تو یہ کہ آپ کے پاس آنے کے لیے ایک دو دن پہلے سے سوچا جائے۔"

بات تو سچ ہی کی تھی راشدہ نے۔ روز ملنے اور ہفتے مہینے بعد ملنے والے تعلقات کی نوعیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے روز کھائی جانے والی گندم کی روٹی روزانہ استعمال کے بعد بھی جی اوبنے کا باعث نہیں بنتی اور حضرتِ انسان کئی برسوں سے مسلسل گندم بغیر کسی اکتاہٹ کے استعمال کیے چلے جا رہے ہیں۔

اس کے برعکس کوئی منفرد خوراک کھا کر لطف ضرور آتا ہے، جی خوش بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے دوبارہ کھانے کی خواہش بھی جنم لیتی ہے مگر اس طرح کہ مل جائے تو اچھی بات، نہ ملے تو اس کے بغیر بھی زندگی گزر سکتی ہے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

البتہ گندم کی روٹی کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن تو نہیں مگر ہاں مشکل ضرور محسوس ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ ہم اسے اپنی روزمرہ روٹین میں عادت بنا چکے ہوتے ہیں۔ یہی حال راشدہ کا بھی تھا۔

اپنا ہر دکھ سکھ شیئر کرنے کے لیے اس کے پاس شاہ زین کی والدہ کی صورت میں جو ایک ہمدرد موجود تھا اور جن سے روزانہ ملے اور باتیں کیے بغیر اسے چین نہ ملتا تھا۔ اُن کے دور جانے کا احساس راشدہ کے لیے بلاشبہ کٹھن تھا۔

مگر ظاہر ہے کہ جو تھا سو تھا۔

اب اگر اس جگہ پر موجود ان کے حصے کا رزق ختم ہو چکا تھا تو ان کو وہاں سے جانا ہی تھا۔

سو بھاری دل اور نم آنکھوں کے ساتھ آخر کار وہ اس گھر میں منتقل ہوئے جو ان کے ذاتی گھر سے بے حد مختلف تھا۔

شہر سے قدرے ہٹ کر بنائی گئی فیکٹری سے دس پندرہ کلومیٹر دور یہ رہائشی کالونی صرف اور صرف فیکٹری ہی کے اسٹاف کے لیے مختص کی گئی تھی۔ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے چونکہ ٹریفک کا بہاؤ قدرے کم تھا اس لیے پندرہ کلومیٹر تک کا یہ فاصلہ طے کرنے میں کوئی خاص وقت نہ لگتا۔ ورکرز کی اکثریت کا تعلق نزدیکی گاؤں سے تھا جب کہ باقی لوگوں کو شاہ زین کی طرح شہر سے الوائنٹ کیا گیا تھا۔

بیس پچیس گھروں پر مشتمل یہ رہائشی کالونی بجلی، پانی، گیس جیسی سہولیات سے تو آراستہ تھی لیکن ڈاکٹرز، اسکول جیسی ضروریات کے لیے شہر ہی کا رخ کرنا پڑتا۔

دو بیڈ رومز پر مشتمل اس گھر میں قدم رکھتے ہی جیسے شاہ زین کو بے حد گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ کمرے بے حد کشادہ نہ سہی مگر اس کے ذاتی گھر سے بڑے ضرور تھے۔ پھر بھی وہ کھل کر سانس نہیں لے پا رہا تھا سو اندر داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے کھڑکیاں کھول کر تازہ ہوا کو اندر آنے دیا۔ سامنے چند اور گھر بھی موجود تھے اور ان تمام گھروں کے ارد گرد حفاظتی اقدامات کے طور پر بڑی سی دیوار بنا کر ایک حصار سا قائم کر دیا گیا تھا۔ کالونی کے اندر آنے کے لیے ایک بڑا سا آہنی گیٹ اور اس کے باہر بیٹھا مسلح چوکیدار۔

یعنی اس ایریا کو رہائشی علاقے میں تبدیل کرنے کے لیے باقاعدہ حکمتِ عملی ترتیب دی گئی تھی اور مکینوں کی حفاظت کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا۔ یہ بات یقیناً باعثِ تقویت تھی۔

تینوں بڑی خاموشی سے گھر کا جائزہ لے رہے تھے۔ شاہ زین تو پہلے بھی یہاں آ کر دیکھ چکا تھا مگر ثمینہ اور اماں پہلی دفعہ آئی تھیں۔ اس لیے خاموشی سے گھر کو دیکھ رہی تھیں یا شاید آج وہ الفاظ ذہن کی زنبیل میں کہیں گم ہو گئے تھے جو خاموشی توڑنے کا وسیلہ بن پاتے۔ بالآخر شاہ زین نے ابتدا کی۔

"ثمینہ کیسا لگا یہ نیا گھر؟"

چلتے ہوئے اب وہ تینوں کچن میں موجود تھے۔

"بہت اچھا ہے بھائی! اور جو اگر کوئی کمی ہوئی بھی تو وہ ہمارے رہنے سے دور ہو جائے گی۔"

اداس تو تینوں ہی تھے مگر تینوں ہی اس بات کو ظاہر نہ کرنے کی کوشش میں تھے۔

"ہاں یہ تو ہے، تمہارے ہوتے ہوئے بھلا کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔۔۔"

"شکریہ بھائی۔"

شاہ زین کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ثمینہ نے اس کی بات کو کمپلیمنٹ (compliment) سمجھ لیا تھا۔

"سوائے دماغ کی۔"

"بھائی۔۔۔!" اس کی بات کا مفہوم جان کر ثمینہ چیخ اٹھی تھی۔

"اماں دیکھ رہی ہیں نا آپ، بھائی کیا کہہ رہے ہیں۔"

ثمینہ شاہ زین کو بغور دیکھتی ماں کے سامنے فریاد گزار تھی۔ جو جانتی تھیں کہ وہ محض ان کے سامنے خود کو مطمئن، پرسکون اور ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی مصنوعی اداکاری میں مصروف ہے اور بس۔

جس کی سرمئی آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات سے بالکل بھی اتفاق کرتی نظر نہیں آ رہیں اور باوجود اس کے کہ وہ جانتی تھیں اس کا دل اداس ہے مگر پھر بھی وہ اس کے عمل کو مصنوعی قرار دے کر اس کی تردید نہیں کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ خوش رہنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بندہ مصنوعی طریقے سے دل کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود خوش رہنے کی کوشش کرے۔ خوش رہنے کی چند روزہ مصنوعی اداکاری ہی سے دل پر لگنے والی اداسیت کی تہ میں دراڑ پڑنے سے ذہن پر جو مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بلاشبہ موڈ بدلنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے تھے۔

"درست ہی تو کہہ رہا ہے نا، دماغ ہوتا تو نئے گھر اور بھائی کی جاب کی خوشی میں چائے کے ساتھ کچھ بنا کر ہمارا منہ نہ میٹھا کروا رہی ہوتیں۔"

اماں نے بھی شاہ زین کی طرف داری کی تو منہ پھلانے کے بجائے ثمینہ نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

"ارے ہاں، اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔"

ان ہی قدموں پر گھوم کر اس نے چولہا جلایا اور عین چولہے کے اوپر بنی کیبنٹس میں سے بائیں طرف کی کیبنٹ کھول کر چند ہی منٹوں میں تیار ہو جانے والی پھینیاں نکالیں، دودھ ابلنے کے لیے رکھا، ٹرے میں باؤل رکھے اور اس پھرتی پر تائیدی نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی جنہوں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا کر اس کی چالاکی کو سراہا۔

☆☆☆

اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر
پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں
غیر بن کے ملتے ہیں
دوست دار لہجوں میں
سلوٹیں سی پڑتی ہیں
عمر بھر کی چاہت کا آسرا نہیں ملتا
دشتِ بے یقینی میں راستہ نہیں ملتا
پھول رنگ وعدوں کی
منزلیں سکڑتی ہیں
راہ مڑنے لگتی ہے
بے رخی کے گارے سے
بے دلی کی مٹی سے
فاصلوں کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگتی ہے
خاک اڑنے لگتی ہے
واہموں کے سائے سے

عمر بھر کی محنت کو
پل میں توڑ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی ساتھ چھوٹ جاتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی اجنبی سے لگتے ہیں
غیر بن کے ملتے ہیں۔۔۔

☆☆☆

کمرے کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اس نے کھول تو لیا مگر سامنے بیڈ پر ٹریک سوٹ پہن کر بیٹھے ناصر بھائی کو دیکھ کر گویا وہیں بت بن کر بس کھڑی ہی رہ گئی۔

آلتی پالتی مار کر بیڈ پر بیٹھے ناصر بھائی ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑے ہوئے تھے جب کہ ان کے عین عقب پر گھٹنوں کے بل بیٹھی عائشہ بھابھی بائیں ہاتھ کی کٹوری بنائے دائیں ہاتھ کی پوروں سے اُن کے سر میں مساج کر رہی تھیں۔

ندی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

''ندی تو شاید آج کچھ بزی ہے آپ کے سر میں مساج میں کر دیتی ہوں۔''

ماضی کی چق ہٹاتے کچھ خیالات ''حال'' میں بھی اپنا حصہ ڈالے ہوئے تھے۔ لاؤنج میں چینل سرچنگ کرتے ناصر بھائی، ہاتھ میں اخبار کھول کر پڑھنے کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر دھیمی سی پُرشفقت مسکراہٹ کے ساتھ فرداً فرداً سب لوگوں پر نظر ڈالتے بابا، صوفے پر بیٹھ کر سامنے ٹی ٹیبل پر آج دوپہر کے مینیو کے حساب سے رکھی گئی سبزی، آلو، پیاز وغیرہ کاٹتی امی، کارپٹ پر کتابیں پھیلائے فلور کشن پر بیٹھ کے صوفے سے ٹیک لگا کر موبائل پر باتیں کرتی ندی اور ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑے عین ناصر بھائی کے دائیں طرف اُن کی اجازت کی منتظر عائشہ بھابھی۔۔۔

وقت کی چق ذرا سا کیا سرکی ماضی بالکل حال لگنے لگا تھا۔

''نا بابا نا، مجھے تو تم معاف رکھو۔''

ناصر بھائی مصنوعی خوف کا اظہار کرتے عائشہ بھابھی کے ہاتھ سے تیل کی شیشی لیتے تو بابا کی مسکراہٹ گہری پڑ جاتی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا، نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔''

عائشہ بھابھی منہ بناتیں تو امی سبزی سے لمحہ بھر دھیان ہٹا کر اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوتیں۔

''ناصر بیٹا، عائشہ مساج کرنا چاہ رہی ہے تو کروالو، منع کیوں کیا؟''

''امی مجھے تو گنجا ہو جانا منظور ہے مگر میں اس سے مساج نہیں کروا سکتا۔''

عائشہ بھابھی منہ بسور کر پہلے ناصر بھائی کو اور پھر امی کو دیکھتیں۔ اسی دوران ندی بھی اپنا موبائل پیچھے صوفے پر رکھ کر ان سب کی طرف متوجہ ہوتی۔

''بھائی ایسا تو نہیں ہے کہ بھابھی مساج کے بہانے اپنے ناخنوں سے آپ کا سر چھیل دیتی ہیں۔''

ربڑ بینڈ اتار کر ڈھیلی ہوتی پونی کو ندی نے ایک بار پھر ذرا ٹائٹ کر کے باندھتے ہوئے کہا تو اس کی بات پر سبھی کا مشترکہ قہقہہ سا بلند ہوتا۔

''ارے نہیں ایسی بات نہیں ہے مگر جو سکون ندی سے مساج کروانے میں آتا ہے وہ بات عائشہ میں کہاں۔''

عائشہ بھابھی سلاد کے لیے کاٹی گئی گاجر اٹھا کر منہ میں ڈالتیں اور تنبیہی نظروں سے ناصر بھائی کو دیکھتیں تو انہیں وضاحت کرنی ہی پڑتی۔

''آخر کو میری پیاری سی لاڈلی بہن جو ہے اور بہن بھی وہ جس کے مقابلے کا پوری دنیا میں کوئی نہیں۔''

''آئی ریئلی لو یو بھائی، لو یو، لو یو سو مچ۔''

ناصر بھائی کی بات پر ندی خوشی سے اٹھ کر ناصر بھائی کے صوفے کے عقب میں کھڑی ہوتے ہوئے ان کی گردن کے گرد بازو حمائل کرنے کے ساتھ ساتھ لو یو کا ورد کرتی جھومنے لگتی۔

عائشہ بھابھی کی مسکراہٹ اور امی، بابا اور ناصر

بھائی کے قہقہے جو فضا میں بکھرتے تو دیر تک چہرے پر [illegible] چھوڑ جاتے۔

''کیا بات ہے ندی! کوئی کام ہے؟''

وقت کی وہ چق حالات کی تیز ہوا کے چلنے سے چند لمحے پھڑپھڑاتے رہنے کے بعد ایک بار پھر دروازے سے جا لگی تو ماضی کے تمام خوشگوار لمحات پھر سے اوجھل ہو گئے۔

سامنے بھی تو حال کی پتھریلی زمین پر کھڑی ندی، جس کے پاؤں بھی ننگے تھے اور ساتھ کسی مہربان وجود کا احساس بھی نہ تھا۔

چند لمحے تو وہ کوئی بھی جواب دینے سے قاصر رہی۔

ناصر بھائی کے چہرے پر جس طرح اسے دیکھتے ہی ناگواریت ابھری تھی وہ احساس ندی کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اسی احساس کے تحت اسے لگا جیسے زبان آج اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ گوشت کا لوتھڑا اپنی بے حس و حرکت زبان اس کے لاکھ چاہنے کے باوجود بھی ہلنے جلنے پر آمادہ نہ تھی۔

وہ زندہ تھی، اپنے قدموں پر کھڑی اپنا آپ خود سنبھالے ہوئے تھی۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ یہ سب اتنا ہی سچ تھا جتنا سمندر کا پُرسکون ہونا۔

ہم میں سے کوئی بھی یقیناً سمندر کے پُرسکون ہونے کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتا۔ مگر اس امر سے بھی سبھی واقف ہیں کہ یہ صرف ظاہری طور پر نظر آنے والی سمندر کی سطح ہے اور بس! اس کی تہ میں کتنے طوفان پلتے ہیں عام طور پر اس بات کو جاننا شاید اتنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہو

(دل دریا، سمندر جیسے گہرے ہوتے ہیں اور دلوں کے حال بھلا کون جانتا ہے۔)

ظاہری طور پر وہ خاموش آنکھیں اور سنجیدہ چہرہ لیے ان کے سامنے تھی۔

وہ ناصر بھائی جو ندی کو دیکھے بغیر خود کو نامکمل تصور کرتے تھے آج اسے دیکھتے ہی چند لمحے ناگواریت سے منہ پھیر کر بیٹھے رہنے کے بعد آخر کار اٹھ کر کمرے سے ہی نکل گئے تھے۔

عائشہ بھابھی نے باتھ روم جا کر ہاتھ دھونے کے بجائے ہتھیلی میں باقی بچ جانے والا تیل کریم کی طرح ہاتھوں پر لگاتے ہوئے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''بھابھی! میرا موبائل کہاں ہے؟''

وہ ان سے کسی بھی طرح کی کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے تمہید باندھنے کا تکلف کیے بغیر ڈائریکٹ اپنے مقصد کی بات کر کے اب جواب طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی، جو حیرت سے آئی بروز سکیڑتی اب بیڈ سے نیچے اتر رہی تھیں۔

رسماً، تکلفاً یا مروتاً بھی انہوں نے ندی کو اندر آنے کا نہیں کہا تھا۔ سو وہ اسی طرح بیچ دروازے کے کھڑی تھی جیسے ناصر بھائی کے جانے کے لیے رستہ چھوڑنے کی غرض سے کھڑی ہوئی تھی۔

''تمہارا موبائل؟ پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے مجھے دیا تھا کبھی۔''

''میں نے آپ کو دیا تو نہیں تھا مگر مجھے مل بھی تو نہیں رہا۔''

محتاط لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے جواب دیا تو عائشہ بھابھی سر جھٹک کر مسکرا دیں۔

پنک ٹراؤزر اور شرٹ پہنے اس نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔ ورنہ صبح جاگنے کے بعد فریش ہو کر سب سے پہلے وہ یہ ڈریس (جسے وہ نائٹ ڈریس کے طور پر استعمال کرتی تھی) تبدیل کرتی اور پھر ناشتے کی میز پر آتی۔

مگر یہ تب کی بات تھی جب گھر کے سبھی افراد ایک ساتھ ناشتے کی غرض سے ڈائننگ ٹیبل تک آتے۔ اب تو حال یہ تھا کہ ندی کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ناصر بھائی گھر پر ہیں ورنہ ان کے کمرے میں ہرگز نہ آتی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب کچھ بھی نہیں ہے بھابھی! لیکن اس دن یونیورسٹی سے آنے کے بعد سے لے کر اب تک مجھے موبائل نہیں ملا، گھر کے نمبر سے کال بھی کر کے دیکھ لیا، فون باقاعدگی سے چارج ہو رہا ہے تو آخر گھر میں ہی کسی کے پاس ہے نا۔"

"ہاں تو گرا ہوا ہوگا ادھر اُدھر کہیں صوفوں وغیرہ کے پیچھے۔"

لاپروائی سے کہتے ہوئے انہوں نے خود کو مصروف ظاہر کرنے کی غرض سے بیڈ شیٹ پر موجود چند سلوٹوں کو بڑی دلجمعی سے درست کرنا شروع کیا۔ یوں جیسے اس وقت ان سلوٹوں کا دور ہونا ہی دنیا کا اہم ترین کام ہے۔

"کہیں گرا ہوتا تو اب تک تو بیٹری ختم ہو جانے کی وجہ سے بند پڑا ہوتا نا۔"

"تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو؟"

جھک کر بیڈ شیٹ ٹھیک کرنے کے دوران انہوں نے اس کا چہرہ دیکھنے کے بجائے ذرا سی گردن موڑ کر چند ثانیے کے لیے نظریں اس کے سپید پاؤں میں پہنے ہیلو کٹی (Helo kitty) کے سلیپرز پر ٹکا دیں۔

"بھابھی! کاش آپ نے اسی طرح رشتوں میں جنم لیتی سلوٹوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہوتی۔"

تن دہی سے بار بار بے شکن بیڈ شیٹ پر ہاتھ پھیر کر اب نادیدہ سلوٹوں کو دور کرتی عائشہ بھابھی کے سامنے آخر اس کی زبان سے شکوہ پھسل ہی گیا سو پوچھی گئی بات نظر انداز کر گئی۔

"رشتوں میں سلوٹیں خود تمہارے کرتوتوں سے پیدا ہوئی ہیں ندی! تم نے اعتماد توڑا ہے سب کا، یونیورسٹی کا کہہ کر ہوٹلوں میں عیاشی کرتے ہوئے تو تمہیں ان رشتوں کا خیال کبھی نہیں آیا ہونہہ اور اب مجھے مشورے دے رہی ہو۔"

"بھابھی! میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ یہ سب ایک من گھڑت کہانی ہے، جھوٹ ہے سب، اور یاد رکھیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، جب گرتا ہے منہ کے بل گرتا ہے۔"

"چلو مانا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر اسکینڈل کے پر ضرور ہوتے ہیں اور تمہارا یہ اسکینڈل خیر سے بڑی تیز پرواز کرتے ہوئے نا صرف خاندان بلکہ ہر جاننے والے کے گھر میں بڑی شان سے اترا ہے۔"

طنز کرنے میں وہ اتنی ماہر ہیں، یہ اندازہ بھلا پہلے کب تھا کسی کو۔

"اور اب وہ سب لوگ جو پہلے تمہاری خوب صورتی کی باتیں کرتے تھے نا، اب اخباروں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہاری خبر پڑھتے اور سب کو سناتے ہیں۔"

"مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں، لوگوں کے سامنے تو فرشتہ بن کر بھی آ جاؤ تو تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ میرا دل اور سب سے بڑھ کر میری ماں کا اعتبار میری ذات پر ابھی تک قائم ہے تو مجھے کسی اور کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم لوگوں کے دل میں ناصر کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔"

ندی نے بات کرتی عائشہ کی نظروں کے تعاقب میں گردن موڑی تو سامنے کھڑے ناصر بھائی کو دیکھ کر ایک دم چونک گئی۔

چہرے کی تنی ہوئی رگیں اور بھینچے ہوئے جبڑے بتا رہے تھے کہ مکمل گفتگو نہ سہی مگر آخری بات وہ ضرور سن چکے تھے۔

شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ ندی اب تک واپس جا چکی ہوگی جبھی اپنے کمرے میں دوبارہ آئے تو ضرور، مگر اسے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر کسی کی بھی پروا نہ ہونے کا اعلان سن کر وہیں رک گئے۔

"مجھ پر موبائل کا الزام لگانے کے بجائے اپنے ہی کمرے میں ڈھونڈو، ورنہ لینڈ لائن استعمال کر لو، ایسا بھی کون سا پرائیویٹ فون کرنا ہے تم نے جو موبائل کے بغیر سب کے سامنے نہیں ہو سکتا۔"

لوہا گرم دیکھ کر عائشہ بھابھی نے ایک اور ضرب ماری تھی۔

ناصر بھائی کا یوں ایک دم پھر سے اس کے عقب میں موجود ہونا اور ان کی موجودگی میں عائشہ بھابھی کا اس طرح کی بات کرنا۔۔۔

ندی کو لگا جیسے کمرے میں نیم کے ڈھیر سارے پتوں کی کڑواہٹ ایئر فریشنر کی جگہ لے چکی ہو۔ پل بھر میں جیسے فضا میں ترس اور رحم کی ملی جلی آہیں، رسوائی اور بے عزتی کے ساتھ مل کر سسکیاں لیتے ہوئے ہولے ہولے بین کر رہی ہوں۔

پھر اس کے بعد وہ رکی نہیں اور انہی قدموں پر واپس پلٹ گئی۔

ادب کی بات ہے ورنہ منیر سوچو تو
جو شخص سنتا ہے، وہ بول بھی تو سکتا ہے

☆☆☆

گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہم دم میرے دوست
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ تیرے دل کی تھکن
میری دل جوئی میرے پیار سے مٹ جائے گی
گر میرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر تیرا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہم دم میرے دوست

جم خانہ سے واپسی پر ٹینا ثانی کی دل میں اترتی آواز اور فیض احمد فیض کے خوب صورت الفاظ اکمل کو مزید بے چین کیے دے رہے تھے۔ ندی بھی اس جم خانہ کی مستقل ممبر تھی۔ جواب یونیورسٹی میں دیر سے آف ہونے کے باوجود روز نہیں مگر ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور یہاں آیا کرتی تھی۔ اپنی خوش مزاجی سے نہ صرف جہاں بیٹھتی اس جگہ کی جان کہلاتی بلکہ اکثر عمر رسیدہ خواتین و حضرات بھی اس کے بڑے فین تھے اس لیے کہ وہ ان کے لیے بہترین سامع ثابت ہوا کرتی تھی۔ آج جم خانہ جا کر اکمل کو ندی کے بارے میں بڑے متضاد کمنٹس سننے کو ملے تھے۔

ان تمام لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے نزدیک یہ سب باتیں معیوب نہ تھیں مگر اس کے باوجود وہ لوگ بھی اس کے یوں "چوری چھپے" اور "غلط بیانی" کر کے شاہ زین کے ساتھ گھومنے اور اِدھر اُدھر جانے پر خائف تھے۔

یوں بھی چونکہ سبھی جانتے تھے کہ اکمل اور ندی میں عائشہ بھابھی کی وجہ سے رشتہ داری بھی ہے سو سبھی نے اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے بات شروع کر کے ایک دفعہ پھر تمام حالات و واقعات دوہرانا شروع کر دیے کہ مبادا اکمل ان سب سے ناواقف ہو۔

واقعی کہنے والے درست کہتے ہیں کہ مارنے والے کا ہاتھ تو پکڑا جا سکتا ہے مگر بولنے والے کی زبان نہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ چپ چاپ منہ میں لونگ دبائے ان کی باتیں سنتا رہا ہو۔ ان سب باتوں کی اکمل نے بھرپور طریقے سے تردید کرتے ہوئے سبھی افواہوں کو رد تو کر دیا تھا مگر جانتا تھا کہ جس طرح کے تاثرات ان کے چہرے پر ابھرے تھے ان سے ہرگز اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کی تردید پر یقین کرتے ہوئے آئندہ اس بات کو زیرِ بحث نہیں لائیں گے۔

ندی کے بارے میں اس طرح کی باتیں سننے کے بعد بس پھر اس کا جی ہی نہیں لگا کہ وہاں مزید رکتا۔ حالانکہ گھر سے آج وہ گولف کھیلنے کی نیت سے آیا تھا مگر آتے ہی یہ سب سن کر اب اس کا جی اوب گیا تھا سو کچھ دیر یونہی سرسبز و شاداب گھاس کے اطراف میں رکھی گئی سنگی بینچ پر بیٹھنے کے بعد گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور اب یونہی بلا مقصد ٹینا ثانی اور فیض کی ہمراہی میں دھیمی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے مسلسل ندی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود اس وقت وہ ذہنی دباؤ محسوس کر رہا تھا تو ندی کا کیا حال ہوگا۔ یہ سوچ اسے فی الحال اسٹیئرنگ گھر کی طرف موڑنے سے روک رہی تھی کیونکہ وہ کچھ دیر اسی سوچ

کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔
ندی سے ہونے والی ٹیلی فونک بات چیت میں اس کا شکستہ لہجہ اکمل کو بے چین کر رہا تھا۔ جب تک وہ یہاں رہا تھا ندی کی سپورٹ اسے ہر معاملے میں حاصل رہا کرتی تھی کہ وہ خود تو بچپن میں ذرا جذباتی سا واقع ہوا تھا۔ مگر ندی اس سے تھوڑی بڑی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اس کے دفاع کے لیے آن موجود ہوتی اور اب جبکہ کل اس کی واپسی تھی تو وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ ایسا جو پھر سے اس کے چہرے کی مسکراہٹ لوٹا دے۔
کل چونکہ اس کی واپسی تھی اس لیے عائشہ بھی اس سے ملنے اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ایسے میں جبکہ عائشہ ندی کے مخالفین میں سر فہرست تھی تو ندی سے دوستی کا تعلق، عائشہ کے خون کے رشتے پر غالب آگیا۔ عائشہ ہمیشہ ندی کے خلاف ممی کے سامنے زہر ہی اگلا کرتی، فلاں رشتہ دار اب یہ کہہ رہا ہے فلاں وہ۔۔۔ اسی وجہ سے اکمل اب عائشہ اور ممی کی گفتگو کے دوران وہاں کم ہی موجود رہتا اور اگر بیٹھا ہوتا تو ان دونوں کو ندی کے بارے میں یہ سب کہنے کی اجازت نہ ہوتی۔
یوں بھی اکثر اوقات تعلق، رشتوں سے جیت بھی تو جاتے ہیں نا۔
ایسا بھی تو ہوتا ہے نا کہ خون سے بڑھ کر الفاظ کا تعلق ہمیں عزیز تر لگنے لگتا ہے۔
شاید اس لیے کہ خون کے رشتوں میں انتخاب ہمارا نہیں ہوتا، ہمیں انہیں محض قبول کرنا یا اپنانا پڑتا ہے کہ ہم رشتہ داروں کا انتخاب خود نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس باقی تعلقات ہماری چوائس اور ہمارے ذہنی معیار کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے دور ہو کر بھی نزدیک لگتے ہیں۔ ان سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ ہمارے اوپر کسی بھی طور مسلط نہیں کیے گئے ہوتے بلکہ ہمارا انتخاب ہوتے ہیں۔

گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہمدم میرے دوست
روز و شب شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے، مہتاب کے، ستاروں کے گیت
گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہم دم میرے دوست

ٹینا ثانی انتہائی جذب کے عالم میں فیض کے گزرے گئے لفظوں سے بھرپور انصاف کر رہی تھی۔ سو اکمل نے کچھ سوچا اور گاڑی کا اسٹیئرنگ ندی کے گھر کو جاتے رستے کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆

ملکانی سائیں پچھلے دس پندرہ منٹ سے سوئی کو گود میں لیے اس کے نرم و ہموار ناخنوں پر سوفٹن لوشن کا مساج کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ کسی ننھے بچے کی طرح اُس سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ لوشن وہ شہر کے مشہور ترین Veterinary سے سوئی کے ناخنوں کو نرم رکھنے کے لیے لائی تھیں تا کہ اسے گود میں لینے یا اس کے ساتھ کھیلنے کی صورت میں کسی کے ہاتھوں اور بازوؤں پر اسکریچز نہ پڑیں۔
وہ بھی بڑے پرسکون انداز میں اپنی گہری سبز آنکھوں کو ملکانی پر مرکوز کیے جیسے ان کی تمام باتیں سمجھ رہی تھی۔ جبھی تھوڑی دیر بعد ہلکی آواز میں میاؤں کہہ کر ان کی باتوں کا جواب بھی دیتی۔ کچھ دیر سوئی کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد ایک نظر وال کلاک پر ٹائم دیکھا اور پھر اسے گود سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گو کہ صبح صادق کا وقت تھا مگر وہ اسی وقت اٹھ جایا کرتی تھیں اور پھر آج شاہ سائیں گاؤں آنے والے تھے سو اب انہیں کچن میں جا کر سب سے پہلے کھانے کا جائزہ لینا تھا مگر بیڈ روم سے نکلنے سے پہلے ایک دم باہر کو اٹھتے قدم سنگھار میز کے سامنے جا کر تھم گئے۔ تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔
آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لپ اسٹک، گالوں پر ہلکا سا غازہ۔۔
میک اپ کوئی بہت زیادہ تیز تو نہیں تھا مگر پھر بھی انہیں آئینے میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے میک اپ ہلکا ہلکا سا کیا نہ ہو بلکہ ماسک کی طرح چپکا دیا ہو۔ حالانکہ ایسا تھا تو نہیں پھر انہیں ایسا کیوں لگ رہا تھا۔
بے چینی سے وہ آنکھوں میں الجھن لیے اپنے سوال کے جواب کے لیے وہیں شیشے کے سامنے ہی کھڑی رہیں۔
دونوں ہاتھوں میں طلائی انگوٹھیاں دائیں کلائی میں چار کشمیری جڑاؤ کنگن اور بائیں کلائی میں انتہائی نفیس بل دار خوب صورت سونے کی چودہ چوڑیاں، کانوں میں تین منزلہ ڈھولکی جھمکے اور گلے میں جھولتا ڈائمنڈ کا لاکٹ۔
پھر ایسا کیوں تھا کہ انہیں اپنے چہرے پر مصنوعی پن محسوس ہوا۔
سوئی کمرے میں ادھر اُدھر گھومنے کے بعد اب ملکانی سائیں کے پاس کھڑی تھی۔
کچھ دیر یونہی چپ ان کے ساتھ کھڑی رہی اور اس کے بعد میاؤں کی آواز نکال کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تو ملکانی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی اور تبھی انہیں آئینے میں نظر آتے اپنے عکس میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ ایسا لگا جیسے ماسک چٹخنے لگا ہو۔
سو گردن کو اوپر نیچے حرکت دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہونٹوں کو کھل کر مسکرانے کی اجازت دی تو اپنا وجود آپ اٹھانا بھی سہل لگنے لگا۔
باوجود اس کے کہ آنکھوں کی خشک دھرتی ہنوز اداس تھی مگر ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کم از کم آج شاہ سائیں کے ساتھ وہ اپنے اس دکھ کو شیئر کر کے ایک بار پھر ان آنکھوں کو آنسوؤں کی بارش سے سیراب کر لیں گی جس دکھ کا ذکر وہ خود سے تنہائی میں بھی کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔
شاہ سائیں کے آنے میں کچھ وقت باقی تھا اور ملکانی سائیں نے سب سے پہلے کچن میں جا کر ان کے لیے تیار کردہ ناشتے کو اپنے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر رکھوانا تھا اور پھر دوپہر کے کھانے کے متعلق ہدایات دے کر حویلی کے وسیع و عریض اور کشادہ برآمدوں کے چپس کے پختہ فرش پر چہل قدمی کرتے ہوئے ان کا انتظار بھی کرنا تھا۔
جس دن انہوں نے شہر سے گاؤں آنا ہوتا اسی طرح علی الصبح آیا کرتے۔ سو ملکانی سائیں نے بلوچستان کی باریک شیشے دار کڑھائی کی جڑاؤ چادر ایک بار پھر سیٹ کر کے کندھوں پر پھیلائی اور سوئی کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

اے دل
اے نادان
تجھ کو سونا کر گئے
بس
دو دن کے مہمان

شاہ زین کتنی ہی دیر سے بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا سامنے موجود ندی کو بس دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ آخری روز وہ واقعی نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی اور پھر واقعی نظر لگ بھی گئی۔
اس پر پڑنے والی کوئی نظر ایسی نہ تھی جو پھسل گئی۔ جس نے دیکھا بس یک ٹک دیکھتا ہی رہا۔ جہاں گئی سب کی گردنیں سورج مکھی کے پھول کی طرح اس طرف خود بخود مڑتی چلی گئیں۔ کتنے ہی یونیورسٹی فیلوز اس کی کانچ سی آنکھیں اپنی طرف اٹھنے کی خواہش کرتے مگر وہ جنگل کی مغرور ہوا کی صورت کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ خوش اخلاقی تو اس کا خاصہ تھی مگر جہاں کوئی اس سے آگے بڑھنے لگتا فوراً ٹرین کے ایمر جنسی گارڈ کی طرح سرخ جھنڈی دکھا کر وہیں رک جانے اور آگے نہ بڑھنے کا واضح اشارہ کرتی۔
اس رات کا ایک ایک لمحہ شاہ زین کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے ہوئے تھا۔ اسے لگتا جیسے ندی کا عکس اس کے دل پر مرتسم ہونے کے بجائے وجود کی کسی اور گہرائی پر نقش ہوا تھا۔ یوں جیسے کہ یادداشت کے صفحے پر اس کے نقش کو لوح پر اتار کر رقم کیا گیا تھا اور اب سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے بس اسی کا چہرہ آنکھوں میں گھومتا رہتا۔

بلاشبہ اُسے زندگی اللہ نے عطا کی تھی مگر زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح گزارنا اُسے حقیقی معنوں میں ندی نے ہی سکھایا تھا۔

اُس سے دوستی ہونے کے بعد شاہ زین نے زندگی کو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے جیا تھا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ندی نے زبیر اور صبا کے ساتھ نا صرف نئے آنے والے اسٹوڈنٹس کو بے وقوف بنانے کا پلان بنایا بلکہ ناراض ہو جانے کی جذباتی دھمکی دے کر شاہ زین کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھا۔

دو سرخ و سپید مومی ہاتھوں کی انگلیاں چق کی بیرونی سائیڈ پر نمودار ہوئیں اور آن کی آن چق کی اندرونی سائیڈ کا تمام منظر بہار کے خوش رنگ پھولوں کی طرح تروتازہ ہو گیا۔

''دیکھیں یقین کریں میں فرسٹ ایئر فول نہیں ہوں۔ میں تو کتنے سالوں سے۔۔۔''

''اچھا تو تم کتنے سالوں سے فول ہو؟''

زبیر نے سامنے کھڑے ''شکار'' کو جواب دیا اور باقی لوگوں کی شکلوں کا جائزہ لیا۔ سبھی ایک سے بڑھ کر سہمے ہوئے تھے۔

''نہیں میرا مطلب تھا کہ میں تو دو سالوں سے پڑھ رہا ہوں۔''

''سالوں سے پڑھ رہے ہو؟ کیوں یہ سارے پروفیسرز کس چیز کی تنخواہ لیتے ہیں جو تم نے پھر بھی اپنے ''سالوں'' سے ہی پڑھنا ہے۔''

ندی نے جان بوجھ کر سامنے کھڑے لڑکے کو تنگ کرنے میں اپنا حصہ ڈالا۔

''دیکھیں میں پرانا اسٹوڈنٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ سب آپ چاروں کا پیسے بٹورنے کا طریقہ ہے۔''

دیکھنے میں انتہائی پڑھاکو ٹائپ اُس لڑکے نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ صاف کرنے کے لیے چشمہ اتارا اور آنکھیں اور پیشانی صاف کرنے کے بعد دوبارہ ناک پر ٹکالیا۔

''غلط فہمی ہے تمہاری، ورنہ ہم تو کسی کے پیسوں کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھتے۔''

صبا نے چہرے پر غصیلے تاثرات جماتے ہوئے ڈپٹا۔

''اور کیا، ہم تو ہاتھ، منہ، کان، آنکھ سب دھو کر آتے ہیں۔''

ندی نے ننھی سی ناک پر موجود زرقون کی نوز پن پر خارش کرتے ہوئے اپنے سمیت ''چاروں کی صفائی'' پیش کی۔

''میں دوسرے ڈیپارٹمنٹ کا ضرور ہوں مگر آپ نے تو مجھے اکثر دیکھا ہے نا پہلے۔''

آخری امید کے طور پر زیرِ عتاب لڑکے نے ندی کے ساتھ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ایک ٹانگ پیچھے کی طرف موڑ کر پاؤں دیوار پر ٹکائے ایک ٹانگ پر کھڑے شاہ زین کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ اوائل نومبر کی نیم گرم دھوپ کی طرح پھیلی تھی۔

اور یقینی طور پر شاہ زین کے لیے اس کا مخاطب کرنا غیر متوقع تھا جبھی یوں سب کا اس کی طرف متوجہ ہونا اسے لمحے بھر کے لیے گڑبڑا گیا۔ مگر پھر گہری سانس لے کر پہلے تو دونوں پاؤں متوازن جگہ پر رکھے اور پھر بولا۔

''ہاں تم جاؤ۔۔۔''

شاہ زین کے کہتے ہی ندی نے فوراً اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے غلطی کا احساس دلایا مگر ندی کی انگلی میں موجود خوب صورت سی انگوٹھی اس دباؤ کے نتیجے میں زور سے چبھنے کے باوجود شاہ زین نے نہ تو کوئی ردِعمل ظاہر کیا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا ہی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''صبور۔۔۔ صبور نام ہے میرا۔''

اس کے تن مردہ میں تو جیسے جان پڑ گئی تھی سو فوراً بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

''زیادہ ہمدردیاں مت دکھاؤ، یار کیا کرتے ہو شاہو۔''

صبور کے جانے کے بعد دیوار کی طرف رخ کر کے ندی نے اسے سمجھایا۔

صبا اور زبیر نے بھی اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ خاموشی سے ان کی دیگر کارروائیاں دیکھتا گیا۔

کسی کو دونوں پاؤں باندھ کر کیٹ واک کرنے کا کہا گیا تو کسی کو مختلف سیاست دانوں کی نقل اتارنے کا، کسی سے پھونک مار کر بلب بجھانے کی فرمائش کی گئی تو کسی کے سر پر کتابیں رکھ کر اسے چلنے کا آرڈر جاری کیا گیا۔

اور بعد میں سب کے چلے جانے پر خود سب کی نقل اتارتی اس قدر ہنسی کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہی سرخ و سپید مومی ہاتھ، ہنستے ہنستے بھیگ جانے والی آنکھیں جو صاف کرنے لگے تو چق ایک دم ہی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

شاہ زین نے ایک دم آنکھیں کھولیں اور سینے پر موجود یادوں کی بھاری سِل کو گہری سانس لے کر ہٹانے کی سعی کرنے لگا مگر ناکامی ہوئی۔ حیرت کی بات تھی کہ ندی جو آج تک صرف ایک شرط کی خاطر اس کے جذبات سے کھیلتی رہی کبھی بھی منفی احساسات کے زیرِ اثر اسے یاد نہ آئی تھی۔

جب بھی یاد آتی دل اسی طرح اس پر محبتوں کے خزانے نچھاور کرنے کو تیار نظر آتا جس طرح اس رات اس کے ہاتھوں میں بریسلیٹ پہناتے ہوئے تھا۔

اسے ابھی تک ندی سے نفرت نہیں ہو پائی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے دل ہی دل میں بھی برا بھلا نہ کہہ پاتا تھا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آخری دفعہ ملتے ہوئے گو کہ اخبار میں چھپی ہوئی خبر کے پیشِ نظر پریشانی تو ضرور تھی مگر محبت کی گرہ ان دونوں کے دلوں میں بے حد مضبوطی سے لگی ہوئی تھی اور شاید محبت کے ان ہی رابطوں اور استعاروں کے باعث (جو کہ ان دونوں کے دلوں میں باہم موجود تھے) ساون کے اندھے کی طرح شاہ زین کسی دوسری سمت دیکھ ہی نہ پاتا یا شاید دیکھ کر آنکھیں چرا لیتا۔

بہرحال جو بھی تھا سچ تو یہ تھا کہ جس طرح حادثاتی موت کے بعد مرنے والے کو جب تک دیکھ نہ لیا جائے۔ دل ایسی اطلاعات پر یقین نہیں کرتا، مانتا نہیں تاوقتیکہ آخری دیدار نہ کر لیا جائے بالکل اسی طرح سب کچھ سن لینے اور خود ندی کی طرف سے کیے گئے میسجز کے باوجود پتا نہیں کیوں اسے ندی کی محبت خالی کنویں کی بازگشت کی طرح معلوم ہوتی۔ جو جتنی دفعہ آواز کے روپ میں کنویں کی دیواروں سے ٹکراتی اتنی ہی شدت سے بازگشت کے روپ میں واپس آ کر سماعتوں کو سیراب کر ڈالتی۔

ندرت سے کی گئی محبت اسے صبح صادق کے وقت پھولوں پر پڑتی وہ شبنم معلوم ہوتی جس کا کسی پتی کو خود پر بوجھ محسوس نہ ہوتا۔ جبھی ظاہری طور پر ناتا ٹوٹ جانے اور ندی کی طرف سے شرط جیت جانے کے بعد اسے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال باہر کرنے کے باوجود یہ سچ تھا کہ اسے اب بھی ندی سے محبت تھی۔

البتہ فرق تھا تو یہ کہ اس کا روپ بدلنے پر شاہ زین اندرونی طور پر خود کو کسی جنگلی قیدی کی طرح مجبور اور بے حال سمجھنے لگا تھا۔ رہائی کی آس میں آنکھوں سے ہوتی آنسوؤں کی بارش سے جس نے دل کے ریگزاروں میں ابھی تک محبت کے مرغزار اُگا رکھے تھے۔

تم جو چاہو تو بھلا دینا گئے پل کی طرح
میری بات اور ہے میں نے محبت کی ہے

☆☆☆

آج رات اکمل کی واپسی تھی اسی لیے عائشہ بھابھی کل کی آئی ہوئی ابھی تک وہیں موجود تھیں۔ ایسا بہت ہی شاذ ہوتا جب وہ رات بھر رکنے کے ارادے سے آتیں ورنہ تو ان کے آنے کے ٹائمنگز اس طرح کے تھے کہ صبح ناصر بھائی آفس جاتے ہوئے انہیں اتار جاتے اور واپسی پر طے شدہ وقت کے عین مطابق وہ تیار رہتیں اور ان کی گاڑی کے ہارن سے ہی فوراً

باہر نکل آتیں۔

ممی ڈیڈی سے ناصر بھائی کی تفصیلی ملاقات عید تہوار پر ہی ہوا کرتی۔

وہ اس گھر کے داماد تھے یہ بات انہیں ہمیشہ "یاد" رہتی تھی۔ اسی لیے انداز میں کچھ تو دامادوں سے نخرے تھے اور کچھ قدرتی طور پر طبیعت میں غصے کا عنصر زیادہ۔

اسی لیے ملنے جلنے میں ذرا احتیاط برتا کرتے۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ دامادوں کو سبزی بیچنے والوں کی طرح ہر روز آواز لگا کر اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بجائے ڈاکیے کی طرح کبھی کبھار آنا چاہیے تاکہ اس کے آنے کے انتظار میں دن گنے جائیں۔ اس کی آمد کا گمان گزرنے پر سارے کام چھوڑ کر مین گیٹ کی طرف جانے میں جلدی کی جائے اور اسے دیکھ کر پوری دلچسپی اور شوق سے اس کی بات چیت سنی بھی جائے۔

یوں تو یہ اور اس طرح کی باقی باتیں امی بابا کی تربیت کا حصہ نہیں تھیں مگر انسان اپنی تمام تر عادات و خصائل والدین ہی سے مستعار تھوڑی لیتا ہے۔ بعض اچھی یا بری عادتیں نہ چاہتے ہوئے بھی فضا میں موجود آکسیجن کی طرح بندہ معاشرے سے بھی تو وصول کرتا ہے۔ سو یہ عادت بھی گرد و پیش کی عطا کردہ تھی۔

"کل ندی کہاں گئی ہوئی تھی؟"

وہ ابھی ابھی جاگنگ کر کے لوٹا تھا اور لاؤنج میں بیٹھا جاگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔ جب عائشہ کچن سے چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر وہیں چلی آئی اور دونوں پاؤں صوفے پر رکھ کر بیٹھنے کے بعد سامنے رکھا اخبار اٹھا لیا جو ابھی چند لمحے پہلے ہی ملازم رکھ کر گیا تھا۔

"کون کہاں گئی ہوئی تھی؟"

اخبار سے نظریں ہٹا کر چونکتے ہوئے سوال پوچھا گیا، مگر اکمل نے ندی کے لیے اپنا سابقہ طرزِ تخاطب "ندرت جی" استعمال کرنے کے بجائے اسی سوال کو پھر سے دوہرایا تو عائشہ نے اخبار تہ کر کے اپنی بائیں طرف صوفے پر ہی رکھا اور میز پر رکھا کپ دوبارہ سے اٹھا لیا۔

"جہاں آنا جانا تھا وہ آچکی، اب وہ کیا منہ لے کر جائے گی دوسروں کے سامنے۔"

لہجے میں طنز چائے میں موجود پتی کی طرح تیز تھا مگر اب چونکنے کی باری اکمل کی تھی۔

"مگر میں کل آپ کے گھر گیا تھا۔"

"ہمارے گھر گئے تھے؟ مگر تمہیں پتا تو تھا کہ میں یہاں آئی ہوئی ہوں۔"

ہونٹوں تک جاتے جاتے کپ رک گیا تھا۔ تنے ابرو آن کی آن میں ملنے لگے تو آنکھیں بھی اپنے قدرتی حجم سے کچھ سکڑتی محسوس ہوئیں۔

"میں ندی سے ملنے گیا تھا۔"

اکمل کا لہجہ عائشہ کو گوند قطیرے کی مانند سرد محسوس ہوا تھا۔

"لیکن کیوں؟ کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی؟ اور وہ بھی اب جبکہ اس کے کرتوت روز کے اخبار کی طرح سب کے سامنے کھلے ہیں۔ ہونہہ نہ باپ کی عزت کا خیال کیا نہ بھائی کی غیرت کا۔ میں تو اول روز سے ناصر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں انتالا ڈنہ کرنے کا کہتی تھی مگر نہیں۔۔۔ بھلا میری کون سنتا۔"

اکمل نے رحم کھاتی نظروں سے بہن کو دیکھا جو اس وقت ایک اعلا گھرانے سے نسبت رکھنے کا دعوا کرتی تو شاید قابلِ یقین نہ لگتا۔

"اب جبکہ خود ان کی لاڈلی نے ہی عزت و کردار کے لات اور منات چوراہے پر لے جا کر توڑے تو میرے سامنے بات نہیں کر سکتے اب۔"

آج عائشہ ایک مڈل کلاس کم پڑھی لکھی لڑکی کے روپ میں نظر آرہی تھی۔

"میں اول روز سے آپ کو کہہ رہا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے بات کو مت اچھالیں مگر آپ۔۔۔ سمجھ نہیں آتا کیا سے کیا ہو گئی ہیں آپ۔"

"یہ میرے گھر کا معاملہ ہے اور تم اتنی وکالتیں مت کرو اس کی پلیز۔"

آج وہ جا رہا تھا سو وہ خوامخواہ موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"دوسروں کے گناہ گنتے رہنے سے بندہ خود پارسا نہیں بن جاتا، اس لیے گناہ گار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اللہ کو ہی کرنے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ یہی نا کہ میں اور ناصر بھی شادی سے پہلے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔"

اکمل بات کو کسی اور رخ کی طرف مڑتا دیکھ کر مسلسل نفی میں سر ہلا کر بولنے کی کوشش ہی کرتا رہا مگر کامیابی نہ ملی۔

"ہم اگر ملتے تھے تو گھر والوں کو پتا ہوتا تھا۔ ندی کی طرح یونیورسٹی کا کہہ کر آوارہ لڑکوں کے ساتھ ہوٹلوں، فلیٹوں میں وقت نہیں گزارتے تھے۔"

بولنے پر آئیں تو عائشہ نے اگلے پچھلے سب حساب بے باق کرنے کا سوچا اور اپنے بھائی کو ایسا جواب دینے کی ٹھانی کہ وہ آئندہ اس سے بات نہ کر سکے۔

اس کی آواز سن کر ممی بھی وہیں چلی آئیں۔

"کیا ہو گیا؟ خیر تو ہے صبح ہی صبح؟"

"پتا نہیں، ان سے ہی پوچھیں۔"

اکمل نے بے زاریت سے کندھے اچکائے تو ممی نے استفہامیہ نظروں سے عائشہ کو دیکھا جو اب انتہائی پرسکون انداز میں چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

"جسٹ لیوائٹ ممی، خوامخواہ اس نے صبح ہی صبح ندی کا ذکر کر کے بچی حلق تک کڑوا کر دیا ہے۔"

"میں تو بس یہی کہہ رہا تھا ممی کہ کل میں آپی کے گھر گیا تھا ندی سے ملنے کا کہا تو ناصر بھائی نے کہہ دیا وہ تو گھر پر ہی نہیں ہے، حالانکہ وہ تھی۔"

"تھی یا نہیں تھی، ناصر اس کا بھائی ہے جس سے چاہے اسے ملنے دے جس سے چاہے نہ ملنے دے۔"

ممی نے تو اتنی آسانی سے بات ختم کی جیسے دو جمع دو برابر چار والا سوال ہو۔

"اس بے چاری کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک نہیں ہے ممی۔۔۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ کن عادات و اطوار کی مالک ہے۔ پلیز آپ لوگ ناصر بھائی کا ذہن ندی کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ وہ بے چاری چپ چاپ سوچ سوچ کر ہی خود کو تختہ دار کے حوالے کر دے گی۔"

اکمل پورے دل کی گہرائی اور خلوص سے ندی کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سنجیدہ لفظوں پر مسکراہٹ کا پیرہن چڑھانا چاہتا تھا۔ اسے ایک بار پھر زندگی جینے پر بخوشی آمادہ و رضامند دیکھنا چاہتا تھا اور اسی نیت سے وہ اس سے ملنے بھی گیا تھا۔ جہاں نہ صرف یہ کہ ناصر بھائی کی سرد مہری دیکھنے میں آئی بلکہ ندی سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔

"تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے اسے زندگی کی طرف لوٹانے میں؟"

عائشہ نے اس کے چہرے پر بے چینی دیکھ کر خالی کپ رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری بچپن کی سب سے اچھی دوست ہے وہ، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ساتھ یہ سب غلط ہو رہا ہے، ناانصافی ہے اس کے ساتھ اور میں ان حالات میں اسے معاشرے کے بھوکے شیروں کے سامنے نہتا نہیں چھوڑ سکتا۔"

اکمل کے لہجے، انداز اور الفاظ کو محسوس کرتے ہوئے ممی اور عائشہ نے ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"بچپن کی دوستی اس لیے یاد آرہی ہے کیونکہ تم اس سے کافی عرصے بعد ملے ہو ورنہ جن دوستوں سے تمہارا اب تک رابطہ تھا ان کے لیے ظاہر ہے تمہاری فیلنگز اور ہوں گی۔" ممی نے سمجھانا چاہا۔

"اور اگر تم دوستی سے آگے کچھ سوچنا چاہو تو سوری، اب ایسا کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ بس یہی سمجھو کہ جس طرح بعض اوقات ثابت سموسہ، خوش رنگ سیب اندر سے گندا اور خراب نکلتا ہے اسی طرح ندی بھی اپنی ظاہری خوب صورتی سنبھال نہیں پائی اور اب اس کے اندر کا گند سب کے سامنے ہے۔" الفاظ چباتے ہوئے عائشہ نے اکمل کو اس کے آئندہ کے

لائحہ عمل کے حوالے سے تنبیہ کردی تھی۔ ممی کی گردن کا الف بنے بلتے رہنا مکمل طور پر اس کے لفظوں کی تائید کر رہا تھا۔ اکمل نے گہری سانس لیتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"سوری، مگر میں اپنے فیصلوں اور مستقبل کے معاملے میں آزاد ہوں، وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا اینڈ پلیز نو آرگیومنٹ۔ (اور پلیز بحث نہیں)

بات کر کے وہ رکا نہیں اور فریش ہونے کے لیے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ ممی اور خصوصاً عائشہ کا رویہ اس کے لیے بے حد حیران کن تھا کیونکہ وہ آج تک خود کو ایک مہذب اور سلجھے ہوئے خاندان کا فرد سمجھتا آیا تھا مگر۔۔۔

اکمل کے انداز سے اٹھتی بغاوت کی بو نے عائشہ کے دل میں ندی کے خلاف موجود حسد کو مزید ہوا دی تھی۔ غصے سے اس کے نتھنے نمونیا کے مریض کی طرح پھڑکنے لگے۔

ممی کے چہرے پر بھی کوئی کم تفکر نہ تھا۔ ذہن میں "لوگ کیا کہیں گے" کی سوچ ہمالیہ پہاڑ سے بھی مضبوط اور بڑی تھی۔

مگر پہاڑ بھی تو سر کیے جاتے ہیں نا۔

سو وہ بھی اسی تگ و دو میں دلیل کے مضبوط جوتوں اور سوچ کی لاٹھیوں کا سہارا ڈھونڈنے لگیں۔ باوجود اس کے کہ "اگر" کا خوف پہاڑ کی عین چوٹی پر سر اٹھائے کھڑا تھا۔

☆☆☆

میرا چشمہ نخلستان سائیں میرا بادل سبز شجر
تو بخت میرا تو تخت میرا تو محل میرا تو گھر
میں پنچھی ایک دعا مانگوں تو کر منظور اگر
یا پنجرہ پنجرہ شام نہ دے یا کاٹ لے میرے پر

مہربانو، ملکانی سائیں، میران اور شاہ سائیں کے ساتھ حویلی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی اور ایسا موقع بہت ہی کم ملتا جب وہ چاروں اکٹھے ہوں۔ جبھی مہربانو کا دل چاہ رہا تھا کہ بس وہ اس منظر کو قید کر لے اور جب دل چاہے نکال کر یہی خوشی محسوس کرے جو وہ ابھی کر رہی ہے باوجود اس کے کہ ساتھ بیٹھا ہونے کے باوجود بھی درمیان میں بہت فاصلے تھے مگر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ سب ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور یہ ایسا لمحہ تھا جس کا ذکر واپس ہاسٹل جا کر وہ بھی بڑے فخر سے کر سکتی تھی۔

حسرت بھری نظروں سے باری باری اس نے سب کو دیکھا۔

ملکانی سائیں حسب معمول سونی کو گود میں لیے اس کے گلے میں موجود میوزیکل بیل کا سیل تبدیل کر رہی تھیں۔ اس بیل کا فائدہ یہ تھا کہ اس میں ننھا سا آن اور آف کا بٹن بھی موجود تھا سو جب وہ چل پھر رہی ہوتی تو بٹن آن ہونے کی وجہ سے ملکانی سائیں اور دیگر کو خبر رہتی کہ وہ کس جگہ پر ہے البتہ گود میں لیتے، سوتے وقت یا پھر مزاج کے مطابق میوزک بند کرنے کے لیے "آف" کا آپشن استعمال کیا جاتا۔

شاہ سائیں اب سے چند لمحوں پہلے آنے والی فون کال پر کسی سے بات میں مصروف تھے جبکہ میران ہاتھ میں جدید ماڈل کا موبائل لیے کیا کر رہا تھا اس بات سے وہ بے خبر تھی کیونکہ اسے اتنا اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اس سے یہ سوال کر پاتی۔

ہاں البتہ اس کے برعکس وہ خود یوں کھلے عام بیٹھ کر موبائل ہرگز استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ ملکانی سائیں کو ہی گھبراہٹ ہونے لگتی بار بار آگے پیچھے سے غیر محسوس طریقے سے گزرتے ہوئے اس کے موبائل کو یوں دیکھتیں کہ خود اسے لگتا کہ وہ کوئی غلط کام کر رہی ہے۔ میران گھر میں ہوتا تو جب جی چاہتا مختلف سوال جواب کرنے لگتا۔ تبھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ اتنی دور دوسرے شہر میں اور پھر ہاسٹل میں رہنے کی اجازت ملنا واقعی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

شاہ سائیں الیکشن میں نظر آتی صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے تھے سو مہربانو وقت گزاری کے لیے بس یونہی جوتے سے نہ نظر آنے والی گرد کو فرش پر ملتی رہی۔

ابھی چند سال پہلے ہی شاہ سائیں نے پوری حویلی میں اطالوی سنگ مرمر لگوا کر گویا فرش سے ٹکراتی نظروں کو خیرہ کر ڈالنے کا مکمل انتظام کیا تھا۔

اسی اطالوی سنگ مرمر سے ڈھکے فرش پر جا بجا ایرانی، پاکستانی اور چینی قالین کے خوب صورت سے ٹکڑے بڑے آرٹسٹک انداز میں رکھے گئے تھے۔ اس پر کافرستان سے خصوصی طور پر منگوائے گئے دروازے۔۔۔ پہلی دفعہ آنے والا مبہوت ہوئے بنا نہ رہ پاتا۔ رہی سہی کسر شاہ سائیں کے شکار کردہ شیر، چیتے اور ہڑیال پوری کر دیتے جو حنوط شدہ شکل میں دیواروں پر اس طرح موجود تھے گویا ابھی زندہ ہو جائیں گے۔

"میں نے سنا ہے کہ تمہاری یونیورسٹی میں آج کل کچھ پرابلمز چل رہی ہیں۔۔۔"

مہربانو اچانک شاہ سائیں کی آواز پر چونکی جو فون بند کرنے کے بعد اب میران سے مخاطب تھے۔

"یہ کیا چل رہا ہے آج کل اخباروں میں؟"

ملکانی سائیں کے چہرے پر لمحہ بھر میں پریشانیوں کے بادل اتر آئے تھے۔ سونی کو سہلاتی انگلیاں ایک دم تھمیں تو وہ آہستگی سے نیچے اتر گئی۔

ماحول میں سونی کی بیل کا خوب صورت سا میوزک بکھرنے لگا۔

"میکوں (مجھے) وی تے کچھ بتاؤ نا پتر" پریشانی سے انہوں نے پہلے مہربانو اور پھر میران کی طرف دیکھا۔

یہاں حویلی میں تو مہربانو تک اخبار پہنچتا نہیں تھا اس لیے اس نے چہرے کے تاثرات سے لاعلمی ظاہر کی تو ملکانی سائیں نے پہلے میران اور پھر آخری امید کے طور پر شاہ سائیں کو دیکھا جو خود میران کے جواب کے منتظر تھے۔

میران کے معاملے میں ملکانی سائیں ہر وقت اسی طرح خدشات کا شکار رہتیں جیسے عام طور پر بڑی بوڑھیاں نومولود کے لیے سوا ماہ تک رہا کرتیں۔

"کچھ خاص نہیں بابا سائیں بس وہ۔۔۔ کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"ہائے میریا ربا۔" ملکانی سائیں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا جبکہ مہربانو اپنے سابقہ انداز میں بیٹھی رہی کہ لڑائی جھگڑا کرنا تو میران کے لیے اسی طرح تھا جیسے قصائی کے لیے گوشت کاٹنا۔

"بہت دن تک خبر آتی رہی مختلف اخباروں میں۔" شاہ سائیں کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں مگر ملکانی سائیں کے پریشان ہو جانے کی وجہ سے ایک دم ساری بات کرنے سے گریزاں ہیں۔

"جی، لیکن اب تو سارا معاملہ سیٹل ہو گیا ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے اب۔"

بالوں کی ننھی سی پونی کو انگلی کے گرد لپیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے خود کو اس سارے معاملے کی کوئی پروا نہ کرتا دکھایا تھا۔

"یعنی پھر سے ایڈمیشن ہو گیا ہے تمہارا؟"

دائیں ٹانگ ہلاتے میران کے ساتھ ساتھ ان کی بات پر مہربانو اور ملکانی سائیں بھی چونکیں۔ مہربانو چاہ کر بھی کچھ بول نہیں سکتی تھی کہ اس طرح میران کے عتاب کا نشانہ بننا پڑتا سو چپ چاپ اس کے جواب کی منتظر رہی، البتہ ملکانی سائیں اس ڈر سے مستثنیٰ تھیں۔

"نا کیوں میرے پتر کا ڈمیشن (ایڈمیشن) کینسل ہوا ہے؟" شاہ سائیں نے خاموشی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے میران ہی کو جواب دینے کا موقع فراہم کیا۔

"اوہو اماں سائیں! اگر ایڈمیشن کینسل ہو بھی گیا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے، پھر ہو جائے گا۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارا نام اخباروں میں اچھلنا ہمارے لیے کس قدر نقصان دہ ہے۔"

سگریٹ کا ابتدائی کش لیتے ہوئے وہ بولے۔

"اور آج کل تو پھر الیکشن ہونے والے ہیں، مخالفین ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوتے ہیں، کہاں قدم پھسلے اور وہ تماشا بنائیں۔"

"جی بابا سائیں!"

"کل یونیورسٹی جاؤ اور سارا معاملہ کلیئر کر کے آؤ۔"

"جی میں کل ہی جاتا ہوں۔"

شاہ سائیں کو بھی حالیہ الیکشن کی فکر تھی ورنہ وہ میران کی تعلیم میں دلچسپی سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ پڑھائی لکھائی میں نام کمانا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اسی لیے اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے وہ مہربانو سے امید لگائے ہوئے تھے اور ملکانی سائیں اور میران کی ہزار مخالفت کے باوجود اسے ڈاکٹر بننے کی اجازت دے کر اسے ہر معاملے میں سپورٹ بھی کیا کرتے۔

مگر اس بات سے وہ بھی بے خبر تھے کہ مہربانو اب صرف روپے پیسے کی سپورٹ سے بڑھ کر ان کے پیار کی متلاشی رہتی ہے۔ وہ بھی ان سے اسی طرح لاڈ کرنا چاہتی ہے جیسے میری اور کنول اپنے والد کے ساتھ کیا کرتیں۔۔۔

وہ بھی گھر میں بیٹھ کر ساری باتیں پوچھنے کالج اور ہاسٹل سے لے کر ملکی حالات اور کرکٹ میچز تک سب کچھ ڈسکس کرنا چاہتی ہے مگر فاصلے تھے کہ جھنڈ میں لگے پوپلر کے سیدھے اور چکنے پتوں والے درختوں کی طرح ختم ہی نہ ہوتے۔

یا کبھی کبھار اسے لگتا کہ شاید وہ اس حویلی کی سب سے غیر مطلوب شے ہے۔ مکڑی کے اُس جالے کی طرح جو وہ عام طور پر دیواروں کے اور چھت کے کونوں میں بنا لیا کرتی ہے۔ مگر جس سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی وہ تنہا ہی دن رات اس جالے کو بنانے میں لگی رہتی ہے جسے کوئی بھی نظر پڑتے مٹا سکتا ہے۔ جس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔

اپنی سوچوں پر دل ہی دل میں خود ہی رائے دیتے ہوئے اس نے میران اور ملکانی سائیں کے سامنے شاہ سائیں سے واپس ہاسٹل جانے کی اجازت چاہی اور اٹھ کر کمرے میں جانے کی خواہش دل میں دبائے وہیں بیٹھی شاہ سائیں کی ہدایات سنتی رہی جو وہ اسے کل یونیورسٹی جانے کے بارے میں دے رہے تھے۔

شاہ سائیں کے اٹھنے سے پہلے یہاں سے اٹھ کر جانے کا نہ تو اسے اختیار تھا نہ اجازت اور شاید ہی ہمت۔

☆☆☆

بھاگتی ٹرین کے مناظر کی طرح کئی خوب صورت رشتے، لمحات اور مقامات پیچھے چھوڑتے ہوئے زندگی ایک بار پھر نئے انداز اور مزاج کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر چکی تھی۔

نیا گھر، اجنبی ماحول اور ناواقف لوگ۔۔۔

اماں نے گھر میں برکت کی نیت سے قرآن خوانی کا اہتمام کر رکھا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس کالونی کے تمام گھروں میں سے خواتین کو آنے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔

ڈرائنگ روم کشادہ تو ضرور تھا مگر اس قدر وسیع ہرگز نہیں تھا کہ فرنیچر کی موجودگی میں خواتین کے بیٹھنے کا انتظام ہو پاتا۔ سو اسی غرض سے ڈرائنگ روم میں رکھا چیدہ چیدہ فرنیچر ایک روز کے لیے وہاں سے ہٹا کر سارے فرش پر سفید چاندنیاں بچھانے کے بعد دیواروں کے ساتھ مختلف کشن اور درمیان میں مناسب اونچائی کا حامل میز نما چوکھٹا رکھ کر اس پر مکمل طور پر گلاب کی پتیاں بچھانے کے بعد اوپر علیحدہ علیحدہ تیس سپاروں کے ساتھ چند سورہ یاسین اور تسبیحات بھی رکھی گئی تھیں۔

کھانا بنانے میں تو ثمینہ ویسے ہی طاق تھی سو اس معاملے میں اسے شاہ زین کی کوئی مدد درکار نہ تھی۔ ہاں ڈرائنگ روم کی سیٹنگ میں زیادہ کام اسی نے کیا تھا کہ ثمینہ چونکہ اگلے روز کے لیے سویٹ ڈش بنا رہی تھی تاکہ رات کو فریج میں رکھ دے، سو شاہ زین نے بڑی نیت سے پورے ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اماں نے لاکھ اٹھ کر کام کروانا چاہا مگر اس نے انہیں صرف اپنے سامنے موجود رہنے کا کہہ کر ایک کشن تک اٹھا کر نہ رکھنے دیا۔

یوں بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اماں شوگر کی مریضہ ہیں اور جسمانی تھکن سے ان کی صحت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے، لہٰذا بڑے پیار سے انہیں منع کر کے بس اپنے سامنے بٹھا لیا تو وہ اپنے ہیرے موتیوں جیسے بیٹے کے جذبات سے کھیلنے والی لڑکی کو دل میں بھی برا بھلا تو نہ کہہ سکیں مگر ایک آہ اُن کے ہونٹوں سے ضرور نکلی تھی۔

رات دیر سے سونے کے باوجود بھی وہ ہمیشہ کی طرح پورے وقت پر آفس پہنچا تھا۔ یوں بھی اپنے فرسٹ ورکنگ ڈے میں ہی ساتھ کام کرنے والوں پر اپنی شخصیت اور کام کرنے کے انداز سے اُس نے جو تاثر قائم کیا تھا وہ اسے برقرار بھی رکھنا چاہتا تھا۔ نہ صرف سینئرز کے ساتھ عزت سے پیش آنے بلکہ ورکرز اور لوئر اسٹاف کے ساتھ بھی خوش اخلاقی سے بات چیت کرنے کے باعث اس کا تاثر ایک دوستانہ مزاج انسان کے طور پر ابھرا تھا۔

مگر مسئلہ پیدا ہوا تو تب جب اسے . کچھ دستاویزات کی ضرورت پڑی۔ یوں بھی اس کی ڈگری تو ابھی مکمل بھی نہیں کہ تمام تعلیمی اسناد اس کے پاس ہوتیں تو پروفیسر خورشید کی recommandation پر اسے جاب کے لیے ٹرائی کیا گیا تھا مگر پھر اس کے طریقہ کار اور لگن کو سراہتے ہوئے فائنل اپوائنٹمنٹ لیٹر دے دیا گیا اور اب فیکٹری کے چند قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے اسے. کچھ دستاویزات کی ضرورت تھی۔ جن کے لیے اسے یونیورسٹی جانا پڑتا۔

مگر یونیورسٹی جانے سے گریز کرتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ زبیر کو فون کر کے اسے ڈاکومنٹس لانے کا کہہ دے مگر ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ گھر بدلنے کے ساتھ ہی اس نے اپنی وہ سم بھی بدل ڈالی تھی جس میں زبیر وغیرہ کے نمبرز تھے اور جونڈی اور اس کے درمیان اکثر پل کا کام کیا کرتی اس لیے شاید یونیورسٹی خود ہی جانا ناگزیر ٹھہرا۔

☆☆☆

اٹھانا خود ہی پڑتا ہے تھکا ٹوٹا بدن اپنا

کہ جب تک سانس چلتی ہے کوئی کندھا نہیں دیتا

ثروت آپا آج پھر میکے آئی ہوئی تھیں مگر حسب سابق ندی سے ہمدردی کے دو بول بولنا انہوں نے مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے لاؤنج سے آتی آوازوں سے ندی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے سسرال والوں کے طعنوں سے دل ہی دل میں دن رات کڑھتی رہتی ہیں۔ اسی لیے ذرا دل ہلکا کرنے میکے چلی آئی ہیں۔ جواب میں کچھ دیر عائشہ بھابھی کی کھسر پھسر بھی جاری رہی اور پھر آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

مگر آج کا دن ندی کے لیے فیصلہ کن دن کے طور پر طلوع ہوا تھا۔ زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی اور اس کے لیے اب امی کے علاوہ گھر میں فکر کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ بات حالات گزرتے دنوں کے ساتھ اسے بخوبی سمجھا گئے تھے اور اب اسے زندگی اپنے زورِ بازو پر جینی تھی۔ اسی بارے میں امی سے بات کرنے کا سوچتے ہوئے اسے چق کی اوٹ میں کھڑا شاہ زین نظر آنے لگا۔

لمبا چوڑا، بدن اور پرکشش چہرے والا شاہ زین شلوار قمیص میں بھی اتنا ہی پرجمال اور وجیہہ لگ رہا تھا جتنا عام طور پر یونیورسٹی آتے ہوئے پینٹ شرٹ میں لگا کرتا۔

''دیکھو ندی! اگر کبھی ایسا ہو کہ ایک ہی زمین پر رہتے ہوئے ہمارے درمیان کوسوں یا میلوں کی بھی دوری ہو جائے تو یاد رکھنا کہ فاصلے صرف انہی لوگوں کے لیے وسوسوں اور خدشات کا باعث بنتے ہیں جن کے دل میں محبت کمزور ہو ورنہ جتنی بھی اور جیسی بھی دوری ہو اس سے محبت دو آتشہ ہو جایا کرتی ہے۔ مزید قریب لے آتی ہے۔

''جانتی ہوں شاہو! اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم چاہے مجھ سے ملو نہ ملو، ہماری بات ہوئے چاہے ہفتوں سے مہینے گزر جائیں تب بھی تم جہاں بھی ہو اس ایک آسمان کے نیچے کسی بھی مشکل گھڑی میں میرے لیے ایک بھرپور دلاسا اور کبھی نہ ٹوٹنے والا ناقابلِ شکست اعتماد ہو مگر ہاں تم بھی یاد رکھنا کہ میرے دل کی دہلیز پر صرف اور صرف تمہارے [illegible] لکھے ہیں اور اس چوکھٹ کے پار جانے کی [illegible] اجازت نہ اب ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگی۔''

آن کی آن میں چق کے اُس پار کا منظر کسی روح کی موجودگی کا انکار کرتا محسوس ہوا تو وہ بالوں [illegible] کیچر میں جکڑ کر کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

خالق کو اپنی خلق سے الفت تھی اس لیے
جنت اتار ڈالی ہے ماؤں کے روپ میں

امی کے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی گویا وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

ثروت آپا، عائشہ بھابھی اور ناصر بھائی کے سامنے امی بیڈ پر سفید دھاگے کی ہلکی سی کڑھائی والا سفید دوپٹہ لیے بیٹھی تھیں۔ دایاں ہاتھ اپنے پاؤں پر پھیرنے کے ساتھ جیسے ہی اسے اندر آتا دیکھا تو لہجے میں تازگی سموتے ہوئے اسے اندر آ جانے کا کہا تو ضرور مگر لہجہ غریب کی گلک کی طرح خالی ہی رہا۔ اُن سب کے درمیان بیٹھی امی کس قدر نحیف اور کمزور لگ رہی تھیں یہ دیکھتے ہی ندی کا دل گویا خون کے آنسو رو دیا تھا۔ بابا کے ہوتے ہوئے اس نے کبھی بھی امی کو یوں ناصر بھائی کے سامنے کندھے جھکائے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ جبھی یہ نظارہ اسے زنگ آلود چاقو سے قتل کرنے کے مترادف معلوم ہو رہا تھا۔

یوں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات عورت اپنی زندگی میں دو مرتبہ یتیم ہوتی ہے ایک بار تب جب اس کا باپ اس دنیا سے چلا جائے اور دوسری مرتبہ تب جب اس کے بچوں کا باپ اس دنیا میں نہ رہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو یہ دوسری یتیمی کہیں زیادہ اذیت ناک کٹھن اور دشوار ہوتی ہے۔ سو امی بھی اب اپنی زندگی کے اس کرب ناک سفر پر تھیں جہاں خود ان کی زندگی کا بہاؤ دنیاوی طور پر ان کی اولاد اور خصوصاً بیٹے کے ہاتھ میں موجود چپوار کا مرہونِ منت تھا۔

''آؤ بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔''

اسے یوں کمرے میں آتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے دیکھا تو انہوں نے پاس بلا لیا۔

''عائشہ! اسے کہو کسی کام سے آئی ہے تو ٹھیک ورنہ جائے اپنے کمرے میں واپس۔''

اسے اندر آتا دیکھ کر ناصر بھائی نے منہ پھیرا اور اس کے لیے پیغام عائشہ بھابھی کے توسط سے ارسال کیا۔

یوں بھی ناصر بھائی نے اس شام کے بعد سے ندی کو مخاطب نہیں کیا تھا نہ اس روز اس کے سر پر ہاتھ رکھا جب وہ بابا کے جنازے سے لپٹ کر بار بار بے ہوش ہو رہی تھی اور نہ ہی دنیاداری کے تقاضے نبھاتے ہوئے اس کے ساتھ تسلی کے دو بول بولے جب وہ بابا کی اپنے آخری سفر پر روانگی کے وقت ان کے پیچھے دیوانہ وار لپکتے ہوئے چکرا کر میت کو دائیں طرف سے اٹھائے ناصر بھائی ہی کے قدموں میں گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔

قریبی رشتہ دار اور آس پاس کی خواتین میں سے کوئی گلوکوز پانی میں ڈال کر لانے کو دوڑی تو کوئی فوراً ہی منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی، پیاز سنگھایا گیا، آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی کی گئی مگر سب بے سود، آخر کسی بڑی بوڑھی کے کہنے پر بڑے جتن سے اوپر اور نیچے کے دانتوں میں ذرا سا خلا پیدا کر کے گلوکوز ملا پانی چمچ سے منہ میں ڈالا گیا تو حلق تک پہنچا ورنہ منہ میں ڈالا گیا گھونٹ بھر پانی دہانے کے دونوں اطراف سے ہوتا ہوا محض گردن ہی بھگوتا رہا۔

اس سارے عمل میں ناصر بھائی تو گو کہ جنازے کے ساتھ روانہ ہو چکے تھے مگر عائشہ بھابھی تو ایک طرف ندی کی سگی بہن ثروت آپا کا دل بھی نہ پسیجا اور اسے بابا کی موت پر موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے دور بیٹھی ہی بین کرتی رہیں۔

آخر باپ کا سایہ تو ثروت آپا کے سر سے بھی اٹھ گیا تھا مگر انہیں اس سانحے کے ساتھ سسرال میں ہونے والی سبکی کا احساس دل کو مزید کچوکے لگا رہا تھا۔ سسرالیوں کی ناک میں نتھ ڈالنے والی ثروت آپا کو ندی کی وجہ سے خود گھونگھٹ نکالنا پڑ رہا تھا اس لیے انہوں نے ندی کو لائق ہمدردی نہ سمجھا۔

''امی۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ ایک بب۔۔۔۔ بات کرنا تھی آپ سے۔''

انتہائی بااعتماد ہونے کے باوجود ندی کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا مگر پھر بھی وہ رکی نہیں اور چلتی ہوئی بیڈ پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

ہمیشہ ہر بات دھڑلے سے منوانے والی اُن کی لاڈلی بیٹی کا لہجہ آج التجائیہ تھا۔

اُس کے بیٹھتے ہی امی نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے خود سے قریب کیا اور اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا جبکہ دوسرے ہاتھ میں تسبیح کے دانوں کی حرکت جاری تھی۔ ندی نے اُن کے ہاتھ پر نظریں جما کر اپنے سامنے بیٹھے ''رشتے داروں'' سے لاتعلق ہونا چاہا مگر اُن کے ہاتھوں پر موجود انگلیوں سے بھی نمایاں ہوتی موٹی موٹی نسوں پر مزید دل گرفتہ ہو گئی تو انہوں نے اس کے بازو پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے مضبوط کرنا چاہا کہ بلاشبہ اس عمل سے وہ ندی کو مضبوط کرنا چاہتی تھیں۔

عائشہ بھابھی نے اُن کے اس انداز پر طنزاً ناصر بھائی کی طرف دیکھا۔

ثروت آپا کا چہرہ البتہ حسب سابق سپاٹ اور بے تاثر ہی رہا۔

وہ الفاظ جن سے خاموشی ٹوٹتی، یقینی طور پر قحط کا شکار تھے۔ سو یہ وقفہ کچھ طول پکڑنے لگا تو خود امی نے ہی ابتدا کی۔

''بولو بیٹا! کیا بات ہے؟''

(باقی آئندہ)

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی۔۔۔ مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحو سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔۔۔۔ رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔۔ اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔۔۔۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے۔۔۔۔ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔

دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے۔۔۔۔ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔۔۔۔ اب آگے پڑھیں۔

اڑتیسویں قسط

"الیان آپ کی امی دیکھ لیں گی۔" رومیلہ نے دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بری طرح گھبرا کر کہا۔

"کیا دیکھ لیں گی۔" الیان کے لہجے میں کوئی شوخی نہیں تھی بلکہ وہ بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اوہ۔ الیان کیا ہوگیا ہے آپ کو۔" رومیلہ جب اس کی گرفت سے ہاتھ نہیں چھڑا سکی تو بری طرح غصے پر آگئی۔

"نہیں پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔ ممی کیا دیکھ لیں گی ایسا کون سا غلط کام کیا ہے تم نے' جو تمہیں پکڑے جانے کا ڈر ہے۔" الیان کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی مگر رومیلہ اس کے لہجے اور چہرے پر غور ہی کب کر رہی تھی اس کی نظریں تو شگفتہ غفار پر جمی تھیں۔

جو اس سے کوئی بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھیں مگر اپنی بیٹی کے ساتھ شاپنگ کر کے وہ اتنی خوش تھیں کہ ان کا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں تھا بلکہ وہ باتوں میں ہی مشغول تھیں۔

حامد ان دونوں ماں بیٹی کے اتنی تفصیل سے ہر چیز دیکھنے پر ان کا ریکارڈ لگا رہا تھا اور وہ دونوں چڑنے کی بجائے خوشی خوشی اپنی اس عادت پر نازاں تھیں۔ بس صرف ایک نظر اٹھنے کی دیر تھی اور شگفتہ غفار کے چہرے پر پھیلی شگفتگی کرختگی میں بدل سکتی تھی اور رومیلہ اسی لمحے کے بارے میں سوچ کر اتنی ہراساں ہوگئی تھی کہ یک ٹک شگفتہ غفار کو دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کرتی رہی کہ اچانک الیان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

رومیلہ کچھ چونک کر اسے دیکھنے لگی جو سنجیدگی سے اسے دیکھتا اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ پہلی بار رومیلہ نے الیان کے تاثرات پر غور کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کے چہرے پر پھیلا تناؤ دیکھ کر سمجھ نہ سکی کہ اس کا موڈ کیوں خراب ہوگیا ہے مگر ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا تھا الیان کو جانے کے لیے پلٹتا دیکھ کر رومیلہ ایک دم ہوش میں آگئی اس نے بھی منظر سے ہٹنے کے لیے اندر جانا چاہا مگر بالکل غیر ارادی طور پر اس کی نظر شگفتہ غفار کی جانب اٹھ گئی اور پھر تو جیسے اس کا دل ہی دہل گیا۔

شگفتہ غفار نا صرف انہیں دیکھ چکی تھیں بلکہ ان کے چہرے پر حیرت اور غصے کے تاثرات بھی بڑے واضح طور پر ابھرنے لگے تھے ان کی حیرانی سے پھیلی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ انہیں رومیلہ کو اس طرح الیان کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر شدید شاک لگا ہے اور ان کے بھینچے ہوئے لب صاف بتا رہے تھے کہ وہ صرف حامد کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہیں ورنہ ان کا بس نہیں چل رہا کہ رومیلہ کو کیا کچھ نہ کہہ ڈالیں۔

رومیلہ ان کے خطرناک تاثرات دیکھ کر دل ہی دل میں خاصی خوفزدہ ہوگئی اور تیزی سے اندر کی جانب مڑ گئی اس میں اپنی کتابیں ٹیبل سے اٹھانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

اپنے کمرے میں آکر بھی اس پر گھبراہٹ سوار رہی' شگفتہ غفار کے آئندہ رویے کے متعلق سوچ سوچ کر اس کا خون خشک ہوتا رہا۔ وہ تو اس کا جینا دوبھر کردیں گی یہ ایک ہی خیال اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا وہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

کچھ دیر بعد سرداراں نے آکر اسے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو اس نے مجھے بھوک نہیں ہے کہہ کر اسے واپس بھیج دینا چاہا تو سرداراں لجاجت سے کہنے لگی۔

"آجائیں' بڑی بی بی پہلے ہی بڑے غصے میں ہیں' میں آپ کو بڑے صاحب کے کہنے پر بلانے آرہی تھی تو وہ بگڑ کر بولیں

وہ کہیں کی مہارانی ہے کیا' جو اسے کھانے پر بلایا جائے جب ایک بار آپ نے کہہ دیا اسے خود آنا چاہیے تو پھر کیوں کمرے میں جاکر بیٹھ جاتی ہے کھانے کے وقت۔ اسے تو باہر آکر کھانا لگانا چاہیے' بس مفت کی روٹیاں توڑتی

رہتی ہے کوئی کام نہیں کرسکتی گھر میں۔" سرداراں بڑے مزے سے شگفتہ غفار کی نقل اتار رہی تھی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو رومیلہ کم از کم اس کے انداز پر مسکرا ضرور دیتی مگر اس وقت تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ روز اس طرح کمرے میں نہیں بیٹھتی تھی جو شگفتہ غفار مفت کی روٹیاں توڑنے کی بات کر رہی تھیں وہ کچن میں چھوٹے موٹے کام کرلیا کرتی تھی۔

ہاں البتہ کھانا پکانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی کیونکہ اس کے لیے شگفتہ غفار نے صاف منع کردیا تھا۔

"ہمیں خانساماں کے ہاتھ کے کھانے کی عادت ہے' بریرہ بھی کبھی کبھی کوئی نئی چیز ٹرائی کرتی تھی تو کوئی نہیں کھاتا تھا۔"

رومیلہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ انہیں ڈر ہے کہیں وہ زیادہ اچھی چیزیں بنا کر ریاض غفار اور الیان کو متاثر نہ کردے انہیں بھی اس مقولے پر یقین ہوگا کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر جاتا ہے۔ لہٰذا اس وقت ان کا اس طرح بگڑنا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کہیں کا غصہ کہیں نکال رہی ہیں۔

"اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔" رومیلہ گھر کے نوکروں کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ موقع ملنے پر فوراً "سسرال والوں کی برائیاں شروع کردیتی۔

اسے گھر کی باتیں غیروں سے کرنا ویسے بھی پسند نہیں تھا چنانچہ وہ اسے چلتا کرنے کے لیے بولی اور اس کے جانے کے بعد دو تین گہرے سانس کھینچ کر کمرے سے باہر نکل آئی جب وہ ڈائننگ روم پہنچی تو نہ صرف سب موجود تھے بلکہ کھانا بھی شروع کرچکے تھے۔

رومیلہ' شگفتہ غفار کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور کھانے کی جو ڈش اس کے سب سے نزدیک رکھی تھی جسے اسے کسی سے مانگنا نہیں تھا وہی اٹھا کر پلیٹ میں نکالنے لگی۔

"رومیلہ بھابھی آپ کیوں نہیں گئیں ہمارے ساتھ' کیا آپ کو شاپنگ کا شوق نہیں۔" حامد نے اچانک رومیلہ کو مخاطب کیا تو وہ بری طرح چونک اٹھی۔

وہ لوگ کس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اسے کچھ معلوم نہیں تھا اس سوال کے —— سیاق و سباق پر غور کرتے ہوئے وہ ابھی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ شگفتہ غفار چبا کر کہنے لگیں۔

"اسے گھر میں اتنے اہم کام تھے وہ بازار جا کر وہ نادر موقع مس کیوں کرتی۔" رومیلہ کا وجود سن ہونے لگا۔ اسے امید نہیں تھی وہ اس طرح حامد کے سامنے بھی اس پر طنز کردیں گی مگر حامد تو ان کا طنز سمجھا ہی نہیں' بریرہ نے بھی ان دونوں کو دیکھا نہیں تھا اس لیے وہ بھی کچھ نہ جان پائی صرف ایک الیان تھا جس کا نوالہ منہ کو لے جاتا ہاتھ لمحہ بھر کو تھم گیا تھا مگر اس نے فوراً" ہی خود پر قابو پالیا۔

"یعنی ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں شاپنگ سے اہم دوسرے کام لگتے ہیں۔" حامد شوخی سے بریرہ کو دیکھتے ہوئے بولا رومیلہ کو اندازہ ہوگیا کہ وہ لوگ صرف ہنسی مذاق کر رہے ہیں کوئی سنجیدہ گفتگو ان کے درمیان نہیں ہو رہی۔

لیکن بریرہ کو مذاق میں بھی حامد کا رومیلہ کے ساتھ اس کا موازنہ کرنا برداشت نہ ہوا وہ ایک دم تپ کر بولی۔

"دنیا میں تو ہر طرح کی عورتیں ہوتی ہیں' سب ایک سی تو نہیں ہوسکتیں سوال تو یہ ہے کہ کون صحیح ہے۔" حامد کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آتا تھا لہٰذا وہ اسی شوخ انداز میں بولا۔

"گویا تمہارے کہنے کا مطلب ہے شاپنگ کے لیے نہ جانے والی خواتین شاپنگ کے لیے مرنے والی خواتین کے مقابلے میں صحیح ہیں۔"

"ظاہری بات ہے۔" بریرہ اتنی چڑ گئی تھی کہ وہ حامد کے جملے پر غور کیے بغیر تنک کر بولی مگر جواب میں حامد کا جاندار قہقہہ اسے ٹھٹک کر سب کو دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ الیان نے مسکراتے ہوئے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا تھا جبکہ ریاض غفار بھی زیرِ لب مسکراتے ہوئے حامد کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

انہیں اس بحث میں کوئی دلچسپی نہیں تھی انہیں تو بیٹی داماد کی یہ نوک جھوک پسند آرہی تھی حامد کا دوستانہ رویہ بریرہ کے ساتھ دیکھ کر وہ یہ مان گئے تھے کہ وہ روایتی جاگیرداروں کی طرح بیوی کو رعب میں رکھنے والوں میں سے نہیں ہے لہٰذا اپنے فیصلے پر طمانیت محسوس کرتے ہوئے وہ اس ماحول سے جی بھر کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"کیا کہا تھا تم نے۔" بریرہ ترچھی نظروں سے حامد کو دیکھنے لگی۔

"کمال ہے پہلے میری بات پر ہامی بھر لی اور اب پوچھ رہی ہو میں نے کہا کیا تھا۔" حامد نے تائیدی انداز میں شگفتہ غفار کو دیکھا تو وہ محض داماد کا دل رکھنے کے لیے مسکرادیں۔

ورنہ سچ تو یہ ہے کہ رومیلہ کے آتے ہی ان کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا ان کے خیال سے تو رومیلہ کو اس وقت کھانے پر بلانا ہی نہیں چاہیے تھا بلاوجہ ماحول میں کشیدگی پھیل گئی تھی۔ (ان کی نظر میں)

بریرہ کی یہ تو سمجھ میں نہیں آیا کہ حامد نے کیا کہا تھا لیکن اس نے بھی اپنی بات پر قائم رہنے کے لیے مصنوعی مظلومیت سے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے

"اب کیا کروں ایک بار قبول ہے کہہ دیا تو تمہاری ہر بات پر ہامی بھرنی ہی پڑے گی۔" بریرہ کا جواب سب کو محظوظ کر گیا۔

ریاض غفار اور الیان نے تو صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا جبکہ شگفتہ غفار زور سے ہنسنے لگیں بیٹی کی یہ حاضر جوابی انہیں بڑی بھائی تھی تبھی سراہتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اور کیا بھئی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ شوہر نے کیا کہا نیک اور صالح بیوی کو تو اس کے جواب میں اس کی حمایت ہی کرنی ہے لہٰذا شوہر کا جملہ سنا یا نہیں سنا کیا فرق پڑتا ہے۔"

شگفتہ غفار کے خوشی خوشی بولنے پر ریاض غفار بھی تھوڑے مطمئن ہو گئے ورنہ بیوی کے تاثرات نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہوں نے رومیلہ کو کھانے کے لیے بلا کر انہیں ناراض کر دیا ہے اور رات کو کمرے میں وہ اس بات کو لے کر اچھی خاصی برہم ہونے والی ہیں۔ ریاض غفار چاہتے تھے کہ ان کا یہ موڈ برقرار رہے تبھی انہیں چھیڑتے ہوئے کہنے لگے۔

"دنیا میں سب سے زیادہ چالاک عورت ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مظلوم نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔" حامد سسر جی کے ریمارکس پر بری طرح ہنستے ہوئے ان کی تائید کرنے لگا۔

داماد کا اس قدر گھل مل کر ان کے درمیان بیٹھنا اور ان کے شوہر کے ساتھ مل کر ان کی ہی بیٹی کو چھیڑنا شگفتہ غفار کو بہت اچھا لگ رہا تھا وہ بھی ریاض غفار کا مذاق سمجھتے ہوئے اس بحث کو طول دینے کے لیے شوخی سے بولیں۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ عورت بے وقوف ہے۔ وہ ہے تو واقعی چالاک۔ لیکن اس کی چالاکی ہمیشہ دوسروں کے فائدے کے لیے ہوتی ہے جسے عام زبان میں بے وقوفی کہا جاتا ہے کیونکہ دوسروں کے فائدے کے لیے وہ اپنا نقصان کر لیتی ہے۔" شگفتہ غفار کی بات میں وزن تھا بریرہ تو سو جان سے فدا ہو گئی ان پر۔

جبکہ ریاض غفار کو بھی اب اس بحث میں مزا آنے لگا تھا۔ انہوں نے شگفتہ غفار کو چھیڑنے کے لیے ان سے متفق ہونے کے باوجود بحث کا ایک اور نکتہ اٹھا لیا۔

"عورت کبھی اپنا نقصان نہیں کرتی اسے پتا ہے جب وہ دوسروں کے لیے قربانی دینے کا ڈراما کرے گی تو حالات

تو مستقبل اس کے حق میں ہو جائیں گے وہ اپنا مطلب بھی نکال لے گی اور عظیم بھی بن جائے گی۔" حامد نے باقاعدہ تالیاں بجا کر ریاض غفار کو داد دی تو بریرہ بھی آستین چڑھاتے ہوئے باقاعدہ لڑنے پر اتر آئی۔

"اگر اتنا آسان ہے قربانی کا ڈراما کرنا تو مرد کیوں نہیں کر لیتا۔"

"کیونکہ وہ عورت کی طرح چالاک نہیں ہے نا وہ ٹھہرا سیدھا سادا۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔" حامد نے اتنی مسکینیت سے کہا کہ الیان تک اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

"اف اللہ اتنا جھوٹ مرد اور سیدھا سادا۔" بریرہ کی تو جیسے جان جل گئی۔

"تم سے تو کم ہی جھوٹ بولا ہے نا۔ عورت اور عظیم۔" حامد برجستہ بولا۔

"عورت واقعی عظیم ہے کیا عورت معاف کرنے کا ظرف رکھتی ہے۔ عورت سے اگر معمولی سی بھی غلطی ہو جائے تو مرد در گزر نہیں کر سکتا لیکن مرد انتہائی قسم کے گناہ بھی کر لے تو بھی عورت سے معافی کی امید رکھتا ہے اور عورت معاف کر بھی دیتی ہے۔" بریرہ نے ٹیبل پر مکا مارتے ہوئے بڑے ٹھوس لہجے میں کہا تو ریاض غفار حامد کو دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں کہنے لگے۔

"دم ہے اس کی بات میں۔" ریاض غفار کی حمایت پر بریرہ نے بالکل حامد کی طرح تالیاں بجا کر خود کو خراج تحسین پیش کیا تو حامد بور سی شکل بنا کر احتجاج کرنے لگا۔

"پھوپھا جان ڈیٹس نوٹ فیئر آپ ایک باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سمجھدار انسان ہیں آپ کو اولاد کی محبت کو ایک طرف رکھ کر ایمانداری سے بات کرنی چاہیے۔"

"ہاں جب تک وہ مردوں کے حق میں بول رہے تھے وہ غیر جانبدار ہو کر بات کر رہے تھے اور جب انہوں نے عورت کی حمایت کر لی تو وہ ایک باپ بن گئے اور جذباتی ہو گئے۔" بریرہ بری طرح چیخی۔

ایک سوائے بریرہ کے باقی سب بڑے خوشگوار انداز میں بات کر رہے تھے بس ایک بریرہ تھی جو اتنے جوش سے بول رہی تھی کہ اب اس پر غصے کا گمان ہو رہا تھا۔

الیان کو اس کا یہ روپ دیکھ کر بڑا سکون مل رہا تھا وہ اس وقت بالکل پہلے والی بریرہ لگ رہی تھی۔ اپنی بات پر اڑی ہوئی ضدی اور تھوڑی بے وقوف سی۔ ورنہ ابرار کے اغوا کرنے کے بعد سے وہ بالکل سنجیدہ اور خاموش ہو گئی تھی اور اس کی اس تبدیلی کا سہرا تھوڑا بہت حالات کو جاتا تھا کہ وہ اس ماحول اور جگہ سے دور تھی جہاں ہر وقت رومیلہ نظر آرہی تھی اور زیادہ ہاتھ اس میں حامد کا تھا جس کی سنگت میں وہ اس سانحہ کو بھول گئی تھی۔

الیان حامد کو دیکھتے ہوئے پہلی بار گفتگو میں شامل ہوا۔

"عورت مرد کو ہمیشہ ظالم اور بے حس کہتی ہے اور پھر بھی چاہتی ہے کہ مرد اسے عظیم مان لے حالانکہ اگر اسے عظیم بننا ہے تو پہلے اس میں اتنا ظرف ہونا چاہیے کہ وہ مرد کو سیدھا سادا مان لے۔" الیان کے جملے کا حامد نے جی بھر کر مزا لیا۔

"یہ ہوئی نا بات اب آیا نا میرا اسی سپورٹر پھوپھا جان پر تو سچائی سے زیادہ بیٹی کی محبت سوار ہے۔"

"نہیں بھئی جو بات ہے سو ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت میں مرد سے زیادہ ظرف ہے۔ عورت جتنی چیزیں ان دیکھی کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا۔" ریاض غفار نے بردباری سے کہا تو بریرہ کی باچھیں کھل گئیں وہ باقاعدہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ریاض غفار کے گلے میں باہیں ڈال کر فاتحانہ نظروں سے حامد اور الیان کو دیکھنے لگی۔

"ہمارا پلڑا کافی بھاری ہو چکا ہے دو عورتوں کے ساتھ ساتھ اب ایک عدد مرد بھی عورت کی وکالت کر رہا ہے

لہٰذا یہ بحث اس نتیجے پر پہنچی کہ عورت زیادہ عظیم ہے۔" بریرہ کسی عدالت کے جج کی طرح فیصلہ سناتے ہوئے بولی تو شگفتہ غفار نے بھی کسی اسمبلی میں بیٹھی خاتون کی طرح ایک ہاتھ سے ٹیبل بجا کر اس فیصلہ کے حمایت میں ہونے کا ثبوت دیا۔

ریاض غفار نے عورت کے حق میں بول کر ان کا موڈ خاصا خوشگوار کر دیا تھا۔

"جی نہیں ابھی ایک شخص کی گواہی باقی ہے۔" حامد نے کہنے کے ساتھ ہی رومیلہ کو مخاطب کر لیا۔

"آپ بتائیں بھابھی آپ کا ووٹ کس کے حق میں ہے۔" حامد کے اچانک سوال پر رومیلہ بری طرح چونک اٹھی۔

وہ کچھ سٹپٹا کر اس کو دیکھنے لگی وہ ان کی باتیں سن ضرور رہی تھی مگر اس کا اس بحث میں شامل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

شگفتہ غفار کے چہرے پر ایک بار پھر کرختگی پھیل گئی تھی وہ داماد کو کچھ کہہ تو نہیں سکتی تھیں، لیکن انہیں اس طرح گھر کی بات چیت میں رومیلہ کو شامل کرنا سخت ناگوار گزرا تھا۔

"آں۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔" رومیلہ پہلو تہی کرتے ہوئے بولی۔

"ارے پتا تو کسی کو بھی کچھ نہیں ہے سب اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں آپ کی بھی کوئی رائے تو ہو گی نا کہ عورت زیادہ عظیم ہے یا مرد۔" حامد نے رسانیت سے کہا۔

"چھوڑو یار۔" الیان نے بیچ بچاؤ کرانے والے انداز میں کہا۔ "ایک عورت سے یہ سوال کر کے کیوں ان کا ایک ووٹ اور بڑھا رہے ہو۔" الیان نے کہا تو ریاض غفار بھی ٹالتے ہوئے کہنے لگے۔

"اور کیا بھئی رومیلہ بھی ہماری سائیڈ پر ہے۔"

"میں کسی کی سائیڈ پر نہیں ہوں۔" رومیلہ بے ساختہ بولی تو حامد بریرہ کو چڑانے کے لیے بولا۔

"دیکھا بریرہ اسے کہتے ہیں مجازی خدا کا لحاظ کہ اگر اسے ہرا نہیں سکتیں تو خود جیتنا بھی گوارا نہیں ہے۔" بریرہ حامد کے مذاق میں بھی رومیلہ سے موازنہ کرنے پر تپ گئی جبھی تنک کر بولی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں عورت ہی عظیم ہے، جو ایسا کر سکتی ہے کہ شوہر کو نہ ہرا سکے تو خود بھی نہ جیتے مرد تو اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا۔"

"میں نے کوئی قربانی نہیں دی ہے۔" رومیلہ ایک بار پھر بول پڑی، لیکن اس بار اس نے اپنی بات کی وضاحت کرنی بھی ضروری سمجھی اور کہنے لگی۔

"میں تو اس لیے کسی کی بھی سائیڈ نہیں لے رہی ہوں کہ آپ دونوں کے ہی موقف غلط ہیں کسی ایک پوری قوم کو غلط کہنا یا کسی ایک پوری قوم کو صحیح کہنا بالکل جائز نہیں۔

جب عورت مرد کو ظالم اور جابر کہتی ہے تو وہ یہ بھول جاتی ہے کہ سارے انبیاء، رسول، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، ولی اور امام۔ سب مرد ہی تھے

اور جب عورت کو عظیم اور کھلے ظرف کا گردانے پر بضد ہوتی ہے تب بھی وہ یہ بھول جاتی ہے کہ دنیا میں عورت کے مظالم کی داستانیں بھی بھری پڑی ہیں۔

کیا آپ لوگوں نے کبھی اخبار میں نہیں پڑھا۔

پانچ بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ فرار

سگی بہن نے بہن کو طلاق دلوا کر بہنوئی سے شادی کر لی۔

بہو نے بوڑھی ساس سسر کو گھر سے نکال دیا۔

ساس نے بہو کو زندہ جلا دیا یا بیٹی پیدا کرنے پر شوہر سے طلاق دلوا دی۔

لیڈی ٹیچر نے بچے کو اتنا مارا کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا۔

اور سب سے بڑھ کر سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آ کر آٹھ سالہ اور چھ سالہ بچی گھر سے فرار ہو گئی۔

ایسی کتنی داستانیں ہیں، جو ہمارے ارد گرد بکھری ہیں یہ سب عورت کے ہی ظلم ہیں۔

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ مرد ظالم نہیں ہے، لیکن عورت بھی کوئی عظیم نہیں ہے بات ساری پاور کی ہے۔ جہاں مرد کے پاس طاقت ہوتی ہے وہاں اس کی مرضی چلتی ہے اس کا حکم چلتا ہے اس کے پاس اختیارات زیادہ ہیں اس لیے اس کا ظلم زیادہ نظر آتا ہے، لیکن جب عورت کے پاس مواقع ہوتے ہیں وہاں وہ بھی من مانی کرتی ہے بغیر دوسروں کے جذبات کا احساس کیے۔

اور رہا سوال معاف کرنے کا؟

تو یہ واقعی سچ ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت زیادہ درگزر سے کام لیتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ساری ہی عورتیں عظیم ہیں جنہوں نے معاف کر دیا۔

ایسی غفور و رحیم تو صرف وہ پاک ذات ہے، جو اپنے گناہ گار سے گناہ گار بندے کو بھی بخش دیتی ہے حالانکہ وہ بدلہ لینے اور سزا دینے پر قادر ہے پھر بھی معاف کر دیتا ہے اور یہ صرف اسی کی صفت ہے۔

انسان میں یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہے کہ اپنے مجرم کو بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود معاف کر دیں۔ عورت بھی بہت دفعہ "مصلحتاً" معاف کرتی ہے۔

مرد اگر عورت کی معمولی سے معمولی غلطی بھی نہیں بخشتا تو اس لیے کہ اسے پتا ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں گا تو مجھے اور مل جائیں گی مطلب یہ کہ اس کے پاس اختیار ہے چھوڑنے کا۔

جبکہ عورت کے پاس یہ سہولت ہر طبقے میں موجود نہیں۔ مڈل کلاس اور لوئر کلاس عورتوں کو پتا ہے کہ اگر وہ شوہر کی ان غلطیوں کو نظر انداز نہیں کریں گی تو نقصان انہیں ہی اٹھانا ہو گا۔

اس سے علیحدگی اختیار کر کے وہ کہاں جائیں گی دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے اسی کو معاف کر کے برداشت کر لو۔ یہ عظمت نہیں سمجھوتہ ہے اور مردوں کی سراسر غلط فہمی ہے کہ عورت نے انہیں معاف کر دیا۔

ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس عورت کے دل میں مرد کے لیے کوئی عزت ہوتی ہے اور نہ ہی محبت

جو لوگ عزت اور محبت کے بغیر رہ سکتے ہیں وہ ایسی معافی پر بھی خوش رہتے ہیں، لیکن جن میں عزت نفس موجود ہوتی ہے وہ جانتے ہیں وہ زندگی بھر کڑھتے رہتے ہیں کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ انہیں "مصلحتاً" قبول کیا گیا ہے، لیکن انہیں کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔"

رومیلہ کا ارادہ کوئی تقریر جھاڑنے کا نہیں تھا، لیکن جب اس نے بولنا شروع کیا تو وہ کہتی ہی چلی گئی پھر سامنے بیٹھے سب لوگوں کا رسپونس بھی ایسا ہی تھا جیسے اس کی بات بڑے دھیان سے سن رہے ہوں۔

حالانکہ ان کے بیچ کوئی سنجیدہ بحث نہیں ہو رہی تھی، مگر رومیلہ کے بولنے کے بعد سب لوگ بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ایک سوائے شگفتہ غفار کے جو اس سارے ماحول سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کے طور پر گلاس میں پانی نکال کر پیے جا رہی تھیں۔

رومیلہ کے خاموش ہونے پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی ماحول پر عجیب سا بوجھل پن طاری ہو گیا تھا شاید اس لیے کہ رومیلہ کی کہی سچائی میں تلخی کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربے کی ترشی بھی شامل تھی جو کہ حامد تک نے محسوس کر لی تھی حالانکہ وہ بہت ساری باتوں سے بے خبر تھا، مگر بات یہ تھی کہ اسے اتنا ضرور پتا تھا کہ

رومیلہ کے تعلقات گھر میں کسی کے ساتھ بھی بہت اچھے نہیں ہیں' اب اس کے پیچھے وجہ کیا تھی اس معاملے میں وہ صرف قیاس آرائیاں کر سکتا تھا جس میں سر فہرست دو وجوہات تھیں۔

ایک تو جن حالات میں رومیلہ اور الیان کی شادی ہوئی تھی وہ کوئی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔

دوسرے یہ رشتہ ہی ایسا تھا کہ شگفتہ غفار کا رومیلہ کے ساتھ کھنچاؤ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اسی لیے ماحول میں رچی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"چلیں یہ ووٹ تو ہم اپنی طرف ہی سمجھیں گے۔"

"کیوں؟ کس خوشی میں۔" بریرہ ایک دم بگڑ کر بولی تو حامد واپس اپنی جون میں آتے ہوئے بولا۔

"کیونکہ وہ مان رہی ہیں کہ عورت کوئی عظیم وظیم نہیں ہے اور۔۔۔"

"لیکن وہ یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ مرد بھی کوئی انسانیت کے اعلا درجہ پر فائز نہیں ہے لہٰذا وہ نیوٹرل ہیں جس کے ووٹ دینے یا نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" بریرہ نے حامد کی بات کاٹ دی' لیکن حامد کو ایک بار پھر بحث کرنے کا جوش چڑھ چکا تھا وہ باقاعدہ جرح کرتے ہوئے بولا۔

"عورت ہونے کے باوجود اگر وہ عورت کو عظیم نہیں مان رہیں تو یہ عورتوں کے خلاف گواہی ہوئی اور رہا سوال کہ وہ مردوں کو بھی ایسا ہی کہہ رہی ہیں تو یہ ایک عورت ہونے کی وجہ سے تعصب زدہ سوچ ہے جو وہ کھل کر مرد کی حمایت نہیں کر پا رہیں' مگر میں ان کی گفتگو کا پس منظر سمجھ چکا ہوں۔" حامد کی بات پر ایک بار پھر بحث شروع ہونے لگی' مگر اس بار صرف بریرہ اور حامد بول رہے تھے باقی سب بالکل چپ تھے البتہ شگفتہ غفار کھانے سے فارغ ہو گئی تھیں لہٰذا انہوں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے صرف ایک جملہ کہا اور سب کو ساکت کر دیا۔

"اس لڑکی کی بات میں کوئی وزن ہے نہ کوئی دلیل۔ کچھ لوگ ایسے انوکھے کام کرنا چاہتے ہیں کہ سب چونک اٹھیں۔ عورت ہوتے ہوئے عورت کے خلاف بول کر سارے مردوں کو حیران اور متاثر کر دو۔ یہ سب محض ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔ مردوں کو متوجہ کرنے کے' اور کچھ نہیں۔" رومیلہ کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ اتنی بے عزتی پر اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اٹھ کر شگفتہ غفار کا منہ نوچ لے۔

بریرہ بھی حامد کے سامنے ماں کے منہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر متذبذب ہو گئی کیونکہ حامد کے چہرے پر شدید حیرانی پھیل گئی تھی۔

ریاض غفار تنبیہی انداز میں شگفتہ غفار کو دیکھ رہے تھے' مگر وہ متوجہ ہی نہیں تھیں اپنی بات کہہ کر وہ حاضرین پر نظر ڈالے بغیر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں تو حامد سے بھی مزید وہاں رکا نہیں گیا وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کر چلا گیا۔

بریرہ نے حواس باختہ انداز میں باپ اور بھائی کو دیکھا اور اٹھ کر تیزی سے شوہر کے پیچھے بھاگی اسے یقین تھا حامد کو یہ گفتگو سخت ناگوار گزری ہے وہ اسے منانے اور ٹھنڈا کرنے کے خیال سے فوراً" ہی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

ان سب کے چلے جانے کے بعد وہ تینوں میز پر رہ گئے رومیلہ کا دل تو چاہ رہا تھا فوراً" اٹھ کر چلی جائے' مگر جسم میں جیسے ہلنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی وہ اپنے منتشر ہوتے اعصاب کو قابو کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی جب اس نے ریاض غفار کو کہتے سنا۔

"میں نے کہا تھا حامد کے سامنے کوئی بد مزگی نہ ہو' اتنے کم وقت کے لیے وہ آیا ہے کل صبح جانے والا ہے' لیکن اس کے سامنے ہی سارا تماشا ہونا ضروری تھا۔" ریاض غفار کے برہم لہجے پر رومیلہ کا دل چاہا وہ پلٹ کر بولے کہ یہ تماشا آپ کی بیوی نے کیا ہے اس نے نہیں۔ اگر اسے تماشا کرنا ہوتا یا تماشا کرنا اسے آتا تو وہ شگفتہ غفار کو ان کے داماد کے سامنے ایسا منہ توڑ جواب دیتی کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ جاتیں' مگر اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا کہ

اس میں بولنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی تبھی الیان کی آواز ابھری اس کا لہجہ اتنا پر سکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو بھی رومیلہ بری طرح چونک کر اسے دیکھنے لگی جو کہہ رہا تھا۔

"جب تک رومیلہ یہاں ہے ایسے تماشے ہوتے ہی رہیں گے حامد تو پھر بھی گھر کا ہے ابھی تو باہر والوں کے سامنے اس سے زیادہ سین کری ایٹ ہوں گے کہ سب کو بات کرنے کے لیے ایک گرما گرم ٹاپک مل جائے گا۔"

الیان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا رومیلہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

جانے کیوں اسے یقین تھا الیان کو اپنی ماں کا اس طرح اسے ذلیل کرنا سخت ناگوار گزرا ہو گا وہ ماں کے سامنے مصلحتاً" خاموش رہا تاکہ وہ حامد کے سامنے زیادہ نہ بولیں' لیکن ان کے جانے کے بعد وہ ریاض غفار کے سامنے اپنی ماں کے رویے پر ناپسندیدگی کا اظہار ضرور کرے گا' مگر وہ تو اسے ہی مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔

کہ جب تک وہ یہاں ہے ایسا ہوتا ہی رہے گا۔

ریاض غفار بھی اس کی بات پر چڑ کر پوچھنے لگے۔

"تو پھر آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟" الیان بے اختیار رومیلہ کو دیکھنے لگا جو پہلے سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ رومیلہ کو لگا جیسے اس کے پاس اس مسئلے کا حل ہے' مگر وہ بول نہیں رہا رومیلہ کے چہرے پر بے چینی پھیلنے لگی جیسے وہ اس کا جواب سننے کے لیے سراپا منتظر ہو' مگر وہ کچھ دیر رومیلہ کو دیکھتے رہنے کے بعد "چلیں چھوڑیں۔" کہتا اپنی جگہ سے اٹھ گیا تو ریاض غفار بھی بے زار سے کھڑے ہو گئے۔ بس ایک رومیلہ تھی جو کتنی ہی دیر بے حس و حرکت وہیں بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

خرم جب سے الیان سے ملا تھا اسے ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ اسے ایک بار زوبیہ سے مل کر شائستہ خالہ کے متعلق بتانا چاہیے۔

زوبیہ حقیقت جاننے کے لیے کس قدر بے چین تھی' مگر سچائی اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلی تو اس کا حق بنتا ہے کہ اسے پتا چلے اس کے والدین نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔

کبھی اس کے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دیا کبھی اس کی الجھن کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا تھا جو وہ اس خیالی پیکر پر سے پردہ اٹھا دیتے۔

لیکن اپنی ہٹ دھرمی کے باعث انہوں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں لہٰذا اب خرم کو اس راز کو فاش کر دینا چاہیے' مگر وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اسے بار بار زوبیہ سے ملنے جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

جس طرح سب اس کی زوبیہ کے لیے ہمدردی کو کوئی اور ہی معنی پہنا رہے تھے اسے دیکھتے ہوئے وہ وہاں جانے سے گریزاں تھا' مگر فوراً" ہی اس پر دوسری سوچ حاوی ہونے لگتی۔

زوبیہ پاگل خانے میں تھی وہ اگر ایک دفعہ اور اس سے ملنے وہاں جاتا بھی ہے تو بھلا کسی کو کیا پتا چلے گا اور پتا چل بھی جائے گا تو کوئی کیا کر لے گا۔

نمل سے منگنی توڑنے پر یونیورسٹی میں کتنی باتیں بنیں یہاں تک کہ اس کے اپنے دوستوں وکی اور حمید نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔

"آخر ہار گیا نا تو اس لڑکی سے۔"

"اتنے شور سے منگنی کی اور خود ہی توڑ دی۔"

"زوبیہ کے ذریعے جلانے کی بھی کوشش کی' مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"ایک پاگل لڑکی بھلا تیری کمزور پوزیشن کو کیا سہارا دیتی۔"

"تو مان لے تو ایک لڑکی سے شکست کھا گیا۔"

ان دونوں نے اسے بتانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن وہ ان دونوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیے رہا۔ اس وقت وہ بالکل کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا اسے علم تھا اس کے اس اقدام سے لوگوں کو اس پر ہنسنے کا موقع مل جائے گا، مگر وہ پچھتانے یا پیچھے ہٹنے کو بالکل تیار نہیں تھا اور پھر ہارون اور نادر نے اس کے فیصلے کو سراہا تھا مگر بہت مذاق میں انہوں نے چھیڑا ضرور۔

"تم نے واقعی منگنی توڑ دی۔ مطلب مان لیا کہ یہ لڑکی جھکنے والی نہیں۔" لیکن پھر خرم کو سنجیدہ دیکھ کر فوراً ہی وہ دونوں سنجیدہ بھی ہو گئے۔

"خیر! جو ہوا بہت اچھا ہوا تمہیں تو یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔" خرم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا ویسے بھی وہ پہلے کے مقابلے میں بہت خاموش ہو گیا تھا اس بار چاہتے ہوئے بھی وہ خود پر کوئی خول نہ چڑھا سکا حالانکہ اس کی پوری کوشش تھی کہ کمل کے واپس یونیورسٹی آنے سے بالکل پہلے جیسا ہو جائے، مگر اندر سے اسے لگتا تھا اب کبھی پہلے جیسا نہیں ہو سکے گا اس کے اندر کہیں کچھ ختم ہو گیا تھا جو اس کی پوری شخصیت کو تبدیل کر گیا تھا۔

ان ہی احساسات میں گھر کر اسے زوبیہ کا خیال آجاتا اس لڑکی کو جانے کیوں یہ لگتا تھا کہ خرم اس کی مدد کر سکتا ہے حالانکہ وہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

تبھی وہ سوچتا کم از کم ایک دفعہ جا کر زوبیہ کو ساری سچائی ہی بتا دے اس شش و پنج میں وہ ایک دن آخر زوبیہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس بار زوبیہ سے ملنے کے لیے اسے خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا بلکہ درپردہ اسے اسٹاف کو کچھ پیسے کھلانے پڑے تب کہیں زوبیہ سے ملاقات ممکن ہوئی۔

وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا وہ بہت دبلی اور کمزور ہو گئی تھی اس کی شاداب رنگت مرجھا گئی تھی آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے اس کے رات رات بھر جاگنے کی ترجمانی کر رہے تھے اس کے بالوں کی بندھی سیدھی چوٹی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ابھی بھی اپنے حواسوں میں ہے مریضوں کا مخصوص سفید پاجامہ اور شرٹ پر قرینے سے دوپٹا اوڑھے وہ ابھی بھی ذہنی طور پر ٹھیک لگنے کے باوجود جسمانی طور پر بہت نحیف اور بیمار لگ رہی تھی۔

"یہ کیا حالت بنائی ہے کیا کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔" خرم کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ خرم کو اس کی آنکھوں میں پھیلی ویرانی سے وحشت ہونے لگی۔

"زوبیہ... زوبیہ میں جانتا ہوں یہاں ایسی جگہ پر رہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر تم اس طرح خود پر توجہ دینا چھوڑ دو گی، خود اپنا خیال نہیں رکھو گی تو اتنی بیمار ہو جاؤ گی کہ کبھی یہاں سے نکل ہی نہیں سکو گی۔" خرم کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تو زوبیہ ایسے بولنے لگی جیسے خود سے ہم کلام ہو۔

"میں تو یہاں سے کبھی نکل ہی نہیں سکتی۔ مجھے اب ساری زندگی یہیں رہنا ہے۔"

"نہیں... نہیں اتنی مایوس مت ہو زوبیہ۔ میں حمید کے والد سے بات کروں گا۔ میں انہیں سمجھاؤں گا۔ وہ کیس واپس لے لیں گے۔" خرم کو قطعی امید نہیں تھی کہ ایسا ہو گا۔ لیکن وہ زوبیہ کے اندر امید جگانا چاہتا تھا۔ ایک جھوٹی آس پر اگر اس کے اندر جینے کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے تو خرم اس جھوٹ کو ساری زندگی بولنے کے لیے تیار تھا۔ بلکہ اسے سچ کر دینے کے لیے اس کا ذہن ابھی سے تانے بانے بننے لگا۔

وہ کسی طرح حمید کے والد کی کوئی ایسی کمزوری جان جائے جس کے بدلے میں وہ زوبیہ پر دائر کیا کیس واپس لینے کے لیے رضامند ہو جائیں، جو کہ بظاہر بالکل ناممکن تھا۔ مگر خرم اسے ممکن بنانے کے لیے کوششیں ضرور کر سکتا

مگر اس کی اس تسلی سے زوبیہ کی کوئی تسلی نہ ہوئی۔ وہ بدستور خود کلامی کے انداز میں بولتی رہی۔

"وہ کیس واپس نہیں لیں گے۔ لے بھی لیں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ میں اس کمرے سے نکل کر اپنے گھر کے کمرے میں بند ہو جاؤں گی۔ یہاں مجھے بیمار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میرا کام وہ لوگ اپنی ڈیوٹی سمجھ کر چار و ناچار کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر میں تو مجھے بیمار کے ساتھ ساتھ بوجھ بھی سمجھا جاتا ہے۔ وہاں نوکر بھی میرے جانے سے خوش ہوں گے کہ اب کسی کا پاگل پن نہیں جھیلنا پڑ رہا۔ ورنہ مما، پاپا کے پیچھے بلاوجہ انہیں میری چوکیداری کرنی پڑتی تھی میری وجہ سے وہ لوگ آرام سے بیٹھ کر ٹی وی نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

"تم نوکروں کے بارے میں سوچ رہی ہوتی ہو اپنی فکر نہیں ہے۔" خرم اس کی بے سروپا باتوں پر زچ ہو کر بولا کہ وہ کچھ چونک کر خرم کو دیکھنے لگی۔

"اپنے بارے میں کیا سوچوں اپنے لیے سوچنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔"

"تم شائستہ خالہ کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں نا۔" خرم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا لیکن اسے شدید حیرت ہوئی جب اس نام پر بھی اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا وہ ایسے ہی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"شائستہ خالہ کے بارے میں، میں کبھی کچھ نہیں جان سکوں گی اور اگر کچھ جان بھی گئی تو ان کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔"

"کیوں کیا اب وہ تمہیں نظر آنا بند ہو گئیں۔" خرم نے تلخی سے پوچھا۔

"وہ تو اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ نظر آنے لگی ہیں حالانکہ اب تو میں دوائیں بھی پابندی سے کھا رہی ہوں لیکن اب وہ مستقل میرے کمرے میں بیٹھی رہتی ہیں رات کو آنکھ کھلتی ہے تو میں انہیں دیکھ کر ایک دو بار چیخ پڑی اس پر ڈاکٹرز نے میری ڈوز (خوراک) اور بڑھا دی۔

اتنی دوائیں کھا کھا کر بھی میں ٹھیک نہیں ہو رہی بلکہ مجھے لگتا ہے میرا دماغ ماؤف رہنے لگا ہے زندگی میں ایسی کوئی خوشگوار یادیں تو تھی ہی نہیں لیکن جو تھیں لگتا ہے وہ بھی بھولتی جا رہی ہوں۔ لیکن... یہ سب میں تمہیں کیوں بتا رہی ہوں۔ تم کون سا میری باتوں پر یقین کرتے ہو!" زوبیہ بولتے بولتے ایک دم چونک اٹھی اور شکایتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں تمہاری باتوں پر واقعی یقین نہیں کرتا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ تم پریشان ہو اور اس وقت جو میں تمہیں بتانے آیا ہوں وہ بہت حد تک تمہاری پریشانی کو دور کر دے گا۔" خرم بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا اور پھر الیان سے ملنے سے لے کر ریاض غفار کا دوبارہ اس گھر کو خریدنے کی کوشش کرنے تک سب بتا دیا۔

البتہ عائشہ اختر نے ریاض غفار کو فون کر کے اپنی بیٹی کے پاگل خانے میں داخل ہونے کے متعلق جو بھی بات کی وہ خرم نے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

زوبیہ بے یقینی سے خرم کو دیکھتی رہی اس نے بہت دفعہ جرح بھی کی مگر خرم نے اسے خاموش کرا کر پہلے اپنی بات مکمل کی تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت ختم ہو جائے اور اس کی بات درمیان میں رہ جائے۔

زوبیہ اس کی بات ختم ہونے پر سر زور زور سے نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں... میں نہیں مانتی مما پاپا نے چاہے جو بھی کیا ہو لیکن جو سایہ مجھے نظر آتا ہے وہ وہم نہیں ہے وہ حقیقت ہے۔ میں بیمار نہیں ہوں میں واقعی کسی کو دیکھتی ہوں جو اور کسی کو نظر نہیں آتا۔

یہ دوائیں کسی بیمار کو ٹھیک کر سکتی ہیں لیکن مجھے یہ دوائیں فائدے کی بجائے نقصان پہنچا رہی ہیں۔ مجھے یہاں سے نکال لو خرم پلیز مجھے یہاں سے نکال لو ورنہ میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گی میں پاگل نہیں ہونا چاہتی فار گاڈ سیک،

ہیلپ می۔" زوبیہ ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
خرم بے بسی سے اسے دیکھنے لگا پھر ایک بار پھر اس نے جھوٹی تسلی دینے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔
"میں کوشش کروں گا تمہیں نکالنے کی۔ تم پاگل نہیں ہو اور نا ہی تم پاگل ہوگی لیکن اس بات کو مان لو کہ شائستہ خالہ کا عکس کوئی سایہ نہیں بلکہ تمہارا وہم ہے۔" خرم کی بات پر وہ ایک دم بھڑکتے ہوئے بولی۔
"اگر یہ وہم ہے تو مجھے کیسے پتا چلا کہ میرے کالج کی لڑکی کی پاؤں مڑ جانے سے موت واقع ہو گئی ہے جبکہ اس کی موت کی خبر کسی کو بھی نہیں تھی۔" فوری طور پر خرم کچھ نہیں بولا مگر زوبیہ کو منتظر دیکھ کر ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔
"تم اپنی بے خبری میں جو کرتی ہو وہ تمہیں پتا نہیں چلتا تم نے دھکا دیا ہو گا یا تمہارے سامنے وہ گری ہو گی لیکن تمہیں خود نہیں پتا چلتا کہ تم گھر سے کب نکلیں اور کب واپس آئیں۔" زوبیہ عجیب سی نظروں سے خرم کو دیکھتی رہی پھر تلخی سے کہنے لگی۔
"تمہارے دوست حمید کے فادر کے ساتھ میں نے یہی کیا ہے نا۔ اس لیے تم ایسا کہہ رہے ہو پتا نہیں تمہیں اس وقت کیا غلط فہمی ہوئی ورنہ اسے میں نے نہیں شائستہ خالہ نے دھکا دیا تھا اور میری سمجھ میں آ گیا ہے انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا۔"
"کیوں؟" خرم نے ٹھٹک کر پوچھا۔
"وہ لڑکا بہت ینگ ہے شائستہ خالہ بہت سال پہلے مری تھیں وہ ان کی موت کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا یہ کام اس کے والد نے کیا ہو گا اور شائستہ خالہ کی روح تمہارے دوست کو مار کر اس کے باپ سے بدلہ لے رہی تھی۔" خرم لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔
ایک پاگل شخص سے بحث کرنا بے کار تھا وہ تو صرف اسے سچائی سے آگاہ کرنے آیا تھا اور یہ کام وہ کر چکا تھا لہٰذا اب یہاں رک کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔
"میں اب چلتا ہوں کافی دیر ہو گئی ہے۔" خرم کو جانے کے لیے تیار دیکھ کر زوبیہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔
سارا دن ایک کمرے میں بند رہتے رہتے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی اس لیے یہ جانتے ہوئے بھی کہ خرم کی گواہی پر وہ آج یہاں قید ہے وہ اس سے ملنے اور بات کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔
لہٰذا اب اسے جاتا دیکھ کر اس پر پھر سے بے چینی سوار ہونے لگی ایک نرس آ کر اسے دوبارہ اسی کمرے میں لے جائے گی جہاں کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ہو گا۔
"خ..... خرم ایک ایک منٹ رکو۔ میں..... میں بکواس نہیں کر رہی سچ کہہ رہی ہوں شائستہ خالہ کا قتل ہوا ہے اور مجھے یہ بھی پتا ہے اس کا نام کیا ہے۔" اس کی توقع کے عین مطابق خرم اس کی بات پر رک گیا۔
"کیا نام ہے اس کا؟" خرم اسے بغور دیکھنے لگا اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔
"اس کا نام..... واجد ہے۔" جس طرح وہ سوچ کر بولی تھی اس پر خرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے مگر وہ ایک ذہنی بیمار لڑکی کو بھلا کیا کہتا وہ سچ بولے یا جھوٹ یہ اس کے اختیار سے باہر کی چیزیں تھیں پھر وہ بھی کہے بغیر نہ رہ سکا۔
"سوری زوبیہ تمہارا تکا ٹھیک نہیں لگا۔ حمید کے والد کا نام واجد نہیں ہے۔" خرم یہ کہہ کر رکا نہیں اور فوراً وہاں سے باہر نکل آیا مبادا زوبیہ پھر کوئی بات کہہ کر اسے روک لے۔
اسے صرف زوبیہ کو سچائی سے روشناس کرانا تھا اب یقین کرنا نہ کرنا اس کا مسئلہ تھا ویسے اسے امید تھی زوبیہ سچ جان بھی لے گی تب بھی اس کی ذہنی حالت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا وہ شائستہ خالہ کے خاکے کو دیکھنے کی اتنی عادی ہو گئی ہے کہ اب وہ اس الوژن (Illusion) سے باہر نہیں نکل سکتی۔

☼ ☼ ☼

خرم سے منگنی ٹوٹنے کے بعد نمل کو ایسا لگتا جیسے وہ بالکل قید ہو کر رہ گئی ہو عظمت خلیل کے بہت سارے جاننے والوں نے فون کر کے باقاعدہ اظہار افسوس کیا تھا جس پر عظمت خلیل ان کے سامنے تو مظلوم بنے رہے مگر نمل پر برستے رہے، جن کی وجہ سے انہیں آج دنیا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑ رہا تھا۔
بدیں رشیدہ اور نمل نے ان کی باتوں سے عاجز آ کر دوبارہ یونیورسٹی جانے کا ارادہ کیا تھا رشیدہ اس کے فیصلے پر بہت پریشان تھیں کہ اس طرح عظمت خلیل اور بھڑک اٹھیں گے مگر نمل اس ماحول سے تنگ آ گئی تھی اسے معلوم تھا عظمت خلیل کا غصہ آسانی سے ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا پھر وہ کیوں وقت ضائع کر رہی ہے مگر رشیدہ کی پریشانی کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ عظمت خلیل کے صبح جانے کے بعد اپنی یونیورسٹی کے لیے نکل گئی تاکہ انہیں پتا نہ چلے۔
حالانکہ یہ کوئی حل نہیں تھا آج نہیں تو کل وہ جان ہی جاتے مگر عظمت خلیل سے وابستہ کسی بھی مسئلے کا کوئی حل تو کبھی ہوتا ہی نہیں تھا اس میں صرف آنکھیں بند کر لینا ہی نمل کو آتا تھا۔
مگر یہاں وہ آنکھیں بند کر کے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی اس کے سمسٹر قریب تھے اور وہ کوئی چھٹی نہیں کرنا چاہتی تھی پھر بھی یونیورسٹی جاتے وقت وہ خود بھی نروس تھی سب کے ساتھ ساتھ خرم کا سامنا کرنے کے خیال سے وہ عجیب سی ہچکچاہٹ کا شکار تھی مگر اپنے ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اس کی ساری گھبراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔
سمیر اپنے دوستوں کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر براجمان تھا نمل پر نظر پڑتے ہی اس نے بڑے بھرپور انداز میں اس کا استقبال کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔
"Welcome Back Welcome Back" اس کی دیکھا دیکھی اس کے سارے دوست اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے جو لوگ نمل کی طرف متوجہ نہیں بھی تھے وہ بھی اس پر جوش انداز پر رک کر نمل کو دیکھنے لگے۔
نمل کو سمیر کا یہ انداز بہت زیادہ بھایا تو نہیں تھا البتہ وہ جو سب کی طرف سے ہمدردی بھرے اظہار افسوس کی توقع کر رہی تھی اور یہ سوچ کر اس کی کوفت میں اضافہ ہوئے جا رہا تھا وہ اس استقبال پر ایک دم ہلکی ہو گئی اور زبردستی مسکرا کر یہ ظاہر کرنے لگی کہ وہ ان کے خوش آمدید کہنے کے طریقے پر بہت خوش ہے۔
"اس کارٹون سے جان چھوٹنا بہت بہت مبارک ہو۔" سمیر نے اس کے قریب آ کر بڑے تپاک سے مبارکباد دی تو نمل ایک بار پھر صرف مسکرا کر رہ گئی۔
"کیا خیال ہے اس بات پر سیلیبریٹ نہ کیا جائے۔" سمیر نے تائیدی انداز میں اپنے دوستوں کی جانب دیکھا تو انہوں نے "فوراً" ہی تالیوں اور سیٹیوں کے ساتھ سمیر کو رضامندی دے دی مگر اب کی بار نمل خاموشی سے مسکراتی نہیں رہی بلکہ "فوراً" ہی انکار کرتے ہوئے بولی۔
"نہیں سمیر میں اتنے دنوں بعد آئی ہوں مجھے ابھی صرف پڑھائی پر دھیان دینا ہے۔"
"ارے ہم سیلیبریشن کینٹین میں ہی کریں گے کہیں باہر تھوڑی جائیں گے۔" سمیر نے ماتھے پر آئے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے خوامخواہ اسٹائل جھاڑنے کی کوشش کی۔
"نہیں سمیر پلیز۔" نمل کسی طور پر راضی نہیں تھی۔ کینٹین میں سیلیبریٹ کرنے کا مطلب پوری یونیورسٹی میں خوشی منانا تھا بھلے ہی وہ لوگوں کی ہمدردیوں سے بچنا چاہتی تھی مگر اس طرح تماشا کرنا اسے ہرگز منظور نہیں تھا۔
"ارے بل میں پے کروں گا بلکہ باہر سے کچھ آرڈر کرتے ہیں اور تمہاری اور میری کلاس کے تمام اسٹوڈنٹس انوائیٹڈ ہوں گے۔" سمیر کے با آواز بلند کہنے پر سمیر کے دوست تو کیا آس پاس کھڑے تمام لڑکے لڑکیاں زور زور سے آوازیں نکالتے ہوئے تالیاں پیٹنے لگے۔

نمل اس صورت حال پر زچ ہو کر رہ گئی مگر وہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ وہ دکھی ہے اس لیے اس کا موڈ خراب ہے البتہ اس نے اپنی سی کوشش ضرور کر ڈالی سمیر کو منع کرنے کی۔
اتنے تماشے کے علاوہ اسے یہ بات بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ سمیر اتنا بڑا بل پے کرے ان کے بیچ ایسی کوئی دوستی نہیں تھی نہ ہی سمیر اس کی گڈ بک میں تھا خرم کو جلانے کے لیے اس سے بات چیت کر لینا الگ بات تھی مگر سمیر کو وہ اپنے قریب آنے کا موقع اور اجازت ہرگز نہیں دینا چاہتی تھی اور نہ ہی وہ لوگوں پر ایسا کوئی تاثر دینا چاہتی تھی کہ ان کے کوئی گہرے مراسم ہیں جبکہ اگر سمیر نے اس کے لیے سیلیبریشن رکھا تو یہ تو سیدھا سیدھا اسکینڈل بن جائے گا۔
مگر وہاں اتنے لوگ موجود تھے کہ سمیر کے پیزا منگوانے کا شوشا چھوڑتے ہی وہاں ایک شور بلند ہو گیا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی نمل متلاشی نظروں سے سنبل اور رومیلہ کو ڈھونڈنے لگی۔
شاید انہیں بھی اس کے آنے کی اطلاع مل گئی ہو مگر وہ تو نظر نہ آئیں تو نمل خود ہی بھیڑ کو چیرتی اس ہجوم سے نکل آئی۔
سمیر نے پیچھے سے اسے دو تین آوازیں بھی دیں مگر وہ برہم سی بغیر مڑے آگے بڑھتی رہی۔
سنبل اور رومیلہ کلاس میں ہی موجود تھیں اور اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گئی تھیں مگر پیریڈ آف ہونے پر اس نے انہیں سمیر کے متعلق بتانا چاہا تو کلاس کی لڑکیوں نے اسے گھیر لیا اور ہمدردی کی آڑ میں جانے کیا کیا سنانے اور جتانے لگیں کہ تبھی ایک لڑکے نے کلاس کے دروازے سے جھانکتے ہوئے چلا کر کہا۔
"لیڈیز اینڈ جینٹل مین، نمل کی منگنی ٹوٹنے کی خوشی میں سمیر نے نمل کی پوری کلاس کو کینٹین میں پیزا کی دعوت دی ہے۔ پیزا کی ڈیلیوری ہو چکی ہے اور بہت مقدار میں ہونے کے باوجود دیر سے آنے والوں کو نہ ملنے کی شکایت ہو سکتی ہے کیونکہ جب مفت کا بٹتا ہے تو سب اگلے چار دن کے کھانے کی کسر ایک ہی وقت میں نکال لیتے ہیں۔ لہٰذا پہلے آئیں اور پہلے پائیں۔" وہ بالکل اشتہاری انداز میں اعلان کر کے پلٹ گیا اور کلاس میں کھلبلی مچ گئی سب اپنی اپنی بولی بول رہے تھے مگر ایک تبصرہ بڑا واضح تھا۔
"سمیر نے منگنی ٹوٹنے کی خوشی میں اتنے لوگوں کو پیزا کی دعوت دی ہے آخر یہ کیا چکر ہے۔"
سنبل اور رومیلہ ہونق بنی اس ساری صورت حال کو دیکھ رہی تھیں۔
"چلو اٹھو نمل تمہیں تو ضرور چلنا چاہیے تمہارے اعزاز میں اتنی بڑی پارٹی ہے۔" آسیہ نے اس کے قریب آ کر پرجوش انداز میں کہا ان سب کو فی الحال مفت کا پیزا کھانے میں دلچسپی تھی باقی ساری باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی تھیں ایسا نہ ہو کہ کہیں پیزا ختم ہو جائے اور وہ لوگ ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہ جائیں کچھ لوگ تو سالوں کے بھوکوں کی طرح کلاس سے باقاعدہ بھاگے تھے۔
"ٹھونا؟" آسیہ نے گھر کا تو نمل تپ گئی۔
"مجھے نہیں جانا تم ہی کھاؤ۔"
"میں تو کھانے جا رہی ہوں مگر تم ساتھ چلو گی تو زیادہ اچھا لگے گا۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔
"مجھے نہیں جانا سمجھ میں نہیں آ رہا کیا؟" نمل چیخ پڑی۔
"یہ ڈراما کس خوشی میں کر رہی ہو کیا مجھے نہیں پتا کہ تم خرم سے منگنی پر بالکل خوش نہیں تھیں اور کیوں نہیں تھیں یہ اندازہ بھی کافی پہلے ہو گیا تھا جب فیس بک پر رومیلہ کے ولیمے کی Pics سمیر نے ڈالی تھیں۔ گویا تم نے سمیر کو بلایا تھا حالانکہ خرم کا شادی میں آنا تمہیں بہت برا لگا تھا۔" آسیہ سفاکی سے بولی نمل کا بس نہیں چل رہا تھا اس کے منہ پر تھپڑ مار دے اسے بے تحاشا غصے میں دیکھ کر سنبل نے اس کا ہاتھ ہلکے سے دباتے ہوئے گویا اسے

خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔
"آسیہ کسی بھی لڑکی کے لیے منگنی ٹوٹنا کوئی خوشگوار واقعہ نہیں ہو سکتا چاہے وہ منگنی اس کی مرضی سے ہوئی ہو یا بغیر مرضی کے۔ لہٰذا ایسے المیہ کو سیلیبریٹ کرنا اور اس پر خوشی منانا نہایت غیر مہذب اور نامناسب بات ہے۔ سمیر یہ سب اس لیے کر رہا ہے کہ وہ خرم کا مخالف ہے اور اسے خرم کو ذلیل کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ خرم اور سمیر کی لڑائی ہے اس میں نمل کو بیچ میں مت گھسیٹو۔
جس طرح خرم بغیر انویٹیشن کے رومیلہ کی شادی میں آ گیا تھا اسی طرح اگلے دن سمیر بھی بن بلائے آ گیا خرم کو تپانے کے لیے۔ ابھی بھی وہ یہ سب خرم کو تپانے کے لیے کر رہا ہے تمہیں پیزا کھانے جانا ہے تم جاؤ اور کھاؤ۔ لیکن ہم لوگ گھر جا رہے ہیں ہم اتنا تماشا بننا برداشت نہیں کر سکتے۔!" سنبل نے کہنے کے ساتھ ہی ان دونوں کو ان دونوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔
نمل ایک سلگتی ہوئی نظر آسیہ پر ڈال کر کلاس سے باہر نکل گئی اس کے ساتھ سنبل اور رومیلہ بھی تھیں نمل کے کانوں میں آسیہ کے جملوں کی بازگشت ہو رہی تھی سمیر جیسے گھٹیا شخص کے ساتھ اس کا نام لیا جا رہا تھا اس کا خون کھول کر ابلنے لگا تھا۔
مگر یہ سب اس کا اپنا کیا دھرا تھا بھلے ہی سنبل نے آسیہ کے سامنے سمیر کی رومیلہ کے ولیمے میں موجودگی کو اس کا خود ساختہ عمل قرار دے دیا تھا مگر وہ تو سچائی سے واقف تھی۔ اس نے خود ہی سمیر کو بڑھاوا دیا تھا جو آج وہ اس طرح اسے اپنی دشمنی میں مہرے کی طرح استعمال کر رہا تھا۔
خرم کو نیچا دکھانے کا کیا بہترین طریقہ نکالا تھا سمیر نے۔
نمل سلگتے ذہن کے ساتھ تیز تیز چلتی جا رہی تھی کہ اپنے ساتھ چلتی سنبل اور رومیلہ کو ٹھٹکتا دیکھ کر وہ بھی رک کر انہیں دیکھنے لگی ان دونوں کی نظریں ایک ہی نکتہ پر مرکوز تھیں۔
نمل نے غیر ارادی طور پر ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو خود بھی ٹھٹک گئی ان سے کافی فاصلے پر خرم سینے پر ہاتھ باندھے اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ نا صرف موجود تھا بلکہ اسی کی جانب متوجہ بھی تھا۔
نمل کو رکتا دیکھ کر وہ ایک ایک قدم اٹھاتا عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ایک ایک لفظ چبا کر پوچھنے لگا۔
"کیا یہ سیلیبریشن تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے۔" نمل اس کے انداز پر جانے کیوں کچھ نروس سی ہو گئی شاید اس لیے کہ اس کے تیور بڑے جارحانہ تھے۔
وہ کچھ بول نہ سکی تو رومیلہ جھنجھلا کر کہنے لگی۔
"کیا ہو گیا ہے خرم آپ کو۔ بھلا نمل ایسی گھٹیا حرکت کیوں کرے گی۔" "سمیر کا کہنا ہے کہ اسے پتا تھا آج نمل آنے والی ہے لہٰذا اس نے پیزا کا آرڈر پہلے سے دے رکھا تھا تبھی تو ایک گھنٹے میں اتنے پیزا آ گئے ہیں کہ جو اسٹوڈنٹس انوائیٹڈ نہیں تھے وہ بھی گھس گئے ہیں۔" خرم کو بغیر وہاں جائے ساری اطلاعات مل گئی تھیں۔
اس کا تو دل چاہ رہا تھا ابھی جا کر سمیر سے دو دو ہاتھ کر لے مگر اس وقت اسے سمیر سے زیادہ غصہ نمل پر آ رہا تھا۔
اس کے سوال پر نمل بھی ہونٹ بھینچ کر رہ گئی جبکہ رومیلہ پہلے زیادہ چڑے ہوئے انداز میں بولی۔
"خرم کراچی میں اتنے پیزا پوائنٹس ہیں کہ ایک گھنٹے میں اس سے ڈبل بھی آ جائیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ سب اس نے ایک ہی جگہ سے نہیں منگوایا ہو گا کئی جگہ سے ایک ساتھ آرڈر کیا ہو گا۔ بجائے ان ساری باتوں کو سمجھنے کے آپ نمل پر چڑھائی کرنے آئے ہیں حالانکہ آپ دونوں کی دشمنی کی وجہ سے آج نمل کا اس طرح تماشا بن رہا ہے۔" رومیلہ کو اس صورت حال نے سخت اذیت میں مبتلا کیا تھا تبھی وہ بھنا کر بولی تو خرم بھی تپ کر کہنے لگا۔

"میری اور سمیر کی دشمنی کی وجہ سے یہ نہیں بھگت رہی بلکہ اس نے تو بہت فائدہ اٹھایا ہے اس دشمنی کا اس نے خود اس گھٹیا انسان کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا ہے اب اگر وہ اپنی اصلیت پر اتر آیا ہے تو نمل کو لگ رہا ہے کہ اس کا تماشا بن رہا ہے۔" خرم کی بات پر رومیلہ ایک دم لاجواب ہو گئی۔

خود نمل بھی تھوڑی دیر پہلے یہی سوچ کر کڑھ رہی تھی مگر اب یہی بات خرم کے منہ سے سن کر نمل تڑپ اٹھی اس لیے جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں سمیر، آسیہ، یہاں تک کہ عظمت خلیل کے لیے بھی جو غصہ تھا ان سب کی کھولن نے زہر بھر دیا تھا۔

"ہاں یہ سب میری مرضی سے ہو رہا ہے میں نے خود سمیر کو اپنے قریب آنے کا موقع دیا ہے اس لیے نہیں کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور میں تمہیں جلانا چاہتی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ مجھے بہت پسند ہے کیونکہ وہ تم سے لاکھ گنا بہتر ہے تم تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔" رومیلہ اور سنبل ہکا بکا کھڑی نمل کو سن رہی تھیں۔

انہیں علم تھا نمل یہ سب صرف غصے میں بول رہی ہے ایک تو وہ پہلے ہی تپی ہوئی تھی اس پر خرم اس سے صفائی مانگنے آگیا نمل کے لیے گویا خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔

اس کا کہا ایک ایک لفظ تیر کی طرح جا کر خرم کو لگا تھا اس کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا اپنے لیے اس کے دل میں اتنی نفرت دیکھ کر خرم سناٹے میں چلا گیا۔

اسے معلوم تھا وہ اسے پسند نہیں کرتی۔

اسے معلوم تھا وہ اس سے سخت خائف ہے۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ سمیر کے لیے بھی کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتی۔

لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اس سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ اس کے مقابلے میں سمیر کو ترجیح دے سکتی ہے۔ جو یونیورسٹی میں اسے اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے استعمال کر رہا ہے اس کی تعریف کر سکتی ہے۔

آج جبکہ خرم اس کی خوشی کی خاطر اس کی راہ سے خود ہی دور چلا گیا ہے تو آج بھی وہ اس کا موازنہ سمیر جیسے چھچھورے بندے کے ساتھ کر سکتی ہے۔

کتنی ہی دیر وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور پھر اسی خاموشی سے پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

نمل جیسے کسی نیند سے جاگ اٹھی جب وہ یہ سب بول رہی تھی تب بھی اس کے دماغ کا کوئی کونا اسے یہ سب کہنے سے روک رہا تھا مگر خرم کے خاموشی سے چلے جانے پر وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے تو کچھ کہا ہی نہیں کوئی بحث، کوئی جھگڑا، کوئی تاویل کچھ بھی نہیں۔

وہ گم سم سی اپنی جگہ کھڑی رہی کہ تبھی سنبل نے دونوں بت بنی نمل اور رومیلہ کا ہاتھ پکڑا اور بغیر کچھ کہے آگے بڑھنے لگی تو وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ گھسٹنے لگیں۔

✲ ✲ ✲

نمل پر عجیب سی کیفیت چھائی تھی خرم تو خاموشی سے چلا ہی گیا مگر سنبل اور رومیلہ تک نے اسے ایک لفظ نہیں کہا حالانکہ وہ چاہ رہی تھی کہ سنبل اس پر غصہ کرے رومیلہ اسے باتیں سنائے مگر ان دونوں نے چپ سادھ لی تھی۔

ان سب کا رویہ مل کر اسے شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل رہا تھا اپنی خجالت کم کرنے کے لیے وہ تھک کر بس یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ خرم کو آخر ضرورت کیا تھا اس وقت اس کے سامنے آنے کی جب اس کا غصے سے برا حال تھا اور اس کا اپنی زبان پر قابو نہیں تھا۔ لہٰذا ساری غلطی خرم کی تھی کہ اس نے نمل کو نہایت غلط وقت پر چھیڑا تھا۔

رات کے گیارہ بجے وہ اپنے کمرے میں لیٹی چھت کو گھورتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے

لگا۔ ایک ان نون ______ نمبر دیکھ کر پہلے تو نمل نے سوچا کہ کال اٹینڈ نہ کرے لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے فون کان سے لگا لیا مگر دوسری طرف خرم کی آواز سن کر وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"ہیلو نمل میں خرم بات کر رہا ہوں تمہارے پاپا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے تم فوراً نیچے آجاؤ میں گیٹ کے باہر ہی موجود ہوں۔"

"کیا!" نمل کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"آہستہ بولو آنٹی کو پتا نہیں چلنا چاہیے وہ پریشان ہو جائیں گی وہ ہسپتال میں ہیں تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" نمل حواس باختہ سی بستر سے اتر آئی اور دوپٹہ اوڑھتے اور چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے وہ ایک سانس میں پوچھے جا رہی تھی۔

"کون سے ہسپتال میں ہیں پاپا؟ کیا ہوا ہے انہیں؟ تمہیں کیسے خبر ہوئی؟" وہ اتنی ہراساں تھی کہ خرم کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر گیٹ تک آگئی خرم نے اس کے دو تین سوالوں کا جواب دیا بھی تھا مگر وہ سننے کے ہوش میں ہی نہیں تھی۔

چوکیدار اسے اتنی رات گئے گھر سے نکلتا دیکھ کر پریشان ہوتا اس کے قریب چلا آیا مگر وہ اسے تفصیل بتانے کے حق میں نہیں تھی خرم کی گاڑی گھر کے گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی خرم بھی اسے چوکیدار سے بات کرتا دیکھ کر گاڑی سے اتر آیا جو کہہ رہی تھی۔

"خاندان میں کچھ ایمرجنسی ہو گئی ہے میں تھوڑی دیر میں گھر آجاؤں گی۔" خرم کو دیکھ کر چوکیدار نے مزید کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اسے ابھی تک یہی پتا تھا کہ خرم اس کا منگیتر ہے منگنی ٹوٹ چکی ہے اس بات کا اسے کوئی علم نہیں تھا اور اتنی رات گئے زندگی میں پہلی بار وہ اتنی پریشان شکل لیے ایمرجنسی کا بول کر گھر سے جا رہی تھی تو اس کے یقین نہ کرنے کی بھی کوئی تک نہیں تھی۔

نمل تیزی سے خرم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی خرم نے بھی سنسان سڑکوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی فل اسپیڈ پر دوڑانی شروع کر دی۔

"کیسے ہوا ہے ایکسیڈنٹ؟ کیا وہ گاڑی میں تھے؟"

"ہوں۔" خرم نے پوری توجہ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"تو کیا تم نے انہیں دیکھا ہے وہ کون سے ہسپتال میں ہیں؟" نمل کے پوچھنے پر خرم ایک بار پھر مختصراً بولا۔

"نہیں۔"

"تمہیں کس نے اطلاع دی؟ تم نے اس سے پاپا کی حالت نہیں پوچھی؟" نمل کچھ زچ ہو کر بولی۔

"آں۔۔۔ تھوڑی دیر میں تمہیں سب پتا چل جائے گا۔ تھوڑی دیر خاموشی سے بیٹھ کر دعا کر لو۔" خرم کا انداز کچھ ٹالنے جیسا تھا نمل ٹھٹک کر اسے بغور دیکھنے لگی جسے خرم نے فوراً ہی محسوس کر لیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔" خرم نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔

"کیا وہ بہت سیریس ہیں؟" نمل کے لہجے میں خوف نمایاں تھا خرم کچھ متذبذب سا ہو گیا۔

"وہ زندہ تو ہیں نا۔" نمل کو اپنی آواز خود عجیب لگی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔" خرم چڑ گیا۔

"تو تم کچھ بتا کیوں نہیں رہے۔" نمل خاصی اونچی آواز میں بولی تو خرم بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

"میں تو سمجھتا تھا تمہیں اپنے باپ سے کوئی محبت نہیں ہو گی مگر تمہارا ری ایکشن تو میری توقع کے برعکس

ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" نمل جھنجلائی مگر اس بار خرم خاموش ہی رہا تو نمل جیسے خائف ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بار پھر خرم کی طرف الجھن بھری نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں وہ کون سے ہسپتال میں ہیں کچھ تو بتاؤ۔" خرم اب کی بار بالکل خاموش رہا تو نمل ایک ایک لفظ چبا کر کہنے لگی۔

"تم نے مجھے جھوٹ بول کر بلایا ہے ان کا کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا ہے۔" خرم اب بھی خاموش رہا تو نمل نے بے اختیار اسٹیرنگ اپنی طرف موڑتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت میرے گھر چھوڑ کر آؤ خرم ورنہ میں تمہیں جان سے ماردوں گی۔" نمل کی اس اچانک حرکت سے گاڑی بری طرح بے قابو ہو گئی تھی مگر سڑک سنسان ہونے کے باعث کسی ہولناک حادثے سے محفوظ رہی۔

"نمل کیا ہو گیا ہے تمہیں پاگل تو نہیں ہو گئیں۔" ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ کو سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے نمل کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے یہ تو سی ویو آگیا ہے تم مجھے کوئی اسپتال لے کر نہیں جارہے مگر میں تمہیں بتادوں میں تمہیں تمہارے ناپاک ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی میں اسی سمندر میں کود کر جان دے دوں گی۔"

"شٹ اپ۔" نمل کی بات پر خرم دھاڑ کر بولا تو وہ ایک دم سہم گئی۔

اس وقت خرم نے بھی گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا دروازے کو پوری قوت سے اپنے پیچھے بند کر کے وہ گھوم کر نمل کی طرف آیا اور اس کا دروازہ کھول کر بڑے جارحانہ انداز میں بولا۔

"اترو۔" نمل سن ذہن کے ساتھ سیٹ میں دبکی رہی تو خرم نے خود ہی اس کا بازو پکڑ کر اسے اتنی زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

گاڑی سے باہر آتے ہی ماحول کی ہیبت پوری طرح اس پر طاری ہو گئی سی ویو کا یہ ایریا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا خاموشی اتنی گہری کہ ہواؤں کی سرسراہٹ پر کسی آندھی کی آواز کا گمان ہو رہا تھا۔ ارد گرد اتنا سناٹا تھا کہ کوئی بلی کا بچہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

نمل نے شور مچانا چاہا مگر آواز کہیں گم ہو گئی تھی اس نے اپنا بازو چھڑوانا چاہا مگر ہاتھ میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ خرم کی فولادی گرفت کا مقابلہ کر سکتی۔

وہ بے بسی سے اس کے ساتھ کھنچتی پتھروں تک آگئی جہاں سے اندھیرے میں ڈوبا سیاہ سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا مگر نمل کی نظریں سمندر کے قریب جمی محفل پر جا کر ٹک گئیں۔

ساحل کے بالکل قریب گیلی ریت پر لکڑیوں کے ذریعے آگ روشن کر کے چار پانچ لڑکے لڑکیوں کے جوڑے نہایت واہیات حلیے میں بے ہودہ ناچ میں مست تھے۔

ہواؤں کا رخ کچھ ایسا تھا کہ موسیقی کی آواز نمل تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر ڈیک کی موجودگی اور لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ میں موجود بڑے بڑے چھلکتے جام چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ایسی حرام افعال اور اشیاء پر مبنی محفل موسیقی کے بغیر ہرگز مکمل نہیں ہو سکتی۔

"ان لڑکوں کو پہچانتی ہو۔" خرم نے اسے بغور ان لوگوں کو دیکھتا دیکھ کر پوچھا تو نمل جیسے ایک دم ہوش میں آگئی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے پہچاننے کی چھوڑو مجھے۔"

"یہ سمیر اور ان کے دوست ہیں۔" خرم ایسے بولا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

خرم کی بات پر نمل لمحہ بھر کے لیے چونکی پھر تنک کر بولی "تو میں کیا کروں۔" نمل کا خون کھولنے لگا تھا سمیر کا نام سن کر۔

اس کے سمجھ میں آگیا تھا خرم اسے یہاں سمیر کی اصلیت دکھانے کے لیے لایا ہے کہ وہ اسے اس حال میں دیکھے اور جان لے کہ وہ کتنا گرا ہوا شخص ہے۔

لیکن وہ تو اس سے متاثر تھی ہی نہیں جو سمیر کی حقیقت کھولنا ضروری ہوتا وہ تو جل بھن گئی تھی اس کے اس فعل پر۔

"تم صرف اتنا کرو کہ اپنا غصہ ایک طرف رکھ کر غور سے اس پیلے ٹراؤزر والے کی شکل دیکھ لو تو شاید تمہیں یاد آجائے کہ تم اسے بہت اچھی طرح جانتی ہو۔" خرم سپاٹ لہجے میں بولا۔

نمل نے اس لڑکے کو دیکھنا چاہا مگر روشنی اتنی نہیں تھی کہ پہچان پاتی مگر اسی وقت وہ لڑکا رقص چھوڑ کر چادر پر رکھی ایک اور ڈرنک اٹھانے آیا اب وہ آگ کے اتنے قریب تھا کہ اس کا پورا وجود روشن ہو گیا۔

نمل کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا وہ اس شخص کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی چاہے اس بات کو کتنا ہی وقت گزر جائے۔

بہت پہلے کی بات تھی جب ایک لڑکا اس سے ٹکرایا تھا اور اس نے اپنی پوری کولڈ ڈرنک نمل پر الٹ دی تھی خرم نے آکر اس شخص کی پٹائی بھی کی تھی مگر نمل خرم پر ہی پل پڑی تھی۔

کیونکہ اس کا خیال تھا خرم نے اس کے سامنے ہیرو بننے کے لیے یہ سارا ڈرامہ رچایا تھا بات اگر صرف یہیں ختم ہو جاتی تو بھی قابل فراموش تھی مگر کسی نے اس سارے تماشے کی ویڈیو بنا کر فیس بک میں ڈال دی تھی۔

اس لڑکے کا نمل سے ٹکرانا اور نمل کا پورا بھیگ جانا جانے کتنے لوگوں نے دیکھا تھا نمل کا یہ سوچ کر کئی ہفتوں تک دل خون ہوتا رہا تھا۔

اور آج وہی لڑکا یہاں سمیر کے ساتھ تھا سمیر اس سے کچھ بات کرنے اس کے نزدیک آگیا تھا سمیر کا چہرہ بھی روشنی میں ہونے کے باعث باآسانی پہچانا جاسکتا تھا دونوں کسی بات پر تالی مار کر خباثت سے ہنس رہے تھے۔

نمل دم بخود انہیں دیکھ رہی تھی جبکہ خرم اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے رسانیت سے کہنے لگا۔

"یہ سمیر کا کزن ہے جو لاہور میں رہتا ہے فطرت اور عادت میں یہ سمیر جیسا ہی ہے لہٰذا سمیر کے کہنے پر اس نے وہ سارا ڈرامہ کیا تھا اور پہلے سے کیمرہ تیار رکھ کر وہ مووی سمیر نے ہی بنا کر فیس بک میں ڈالی تھی۔

اس لڑکے کو یونیورسٹی میں اتنا ڈھونڈا گیا تھا لیکن وہ یہاں ہوتا تو ملتا نا۔ آج کل یہ لاہور سے آیا ہوا ہے ان کے گروپ میں ایک لڑکی ہے۔ شیلی جو خوامخواہ مجھ سے دوستی کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ اسی نے فون کر کے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ لڑکا جسے ایک زمانے میں بہت تلاشا گیا تھا۔ سمیر کا کزن ہے اور یہاں سی ویو کے اس پوائنٹ پر سمیر کے ساتھ موجود ہے۔

میں اسی وقت گھر سے نکل گیا اور تمہیں لیتا ہوا سیدھا یہاں پہنچا ہوں۔ اس کے لیے ایک جھوٹ بھی بولنا پڑا کیونکہ عام حالات میں تم میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔" خرم رک کر نمل کی شکل دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔

خرم باآسانی محسوس کر سکتا تھا کہ اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم رہا ہوگا جب یہ ذلیل شخص نہایت گھٹیا انداز میں نمل سے ٹکرایا تھا۔ خرم کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر خود ہی کہنے لگا۔

"تم سوچ رہی ہوگی ضروری نہیں یہ سمیر کا کزن یا دوست ہو۔ ہو سکتا ہے تم اسے بھی میری کوئی سازش سمجھ رہی ہو۔ تو خود سوچو کہ وہ مووی اتنی مشہور ہوئی تھی کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ سمیر نے نہ دیکھی ہو پھر اس نے اس شخص کو اپنی محفل میں کیوں شامل کیا۔

کیا سمیر کی نظر میں وہ حادثہ اتنا معمولی تھا کہ سمیر نے اسے فراموش کرتے ہوئے اس گھٹیا شخص کو اپنی پارٹی میں انوائٹ کرلیا یا پھر سمیر کو اس کا چہرہ سرے سے یاد ہی نہیں رہا تب ہی اس سے دوستی کرلی۔

اگر تمہارے ذہن میں یہ سارے شک و شبہات ابھر رہے ہیں تو بتاؤ میں انہیں بھی دور کردیتا ہوں۔" خرم بڑے پرسکون انداز میں پوچھ رہا تھا۔

کیونکہ یہ کام اس کے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔ خرم نے شیلی کا تذکرہ بڑے سرسری انداز میں کیا تھا۔ ورنہ سچ تو یہ تھا کہ شیلی ایک زمانے سے خرم کی دوستی کی خواستگار تھی۔

مگر ایک تو خرم کو لڑکیوں سے دوستی کرنے کا شوق نہیں تھا۔ دوسرے وہ خرم کے ٹائپ کی بھی نہیں تھی۔ سمیر کے گروپ کی ایک نہایت آزاد خیال جسے خرم اپنی زبان میں دو نمبری لڑکی کہتا تھا۔ ایسی لڑکیوں کو وہ اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ اب جب سے خرم کی منگنی ٹوٹنے کے متعلق شیلی نے سنا تھا وہ اس سے خوامخواہ کی ہمدردیاں جھاڑنے لگی تھی۔ آج کی سمیر کی پارٹی پر وہ باقاعدہ اظہار افسوس کرنے آئی تھی اور کیونکہ تب تک اس کے اور نمل کے بیچ وہ بحث ہو چکی تھی۔ لہٰذا خرم نے غصے میں اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔

اسی لیے اس وقت رات میں جب سمیر کی پارٹی میں شیلی نے سمیر کے ساتھ اسی لڑکے کو دیکھا جس کی وجہ سے نمل نے خرم کو تھپڑ مارا تھا تو وہ اس کا تعارف حاصل کرنے کو بے چین ہوگئی اور یہ جان کر کہ وہ سمیر کا کزن ہے اور لاہور میں رہتا ہے۔ اس نے فوراً "چپکے سے خرم کو فون کردیا اور یہاں تک دعوا کردیا کہ وہ اسے یقین دلانے کے لیے سمیر اور اس کے کزن کی بچپن کی تصویریں تک نکلوا سکتی ہے۔

جو کہ واقعی شیلی کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ ذرا سا اس کے کزن کے سامنے مسکرا دیتی اور وہ یہ جانے بغیر کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے اپنا پورا بائیوڈیٹا اسے پکڑا دیتا۔

اسی لیے خرم نے بھی اتنے یقین سے کہہ دیا مگر نمل نے تو جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ ایک سکتے کے عالم میں سمیر اور اس کے کزن کو دیکھ رہی تھی جو ایک بار پھر لڑکیوں کے سامنے رقص میں مشغول ہوگئے تھے۔

ان کی حرکتیں اور انداز دیکھ کر نمل کو اپنے آپ سے کراہیت آرہی تھی کہ اس شخص نے اسے چھوا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس شخص کو قتل کردے۔

مگر اچانک اس خواہش پر ایک دوسری کیفیت طاری ہوگئی۔ خرم اس وقت اس شخص کو سبق سکھانے کے لیے آگے بڑھا تھا اور اس کی اچھی خاصی درگت بھی بنادی تھی۔ مگر نمل نے مداخلت کرکے نا صرف اسے بچالیا تھا بلکہ خرم کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا تھا کیونکہ وہ اس ساری صورت حال کا ذمہ دار اسے ہی سمجھ رہی تھی۔

چنانچہ اس وقت اس لڑکے سے زیادہ اسے خرم پر غصہ آیا تھا اور اب اس لڑکے کے لیے نفرت محسوس کرنے سے زیادہ وہ خرم کے لیے شرمندگی محسوس کررہی تھی۔

کتنا ذلیل کیا تھا اس نے خرم کو' حالانکہ یہ سب سمیر کا کیا دھرا تھا اور سمیر نے وہ مووی فیس بک پر ڈال دی۔ پوری یونیورسٹی میں اس نے خرم کو خوار کرکے رکھ دیا مگر بدلے میں خرم نے کیا کیا اس کے ساتھ؟

ایک زبردستی کی منگنی جسے خود ہی اس نے توڑ بھی دیا۔ حالانکہ یہ فیصلہ خرم کے لیے آسان نہیں ہوگا پھر بھی اس نے نمل کو اس طوق سے آزاد کردیا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

سرد باد صبا کے جھونکے سے اس کے لمبے سنہری بال اس کے سرخ چہرے کے آڑے آگئے — اس نے ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے دھکیلا اور اپنی سرمئی آنکھوں کو ادھر ادھر گھمانے لگی۔

ہر سمت سکوت چھایا ہوا تھا اور اوس خوب صورت مناظر کو دھندلا کر رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک لان میں ٹہلتی رہی اور خوب صورت اور رنگ برنگے پرندوں کو ہوا میں جھومتے دیکھتی رہی۔ وہ کافی کا مگ لے کر لان میں بچھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھانسی کی آواز وقفے وقفے سے آرہی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی' سامنے کرسی پہ دادا جان بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا دادا جان' آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟ ساری رات آپ کھانستے رہے۔ دوائی لی آپ نے؟" ثانیہ نے پریشانی میں سارے سوال ایک ساتھ ہی کر ڈالے۔

دادا جان نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا بس سردی ہو گئی ہے اور یہ تو ہو گا ہی' عمر کا تقاضا ہے کہ بیماریاں ایک کے بعد دوسری آتی رہیں گی۔ اچھا آج میں نے تمہارے لیے کچھ خاص بنایا ہے رات کے کھانے میں۔ بس تم جلدی آجانا آفس سے۔"

"جی دادا جان میں آج جلدی گھر آجاؤں گی۔ اب میں آفس کے لیے نکل رہی ہوں' اپنا خیال رکھیے گا۔" یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آئی۔

گارڈن میں صوبیہ پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی اور ساتھ ہی کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

"صوبیہ آپی! میں آفس جا رہی ہوں۔" ثانیہ نے اسے بتایا اور نکل گئی۔

"دادا جان نے رات کا پروگرام تو بتا دیا نا تمہیں ثانی؟" وہ پیچھے سے زور سے بولی تھی۔

"جی ہاں بتا دیا ہے۔ آج جلدی آجاؤں گی؟" ثانیہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ آفس کا راستہ کافی دور تھا اور صبح کے وقت موسم بہت خراب تھا۔

اس نے لمبا گہرا سانس لیا اور خود سے باتیں کرنے لگی۔

اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھر میں پھر خوشیاں آجائیں گی۔ اسے معلوم تھا کہ آپی ہنر مند ہیں اور بہت ہوش مند' طاقتور اور حوصلہ مند بھی۔ مگر وہ یہ سوچتی تھی کہ شاید وہ اس کی ماں کی جگہ نہ لے سکیں۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ آفس کے دروازے پر پہنچ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

گیسٹ ہاؤس کے دروازے پر کھڑی وہ اپنے جوگرز کی ڈوریاں کھول رہی تھی۔ دادا جان کچن میں مصروف تھے' جبکہ صوبی آپی ڈائننگ ٹیبل سجا رہی تھیں۔ ثانیہ نے ہاتھ دھوتے ہوئے دادا جان سے پوچھا۔

"میں کچھ مدد کرواؤں دادا جان؟"

اتنے میں دادا جان ہاتھ میں مکمل سنہرا روسٹ ہوا مرغ اوون سے نکال کر لائے اور کمرے میں اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔

"او مائی ڈیئر! آجاؤ جلدی سے فریش ہو جاؤ۔" دادا جان ثانیہ سے مخاطب تھے۔

ثانیہ دروازے پر کھڑی ہر چیز کو تک رہی تھی۔ ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ کھانے کی میز پر سرخ اور سفید رنگ کی موم بتیاں سجی ہوئی تھیں۔ لوکی کا حلوہ کھانے کی میز کے ایک طرف ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھا تھا۔ شاید سویٹ ڈش میں بھی ثانی ہی کی پسند کو مد نظر رکھا گیا تھا۔ گھر کی تیار کی ہوئی چٹنی' شکر قندی اور شاہ بلوط پھل کے پارچے۔

اس کا دل پسیجنے لگا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہر چیز ہی تو تھی۔ مگر میز کے کونے میں کرسی کو کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ جہاں اس کی ماما ہمیشہ بیٹھا کرتی تھیں۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ صوبیہ اور دادا جان سب کچھ چھوڑ کر اس کے پیچھے آگئے۔

وہ اپنے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کا دل دکھ سے چور تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ اپنے آپ کو قابو میں کرنا چاہ رہی تھی مگر پھر بھی نہیں کر سکی تھی۔ ہر گزرتا لمحہ اور ہر گزرتا دن اسے بوجھل کرتا جا رہا تھا۔

اس کے دل و دماغ پر وہ شام گہرے نقوش چھوڑ گئی تھی جسے مسلسل و لگاتار آنسو بھی نہیں دھو پائے تھے۔

وہ شام جب وہ ماما کو زبردستی شاپنگ کے لیے مال لے گئی تھی۔ اس کی ماما نے کئی بہانے کیے مگر وہ نہیں مانی اور چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے اس کی ماما کو ماننے ہی بنی۔

اچھا خاصا خوش گوار موسم تھا پھر اچانک ہواؤں میں تیزی آگئی اور اتنی تیزی آگئی کہ ہوائیں طوفان میں بدلنے لگیں۔ اتنی تیز بارش تھی وہ ڈرائیو بھی ٹھیک سے نہیں کر پا رہی تھی۔ روڈ کافی دھندلا نظر آرہا تھا پھر اچانک سامنے سے آنے والے ٹرالر نے اس کی گاڑی جس میں وہ اور ماما تھیں ہوا میں اڑا دی' پھر جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ سامنے اس کے دادا جان اور آپی کھڑے تھے۔ آپی نے اسے بتایا کہ ماما ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں ان میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس کے آگے کچھ بتا سکتیں۔

اسے اندازا نہیں رہا تھا کہ وہ کتنی دیر تک چیختی رہی شاید افسوس سے زیادہ ملامت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

کچھ لمحوں بعد اسے اپنے گرد ہمدرد ہاتھ محسوس ہوئے۔

"اپنے آپ کو سنبھالو ثانی۔" اس کے دادا جان کی آواز تھی۔

"یہ قدرت کا کھیل ہے اور قدرت انسان کو کئی مشکل مراحل سے گزارتی ہے اور پھر بھی صبر کی توقع کرتی ہے۔ ہم نے بھی بہت بڑا سہارا کھو دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو قصور وار مت سمجھو۔ یہ سب خدا کا طے کیا ہوا ہوتا ہے اور وہ انسان کو ہی ذریعہ بناتا ہے اسی میں حکمت ہے۔"

وہ صوبی کی ٹھہری گہری نیلی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی' جو اسے سمجھا رہی تھیں۔

"میں ماما کو بہت یاد کرتی ہوں آپی۔ اور آج ہی نہیں' بلکہ ہر روز مجھے ماما یاد آتی ہیں اور میرا دل انہیں ڈھونڈتا ہے۔"

وہ صوبیہ کو بتا رہی تھی۔

"ہاں مجھے پتا ہے ثانی میری جان۔" صوبیہ نے اس کے ماتھے کو چوما۔

"ماما ہمارے ساتھ ہیں ثانی! اور وہ کبھی بھی نہیں چاہتی تھیں کہ تم دکھی ہو اور خدا کے پاس بھی وہ تمہیں دکھی دیکھ کر تکلیف میں ہوں گی۔ ماما کی یہی خواہش تھی کہ وہ تمہیں کامیاب دیکھیں اور تم اس طرح کرو گی تو ختم ہو جاؤ گی۔"

ثانیہ کا حلق خشک ہو چکا تھا اس نے سر ہلایا۔ جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔

"اب آجاؤ جلدی! دیکھو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" دادا جان نے اسے اٹھایا اور وہ سب کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

صبح کے دھندلکے میں اس نے کھڑکی سے پردے اٹھائے۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ ہلکی بارش کے ساتھ ساتھ اولے بھی کھڑکی پر ٹک ٹک آواز پیدا کر رہے تھے۔ وہ لان میں نکل آئی اور گول گول جھومنے لگی۔ اسے بچپن سے ہی بارش بہت پسند تھی۔ بارش کی سرد بوندیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ وہ کافی دن بعد خوشی محسوس کر رہی تھی۔ فرزانہ خالہ اور ان کا بیٹا علی محسن پاس کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر ان پر پڑی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"محسن! تم یہاں؟" ثانیہ نے تعجب سے پوچھا۔

"ہم یہاں نہیں آسکتے ثانی؟" خالہ نے طنزیہ لہجہ میں سوال کیا۔ "یا ہماری بہن چلی گئی تو ہم یہاں نہیں آسکتے۔"

"نہیں میرا مطلب وہ نہیں تھا آئیے آپ لوگ اندر آجائیں۔" ثانیہ نے فوراً کہا۔

علی محسن سے صوبیہ کی منگنی اس وقت ہوئی تھی جب وہ منگنی کا مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔ مگر اس کے ذہن میں تو راج کمار تھا جو اس کی ماما کی سنائی ہوئی بیڈ اسٹوریز میں مقید تھا اور وہ اس کے رہا ہونے کے انتظار میں تھی۔ یہ منگنی اس کی نانی کے اصرار پر کی گئی تھی۔ چونکہ علی محسن اکلوتا تھا اور خالہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے پاپا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

صوبیہ کو شروع سے ہی علی محسن پسند نہیں تھا۔ مگر اب وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے جذبات پر ضبط کر کے وہ کھانا ختم کر کے اٹھ گئی۔

کمرے میں گہرا سکوت تھا وہ اپنی ڈائری کھول کر پڑھ رہی تھی۔ آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ اس چاند کو دیکھ رہی تھی اور اسے اپنی ہی طرح اتنے بڑے آسمان میں تنہا سمجھ کر اس کے ساتھ تھی۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ جب اس کے ڈیڈی نے اس کی ماما کو روتا چھوڑ کر کسی اور سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اس کے بعد ان کی ماں ہی ان کے لیے سب کچھ تھی اور وہی سب کچھ آج اس کے پاس نہیں تھا۔

"آخر تم کن سوچوں میں گم رہتی ہو ثانی؟" صوبیہ نے تاسف سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں آپی! بس اس کمرے سے اور اس چاند سے میری یادیں وابستہ ہیں۔" اس کی ان باتوں سے صوبیہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی بہن کو پرسکون دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر شاید وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں اسے جھنجھوڑنے لگی۔

"دیکھو ثانی زندگی ایسے نہیں گزرے گی اور ابھی تو تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہوگا۔ زندگی بہت مشکل ہے ثانی! اسے اس طرح گزارو گی تو یہ تمہارے لیے اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ مجھے اندازا ہے کہ تم ماما کی وجہ سے دکھی ہو۔ مگر یہ مت بھولو کہ وہ تمہیں کتنا چاہتی تھیں اور ابھی بھی اگر وہ تمہیں دیکھ رہی ہیں تو یاد رکھو وہ تمہیں دکھی دیکھ کر خود بھی دکھی ہوں گی۔" وہ ثانیہ کی طرف سے کوئی جواب نہ پاتے ہوئے کمرے سے چلی گئی۔

سردی کافی حد تک بڑھ گئی تھی۔ اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب باسط نے اسے اپنا خواب سنایا تھا اور وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کلاس کے بینچ پر سے اٹھ گئی تھی۔

"سنو ثانی! کل رات میں نے ایک خواب دیکھا' آسمان پر چھوٹی سی پری بالکل انگوٹھی کے موتی کی طرح' وہ اخروٹ کے خالی چھلکے پر سوار آسمان پر سیر کر رہی تھی۔ اس کی سواری پریوں نے اٹھائی ہوئی تھی۔ اس سواری کے پہیے مکڑی کے پیروں سے بنے تھے۔ اس سواری کو چلانے والا اس کو چپو سے چلا رہا تھا اور وہ چپو بھی جھینگر کی ہڈی سے بنے تھے۔ وہ پری ساری رات سفر کرتی رہی۔ جانتی ہو وہ پری کون تھی؟"

"تم..... وہ پری تم تھیں ثانی۔"

خواب سارے خیال سارے
حقیقتوں کا لبادہ اوڑھے
تمہاری ہستی سنوار جائیں
یہ چاند سورج' یہ سارے تارے
چراغ جتنے بھی جل رہے ہیں
تمہارے چہرے کے رنگ دکھائیں تو ہار جائیں
یہ بہتی ندیاں' یہ چڑھتے دریا
یہ گہرا ساگر' یہ جھیل جھرنیں
یہ آبشاریں' یہ اپنا جیون
تمہاری آنکھوں پر وار جائیں
یہ رنگ' خوشبو' گلاب سارے
محبتوں کے نصاب سارے
یہ سب تمہاری بلائیں لیں
اور نظر تمہاری اتارے جائیں

"چھوڑو باسط' میں اپنی زندگی میں بہت آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میں ان محبتوں کے سحر میں قید نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ محبتیں اچھے خاصے انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہیں اور وہ پھر دیوانگی میں فرہاد کی طرح دودھ کی نہر کھود سکتے ہیں یا پھر مجنوں کی طرح دیوانہ بن کر پتھر کھا سکتے ہیں اور یہ حقیقت کی زندگی نہیں ہے۔ زندگی تو ہم سے ہر طرح کا تقاضا کرتی ہے۔ باسط مجھے اپنے گھر والوں کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔"

وہ بہت اچھے لہجے میں باسط کو سمجھا رہی تھی اور وہ دن کالج کا آخری دن تھا۔ بی کام کا آخری پیپر تھا۔ اب ان دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ باسط نے اس سے پہلے ایسی کوئی بات ثانیہ سے نہیں کی تھی۔ مگر آج اسے کہنے کے لیے آخری دن تھا اور وہ اس دن کو مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

باسط کو اپنے دل کی بات بتانے پر بھی کچھ حاصل نہیں ہوا اور پھر اس نے ثانیہ سے رابطے کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔

ثانیہ نے مسکراتے ہوئے ڈائری بند کی تھی مگر اسے اب واقعی اپنی زندگی کا مقصد سمجھ میں آ رہا تھا۔

"میں بہت آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔"

یہ جملہ اس نے کبھی باسط کے سامنے کہا تھا وہ بے حد متاثر ہوا اور پھر اس نے واقعی ایسا ہی کیا۔ وہ اخبارات اور انٹرنیٹ پر جاب تلاش کرنے لگی۔ کافی جگہ ٹرائی کی کیا مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر کہیں سیٹ نہ ہو سکی۔

ان ہی دنوں میں سے ایک دن وہ تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی۔ دادا جان نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا ثانی! کوئی جاب ملی؟"

"نہیں دادا جان' میں نے بہت جگہ ٹرائی کیا ہے۔ اب تک کوئی مناسب جگہ جہاں میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر سکوں سمجھ میں نہیں آئی اور ابھی کوشش جاری ہے۔" ثانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہے شاباش کوشش کرتی رہو۔" دادا جان مضبوط و پر عزم لہجے میں بول رہے تھے۔

"اچھا سنو ثانی!" ثانیہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ دادا جان کو کچھ یاد آ گیا۔

"جی دادا جان!" ثانیہ رک گئی۔

"وہ تمہاری فرزانہ خالہ کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ علی محسن کی شادی جلد سے جلد کرنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔"

"مگر دادا جان صوبیہ آپی سے تو پوچھ لیں۔" ثانیہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ صوبیہ علی محسن کو بالکل پسند نہیں کرتی کیونکہ وہ تو بہت پہلے سے ہی اپنے چاچا کے بیٹے فرحان کو پسند کرتی ہیں مگر کبھی اظہار نہیں کیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں اسے پا نہیں سکتے کہ معاشرہ اور ذمہ داریوں کے بوجھ کی وجہ سے یا پھر اپنے بڑوں کی عزت اور مان کی خاطر محبتوں کو فراموش کر دیتے ہیں یا پھر ہم سے محبتیں چھن جاتی ہیں؟

"ہاں بیٹا! میں نے پہلے اسے ہی بتایا ہے۔ اس نے کہا جیسا آپ کی مرضی' آپ جب چاہیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" دادا جان ثانیہ کو بتا رہے تھے۔

صوبیہ ایک ایسی لڑکی تھی جس نے کم عمری میں ہی اپنی چھوٹی بہن کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کی اپنی ماں پر زیادتیاں دیکھ لی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ معاشرہ میں رہنے کے اصول کیا ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ذمہ داریاں اس کے فرائض ان کے بڑوں کی عزت کے آگے اس کی محبت کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور آج بھی وہ اپنی یہی ذمہ داری نبھانے کے لیے اپنی محبت کو نظر انداز کر کے شادی کے لیے راضی تھی۔

"صوبیہ آپی آپ علی محسن سے شادی کے لیے راضی ہیں؟" ثانیہ نے سوال کیا تھا۔

"ہاں ثانیہ! اب ظاہر ہے ہماری منگنی ہو گئی ہے۔ اک نہ اک دن شادی تو ہو گی نا اور کب تک ہم دادا پر بوجھ بنے رہیں گے۔ ایک عرصہ ہو گیا ہے ہمیں یہاں رہتے ہوئے ثانیہ..... بس اب تمہارے لیے بھی کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر تمہاری بھی شادی کر دیں گے۔" صوبیہ کے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ تھی۔

"اچھا چھوڑو تمہاری جاب کا کیا ہوا؟" صوبیہ نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر موضوع ہی

بدل ڈالا۔

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ سب جانتی تھی اس لیے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے دماغ میں بہت سے سوالات تھے۔ ان تمام سوالات کو دماغ میں بٹھائے وہ ایک آفس جارہی تھی۔ جس کا اشتہار اس نے انٹرنیٹ میں دیکھا تھا۔

خوشگوار سی صبح میں اس نے بلو شرٹ اور میرون پاجامہ پہن رکھا تھا اور بلیک کلر کا اسکارف سر پر باندھا ہوا تھا۔ صبح کی نرم دھوپ اس کے چہرے کو اور بھی سنہرا کررہی تھی۔ اس نے آفس کی سیڑھیوں کو عبور کرتے ہوئے امید باندھی کہ آج جاب مل ہی جائے گی اور اپنی پروفائل کاؤنٹر پر دے کر انٹرویو کے لیے ویٹنگ روم میں بیٹھ گئی اور ٹیبل پر رکھا ہوا میگزین اٹھا کر صفحہ الٹنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد اسے آفس میں بلایا گیا۔ جب وہ آفس کے دروازے پر پہنچی تو اپنے سامنے ایک چہرہ پایا جو باسط کا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ دروازے پر رک گئی۔

باسط جو کہ آفیسر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے ثانیہ کو بیٹھنے کا کہا اور رسمی انٹرویو لینا شروع کردیا۔ وہ اس کی پروفائل بھی پڑھ رہا تھا اور اس سے سوال کرتے ہوئے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی اس کے سوالات کا جواب دے رہی تھی۔

"اوکے میڈم، ہم آپ کو خود کال کریں گے۔ ابھی تین دن انٹرویو چل رہے ہیں؟" باسط نے انٹرویو کے اختتام پر پھر رسمی جملہ ادا کیا۔

اور وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ یہ باسط ہی تھا؟ اگر باسط تھا تو کیا اس نے مجھے پہچانا نہیں؟ اور اگر پہچان بھی لیا تو پھر اتنا رسمی انداز؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

گھر پہنچ کر بھی اس کے ذہن میں یہی واقعہ گھومتا رہا۔ انسان کتنا بدل جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ مجھے اپنی محبتوں کے بارے میں بتا رہا تھا اور آج؟ خیر مجھے تو اپنے مقصد کو سامنے رکھنا ہے پھر چاہے سامنے کوئی بھی ہو، وہ پرسکون ہو کے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

"آج فرزانہ خالہ اور ان کی بیٹیاں اور علی محسن صوبیہ کی شادی کی تاریخ رکھنے آرہی ہیں تم آج باہر مت جاؤ۔" دادا جان ثانیہ سے ناشتے کی میز پر کہہ رہے تھے۔

"جی دادا جان اور صوبیہ آپی نے بھی آج آفس سے چھٹی لی ہے۔ میں سب انتظام کرلوں گی۔" ثانیہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور ثانیہ کچن میں مصروف تھی۔

"ہیلو!" صوبیہ نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو! جی میں باسط علی بات کررہا ہوں۔ اکریکٹ انٹرنیشنل کمپنی کا ڈائریکٹر۔ کیا میں مس ثانیہ سے بات کرسکتا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آرہی ہے۔

"جی ہاں بالکل۔۔۔ میں ثانیہ سے بات کرواتی ہوں۔"

صوبیہ یہ جانتی تھی کہ ثانیہ آج کل جاب کی تلاش میں کوشش کررہی ہے اور یہ فون بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ صوبیہ فون۔۔۔ کو ہولڈ پر رکھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

"ثانی تمہارا فون آیا ہے کوئی باسط علی ہیں۔" صوبیہ جلدی جلدی بتا رہی تھی۔

ثانیہ نے بغیر کوئی جواب دیے فون کی طرف دوڑ لگادی۔

"ہیلو!" ثانیہ نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مس ثانیہ! میں باسط علی، آپ نے اپنی پروفائل ہمارے آفس میں submit کروائی تھی۔ آپ کل سے جوائن کرلیں اور آج آکر جوائننگ لیٹر لے جائیں۔" وہ کہتا جارہا تھا اور وہ بس سنتی جارہی تھی۔ اس نے اوکے کہہ کر فون رکھ دیا۔

باسط اتنا بدل گیا۔ شاید ہوسکتا ہے اس کی زندگی میں کوئی لڑکی آگئی ہو اس کے سپنوں کی شہزادی۔۔۔ مگر میں اس کے بارے میں کیوں سوچوں، میں اگر اس کی محبت کو نہیں سمجھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کی کوئی لڑکی اس کی محبت کو سمجھی نہیں ہوگی۔ وہ سوچوں میں گم کچن کی طرف چل رہی تھی۔

"کیا ہوا ثانی۔۔۔ کون تھا؟" صوبیہ نے اس کا چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔

"آپی جہاں میں نے جاب کے لیے Apply کیا تھا وہیں سے فون تھا۔ انہوں نے مجھے سلیکٹ کرلیا ہے۔ کل سے ہی جوائننگ کا کہہ رہے ہیں۔" وہ صوبیہ کو بتا رہی تھی۔

"تو اس میں اتنا اپ سیٹ ہونے کی کیا بات ہے ثانی؟ یہ تو اچھی بات ہے۔" صوبیہ خوشی سے کہہ رہی تھی۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں دونوں بہنوں کے بیچ میں؟ کیا اچھی بات ہے۔ ہمیں بھی تو بتاؤ۔" دادا جان کچن کے دروازے پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"دادا جان، بہت اچھی بات ہے ثانی کی جاب ہوگئی ہے۔" صوبیہ نے بتایا۔

"واہ بھئی! دو، دو خوش خبریاں ایک ساتھ۔" دادا جان بہت خوش تھے۔ مگر نہ جانے صوبیہ آپی کے دل میں کیا تھا جو اس نے آج تک کسی کو بتانا ضروری نہیں سمجھا یا صحیح نہیں سمجھا۔

شام کے چار بج رہے تھے۔ ثانیہ ڈائننگ ٹیبل پر ہر طرح کے لوازمات سجا رہی تھی۔

"فرزانہ خالہ کی فیملی کتنے بجے آرہی ہے، دادا جان؟" ثانیہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

دادا جان سے ثانیہ باتیں کررہی تھی۔ اسی دوران دروازے کی بیل بجی۔

"لگتا ہے فرزانہ خالہ آگئیں۔" ثانیہ بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

دروازے پر فرزانہ خالہ اور ان کی تین بیٹیاں کھڑی تھیں۔

"آئیے نا!" ثانیہ ان کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

شام ہوچکی تھی اور ناشتا بھی۔ اب اصل مقصد کی باتیں ہورہی تھیں۔ یعنی صوبیہ کی شادی کی دن تاریخ طے ہورہی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی مہر، جہیز اور مہمانوں کی تعداد پر بھی بحث ہورہی تھی۔

صوبیہ کی ددھیال سے کوئی رشتہ دار ایسا نہ تھا جو کبھی کسی خوشی یا غم میں ان دونوں بہنوں کا پرسان حال ہوتا۔ اس لیے آج بھی ننھیال کی طرف سے ہی دو، تین خالہ اور ایک بڑے ماموں اس تقریب میں شرکت کرنے آئے تھے۔

طے یہ پایا کہ ایک مہینہ بعد سے شادی کی رسمیں شروع ہوجائیں گی۔ ثانیہ نے صوبیہ کو بچپن سے محنت کرتے دیکھا تھا اور اسی محنت کی کمائی سے اس لڑکی نے اپنی اور اپنی چھوٹی بہن کی شادی کا سامان پہلے ہی تیار کرلیا تھا۔ صوبیہ کو اپنی چھوٹی بہن سے بہت محبت تھی اور ثانیہ کے دل میں اپنی آپی کے لیے عزت، اس کی نظر میں وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ اونچے مرتبہ پر فائز ہوتی جارہی تھی۔

الارم کی آواز نے اسے نیند کی گہری وادیوں سے نکالا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا، موسم قدرے خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا اور بادلوں میں چھپا سورج فضا کو خوشگوار تاثر دے رہا تھا۔ وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ میرون شرٹ اور بلو جینز پر اسکارف لیے وہ موسم کی خوب صورتی سے مقابلہ کررہی تھی۔

آفس کے دروازے پر پہنچ کر اس نے خود کو سنبھالا اور ویٹنگ روم میں بیٹھ گئی۔ "مس ثانیہ سر نے آپ کو آفس میں بلایا ہے۔" ایک لڑکی جو وائٹ اسکرٹ اور بلیک شرٹ میں تھی اس سے مخاطب ہوئی۔

"جی۔۔۔ اچھا۔" وہ اس کو جواب دے کر اٹھ گئی۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں سر!" اس نے اجازت طلب کی۔

"آئیے مس ثانیہ۔" باسط نے اسے اندر آنے کے لیے کہا تھا۔

"سر آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ابھی انٹرویوز چل

رہے ہیں۔ پھر آپ نے مجھے ایک ہی دن میں جوائن کرنے کا کیوں کہا؟" ثانیہ نے اس سے سوال کیا تھا۔

"جی۔۔۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ اس جاب کے لیے مجھے مناسب لگیں اس لیے۔" باسط کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

ثانیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید باسط نے اسے یہ جاب دے کر اس پہ احسان کیا ہے۔

لیکن بات کچھ اور ہی تھی اور وہ باسط کی ثانیہ سے بے انتہا محبت تھی اور آج وہ اسے یہ بات بتا نہیں پا رہا تھا۔

ثانیہ چونکہ گھر میں سب کو یہ خوش خبری دے چکی تھی کہ اس کی اچھی جاب ہو گئی ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آپی کی شادی کے بعد اسے ہی گھر اور دادا جان کو سنبھالنا تھا۔ وہ ساری باتوں کو بھلا کر اس جاب کے لیے تیار ہو گئی۔

صوبیہ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف رہتے ہوئے بھی اس نے اپنا کام احسن طریقے سے کیا۔ باسط علی کے آفس کے سامنے اس کا روم تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہتا تھا۔ مگر ثانیہ اس بات سے لاعلم تھی۔ پھر ایک دن وہ لنچ کے لیے کینٹین میں بیٹھی تھی تو باسط بھی وہیں آگیا۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھنے لگی۔

"پلیز بیٹھو ثانیہ!" وہ خود بھی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اچھا' یہ بتاؤ کیسا لگا میرا آفس؟" وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"ہاں بہت اچھا ہے' ہر چیز پرفیکٹ۔" ثانیہ نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"اور میں؟" باسط نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔۔۔؟" وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو اور سناؤ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟" باسط نے بات کا رخ بدل دیا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں مگر سب ٹھیک ہوتے ہوئے بھی مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا ہے۔ جب سے ماما مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تب سے۔" بڑی بڑی آنکھوں میں نمی اترنے لگی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

"کل صوبیہ کی مایوں کی رسم ہے آفس سے چھٹی لے لینا ثانی۔" دادا جان ثانیہ کو تاکید کر رہے تھے۔

"جی دادا جان!" ثانیہ تیاریوں میں مصروف تھی۔

اسی مصروفیت میں وہ باسط کو بتا ہی نہ سکی کہ اس کی آپی کی مایوں کی وجہ سے وہ آفس نہیں آسکے گی۔

دوسری صبح باسط اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا اور تقریباً" پانچ' چھ مرتبہ سیکریٹری سے ثانیہ کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ اسی بے چینی میں اس نے ثانیہ کو فون ملا دیا۔

"ہیلو۔۔۔" ریسیور ثانیہ نے ہی اٹھایا۔

"میں باسط علی بات کر رہا ہوں۔" وہ ثانیہ کی آواز پہچان چکا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نا ثانیہ؟ آج آفس نہیں آئیں؟ سب خیریت ہے نا؟ تم نے فون کر کے بتایا بھی نہیں کہ تم نہیں آرہی ہو؟" وہ اضطرابی کیفیت میں بس بولتا جا رہا تھا۔

"ارے سنیں تو!" ثانیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میری آپی صوبیہ کی آج مایوں کی رسم ہے۔ میں بتانا چاہتی تھی مگر میرے ذہن سے نکل گیا۔"

"ذہن سے نکل گیا؟ تم اتنی لاپروا کیسے ہو سکتی ہو؟ تمہیں اندازا ہے' میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا؟ کتنی بار پوچھا؟ تم کبھی نہیں سمجھو گی ثانیہ کبھی نہیں۔" اس کے منہ میں اس کے دل کی جو بھی باتیں آرہی تھیں وہ بولتا جا رہا تھا۔

"تم نہ پہلے سمجھیں نہ اب' لگتا ہے تم سب سمجھنے کے باوجود مجھے سمجھنا نہیں چاہتیں۔" اس نے فون کاٹ دیا تھا۔

اور ثانیہ کا جسم یخ بستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ریسیور اس کے کان سے لگا رہ گیا۔ وہ سوچنے لگی کیا میں واقعی نہیں سمجھی؟ کیا میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتی؟

مہمان آہستہ آہستہ آنا شروع ہو گئے تھے۔ ثانیہ کسی پر کچھ بھی افشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بی گرین قمیص پر اس نے پیلا چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا اور پیلا دوپٹا جس پر ہری دھنک لگی ہوئی تھی۔ لمبے بال' کشادہ آنکھیں' ساری دنیا کا حسن اس میں سمٹ آیا تھا۔

مایوں کی رسم بہت اچھے طریقے پر ہو گئی مگر صوبیہ بظاہر خوش ہونے کا دکھاوا کر رہی تھی۔ وہ اپنی محبت اپنے ہاتھوں سے کھو رہی تھی۔

ثانیہ کو بچپن سے بہت محبت ملی' مگر اس نے ان محبتوں کو نظر انداز کر دیا آج اسے اس بات کا دکھ تھا۔ وہ باسط کی محبت کو قبول کرنا چاہتی تھی اور صبح ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

صبح ہوتے ہی وہ جلدی آفس کے لیے نکل گئی۔ اس کے ہاتھ میں صوبیہ کی شادی کا کارڈ بھی تھا جس پر باسط کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ اسے مدعو کرنا چاہتی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ کافی دیر ہو گئی باسط نے اسے کسی کام سے بلایا نہیں۔ کیونکہ وہ ہر تھوڑی دیر میں اسے کسی نہ کسی غیر ضروری کام کے لیے بلاتا رہتا تھا۔

وہ بے چینی کی کیفیت میں باہر نکل کر باسط کے آفس کی طرف گئی۔ آفس خالی تھا' جو اس بات کو ظاہر کر رہا تھا کہ باسط آج آفس نہیں آیا۔

وہ باہر آئی اور باسط کی سیکریٹری کو کارڈ دیتے ہوئے بولی۔

"یہ سر کو دے دینا اور یہ میری چھٹی کی درخواست ہے۔ میری بڑی بہن کی شادی ہے میں چار دن نہیں آؤں گی؟"

کل آپی کی شادی ہے۔ وہ بھی چلی جائیں گی تو میں اور بھی اکیلی ہو جاؤں گی۔ وہ ایک بہت ہی زیادہ حساس لڑکی تھی جس نے باپ کی جدائی میں ماں کو روتا دیکھا تھا اور ماں جو اس پر جان چھڑکتی تھیں' ان کو اپنی وجہ سے جان سے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب آپی جنہوں نے ماں کی طرح اسے سنبھالا تھا اور ہمت دلائی تھی وہ بھی اس سے کوسوں دور چلی جائیں گی۔

پھر یوں ہی اسے باسط کا خیال آیا۔ وہ بھی تو اس سے

محبت کرتا ہے اور اس سوچ کے ساتھ اس کے دل میں اک نئی امید نے جنم لیا۔ وہ اس کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کی محبت کو سمجھ چکی ہے اور کل کا انتظار اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ باسط شادی میں ضرور آئے گا۔

بارات آچکی تھی۔ صوبیہ دلہن کے لباس میں ملبوس ملکہ لگ رہی تھی اور اسی کی خوب صورتی کی چھاپ اس کی چھوٹی بہن ثانیہ تھی۔ گہرے سبز کائی رنگ کے کپڑوں میں واقعی وہ باسط کے خوابوں کی شہزادی لگ رہی تھی۔

ثانیہ کی نظریں دروازے پر ہی تھیں۔ اسے باسط کا بے صبری سے انتظار تھا۔ مگر جب نکاح اور کھانے کے بعد بھی وہ نہیں آیا تو اس کی امید ٹوٹ گئی۔ اپنی بہن کی جدائی اس کی آنکھوں کو بھگو رہی تھی۔ اس رات وہ سو نہ سکی۔ اس کے دل میں عجیب سا خوف تھا۔ اس کی امیدیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں، اس سے محبت کھو نہ جائے۔ وہ اب باسط کی محبت کو بے حد محسوس کر رہی تھی۔

فرزانہ خالہ کی فیملی دبئی میں رہتی تھی۔ آج صبح کی فلائٹ سے وہ سب دبئی کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔

"اب نہ جانے کب آپی ہم سے ملیں گی دادا جان؟" ثانیہ مسلسل رو رہی تھی۔ ایئر پورٹ پر سے جہاز کو اپنی منزل کی طرف اڑتے ہوئے اس نے دادا جان سے کہا تھا۔

"وہ جہاں رہے خوش رہے بیٹا' بس یہی دعا ہے ہماری، بہت صبر کیا ہے اس نے بالکل اپنی ماں کی طرح۔" دادا جان کو صوبیہ پر فخر تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی پر کشش لگ رہی تھی۔ آفس پہنچ کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے ایک بار باسط کے آفس جھانک کر دیکھا تھا۔

"مس ثانیہ! یہ آپ کا کارڈ۔۔۔ باسط سر انگلینڈ شفٹ ہو گئے ہیں۔ ان کی شادی وہیں طے ہو گئی ہے۔ اب ان کی جگہ ان کے بھائی آفس سنبھالیں گے۔ یہ کارڈ میں انہیں دے نہ سکی۔" باسط کے سیکریٹری نہ جانے اسے کیا بتا رہی تھی اور اس کی آواز ثانیہ کے کانوں پر ضرور پڑ رہی تھی۔ مگر دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

"کیا اس نے محبتوں کو کھو دیا تھا یا پھر اس سے محبتیں چھن گئی تھیں؟" اس نے ماؤف ذہن کے ساتھ سوچا۔

اپنی نادان چاہتوں پر اک کتاب لکھوں گی
بےوفا تھی بے حساب لکھوں گی
مجھے ہر وقت الجھائے رکھا سوالوں نے
آج وقت پہ گھر آئی ہوں ان کے جواب لکھوں گی
اک بار ساری روشنی میرے آنگن میں کر دے تو
عمر بھر کے نصابوں میں تجھ کو مہتاب لکھوں گی

وہ بہت دیر سے غائب دماغی سے ایک غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ اسے آس پاس کا ہوش نہیں تھا کہ کون آ رہا ہے یا کون جا رہا ہے۔ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت دور سے اسے آواز دے رہا تھا۔

"ثانیہ۔۔۔ ثانیہ۔"

اس نے دماغ کے منتشر خیالات کو یکجا کیا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔

"باسط۔" اس کے لب تھرتھرائے۔

"ثانیہ۔۔۔ ذرا میرے روم میں آئیں۔" باسط اسے کہہ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔ ثانیہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ کیا میں اپنے حواسوں میں نہیں ہوں' اس نے اپنے ماتھے کو رگڑا۔

"مس ثانیہ! آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ کیا میں دوسری لادوں۔" پیون مودب انداز میں کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ نہیں یہ سب حقیقت ہے میں اسی دنیا میں ہوں۔ حقیقت کی دنیا میں' میں خواب نہیں دیکھ رہی۔" اس نے خود کو یقین دلایا اور اسے سر کے اشارے سے نفی میں جواب دے کر کھڑی ہو گئی۔

خواب کی سی کیفیت میں چلتی وہ باسط کے روم میں دستک دے کر داخل ہوئی تو باسط اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"یقین نہیں آ رہا نا۔"

ثانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا اب میری محبت سے انکار کرو گی۔ ثانیہ۔۔۔ دیکھو میری طرف اور سچ سچ بتاؤ کہ کیا مجھ سے محبت نہیں کرتیں یا اب بھی تمہیں انکار ہے۔ اگر تم کہو گی نہیں' تو میں یقین نہیں کروں گا۔ کیونکہ میری سیکریٹری نے جب تمہیں میری شادی کا بتایا تھا تو تمہارے چہرے پر وہ سب لکھا تھا جو میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا تھا مگر۔۔۔ وہ سب سننے کے لیے ہی ڈراما کیا تھا۔" ثانیہ خاموش رہی۔

"میں جانتا تھا کہ تم کبھی بھی اقرار نہیں کرو گی۔ مگر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پلیز اب تو کچھ کہہ دو۔" باسط اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"کیا کہوں۔" ثانیہ نے گردن جھکائے جھکائے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں؟" باسط نے سنجیدگی سے کہا۔

ثانیہ متذبذب انداز میں انگلیاں مروڑتی رہی۔

"اوکے۔۔۔ تم پریشان نہ ہو۔ میں زبردستی تم سے کچھ نہیں کہلواؤں گا۔ اپنے دل کی رضا اور خوشی سے تم جب تک کچھ نہیں کہو گی۔ میں تم سے اصرار نہیں کروں گا۔"

باسط جا کے واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹیبل پر رکھی فائل اٹھا کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ثانیہ نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا کچھ لمحے سوچا پھر کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی' باسط افسردگی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ ایک دم واپس پلٹی باسط نے بوکھلا کر نظریں نیچے کر لیں۔

"آپ دادا جان سے کب ملنے آئیں گے؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"دادا جان کے منہ سے اقرار سن کر مجھے کیا ملے گا۔" باسط نے شرارت سے کہا۔

"آپ پہلے دادا جان سے اقرار کروالیں پھر میں بھی کرلوں گی۔"

"نہیں میری یہ شرط ہے کہ پہلے تم کرو گی اقرار میری محبت کا۔" باسط ضدی لہجے میں بولا۔

"آپ کو ایک نظم سناؤں۔" ثانیہ نے نرمی سے کہا۔

باسط نے اثبات میں گردن ہلائی۔

ثانیہ نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔

اب آؤ ہم لوگ پھر سے سیکھیں' تمام اقرار کے طریقے
تمام دور جنوں کی رسمیں تمام اظہار کے طریقے
تم اپنی آنکھوں سے میری آنکھوں کے جام بھر دو
اگر پیالوں کے کچھ کنارے شکستہ ہوں بھی تو حرج کیا ہے
بے وفا کی نمی تو ہو گی
تم اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں کی لٹ سنوار دو
سیاہی شب کی دلفریبی نہیں ملے گی تو خوف کیا ہے
کہیں کہیں چاندنی تو ہو گی
تم اپنے ناموں کی لاکھ مہروں کو میرے چہرے پر ثبت کر دو
یہ عہد نامہ ورق ورق ہو تو سوچنا کیا!
عبارت زندگی تو ہو گی
تم اپنی باہوں کے تنگ حلقے میں مجھ کو رکھ لو
اگر نہیں جسم کا چراغاں' تو فکر کیسی
کہ روح کی روشنی تو ہو گی
یہ حسن تکرار دائمی ہے' یہ ذوق تجدید ارتقا ہے
کبھی صحیفوں کی آیتوں کو بھی پڑھتے پڑھتے کوئی تھکا ہے

ثانیہ کا مسحور کن انداز باسط کو مبہوت کر گیا اس کا دل چاہ رہا تھا ثانیہ اسی طرح سخن طراز رہے اور وہ سنتا رہے ثانیہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور باہر نکل گئی۔

"اوف۔۔۔ اتنا خوب صورت اقرار۔۔۔ ثانیہ اب تو مجھے فوراً" ہی دادا جان سے ملنا ہو گا۔"

باسط اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا مسکراتا ہوا اٹھ گیا اسے اب دیر نہیں کرنی تھی۔

☆ ☆

ریحانہ امجد بخاری

فرزان ایک دن کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو چائے پینے کی نیت سے باہر جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات چند علماء کرام سے ہوتی ہے جو اسے باقاعدگی سے مسجد آنے اور نیک اعمال کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرزان کی ان سے بحث ہوجاتی ہے۔ تو تکرار میں بہت سے لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔ اسی دوران پولیس آجاتی ہے جو ان سب کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے وہاں پر بھی فرزان پولیس والوں سے عجیب وغریب گفتگو کرتا ہے۔ پولیس والے اسے پاگل قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اذان کو ایک اسٹیج پلے کرنے کی آفر ملتی ہے۔ ساری ذمہ داریاں اسی پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق ڈرامے میں ایک لڑکی کی ضرورت ہے مگر ان کی ٹیم میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ایک دوست رانا فہیم اسے بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو یہ کردار بہت اچھا کرسکتی ہے۔ اذان اس لڑکی ماہم سے ملتا ہے۔ ماہم بہت پراعتماد اور خوب صورت لڑکی ہے جو پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتی ہے۔ اذان اس کے حسن اور صلاحیتوں سے متاثر ہوجاتا ہے مگر اس کے سامنے اعتراف نہیں کرتا۔ ماہم اس کے گروپ کے تمام لڑکوں سے فری ہوجاتی ہے اور باری باری سب کو اپنا موبائل نمبر دیتی ہے۔ اذان کو یہ بات بہت بُری لگتی ہے۔ مگر وہ اس سے موبائل نمبر نہیں مانگتا۔ اذان کا اسٹیج پلے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر اسی دوران اس کے اپنے دوست رانا فہیم سے تلخی ہوجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ماہم اب تمہارے پلے میں کام نہیں کرے گی۔ تم کوئی متبادل انتظام کرلو۔ اذان جیسے تیسے باقی کے پروگرامز کرتا ہے مگر وہ ماہم کو بھول نہیں سکا۔ وہ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا ہے۔ اس کے دوست اور ٹیم ممبرز اسے بتاتے ہیں کہ ماہم فون پر سب ہی سے بات کرتی ہے لیکن وہ ملنے کے سخت خلاف ہے اور ایک مخصوص حد تک بات کرتی ہے۔ وہ دوستی کرنے کے حق میں نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جو شخص اس سے مخلص ہوگا اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوگا وہ اسی سے تعلق رکھے گی۔ ماہم کے خیالات سن کر اذان کو خوشی ہوتی ہے۔ ماہم کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہوتا ہے اس کی ماں ایک اسکول میں کینٹین چلاتی ہے اور باپ سائیکل پر گھوم کر صبح کے ناشتے کے لیے چھولے بیچتا ہے۔ مگر وہ اپنی غربت کے باوجود ماہم کو اعلا تعلیم دلا رہے ہیں۔ ماہم بی کام کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ذہین اور حساس مگر اپنی غربت سے نالاں ہے۔ اذان کو اپنے ایک دوست سے پتہ چلتا ہے کہ ماہم ایک کریمنل آدمی سے ٹیلی فونک رابطے میں ہے اور اس کی دوستی کا دم بھرتی ہے۔ اذان کو تشویش ہوتی ہے مگر وہ اپنے دوستوں سے اس کا نمبر پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اسی دوران اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا ایک دوست رشتے میں ماہم کا چچا لگتا ہے۔ اذان اس سے ماہم کا نمبر حاصل کرلیتا ہے۔ اذان اور ماہم کی دوستی ہوجاتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ محلے دار فیضی صاحب سے فرزان کی الٹی سیدھی حرکتوں کی شکایت کرتے ہیں۔ فیضی صاحب بہت شرمندہ ہوتے ہیں اور فرزان سے سخت رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ یا تو اپنے دوستوں کو چھوڑ دو یا اس گھر کو..... فرزان ضد میں آکر اپنی بیوی زارا کو ساتھ لیتا ہے اور گھر چھوڑ دیتا ہے۔ فرزان کے گھر چھوڑنے کے بعد فیضی صاحب فرزان کی بہت کمی محسوس کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ذکیہ بیگم جو ایک ماں ہیں۔ بیٹے کی جدائی ان پر بھی بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی وکالت کرتی ہیں مگر فیضی صاحب انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ یہ سختی بیٹے کی بھلائی کے لیے کررہے ہیں۔ فرزان گھر چھوڑنے کے بعد مالی پریشانیوں کا شکار ہے اور اس کے گھریلو حالات بہت خراب ہیں۔ اس کا ایک دوست اسے ایک این جی او میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے جہاں اس کی ملاقات نیلم سے ہوتی ہے۔ نیلم کو فرزان بہت اچھا لگتا ہے مگر وہ اسے بتا دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یوں نیلم کے دل میں فرزان کی محبت پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہوجاتی ہے۔ فیضی صاحب کو بیٹے کی نافرمانی اور جدائی نے مل کر اندر سے توڑ دیا ہے۔ انہی دنوں فیضی صاحب کا دوسرے شہر جانا ہوتا ہے۔ وہ وہاں جاکر شدید بیمار ہوجاتے ہیں۔ اذان فرزان سے کہتا ہے کہ وہ جاکر ان سے معافی مانگ لے اور انہیں گھر لے آئے مگر فرزان اس سے بحث کرتا ہے اور اس کی بات ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ فرزان کو فیضی صاحب کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو اسے اپنی ضد اور ہٹ

دھری پر دل ہی دل میں بہت شرمندگی ہوتی ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اور غلط کام کرنے لگتا ہے۔ تدفین والے دن شراب کے نشے میں دھت ہو کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ فرزان کی وہی روٹین ہوتی ہے اب تو اسے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا اس کی اور اس کے دوستوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ زارا دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی ہے مگر وہ اسے ڈانٹ دیتا ہے۔ فرزان سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیے اور ڈھیر ساری دولت کمانی چاہیے وہ ان باتوں کا ذکر محبوب خان سے کرتا ہے۔ محبوب خان جلال زئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور لنڈی کوتل کا رہائشی ہے جو اسے منشیات اور اسلحہ کے کاروبار کے متعلق معلومات دیتا ہے جس میں فرزان خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ معاشی حالات اور تنگ دستی سے گھبرا کر وہ محبوب خان کے ساتھ لاہور چلا جاتا ہے۔ ان کا پروگرام ہوتا ہے کہ کچھ دن لاہور رہ کر سیر و تفریح کریں گے پھر وہاں سے لنڈی کوتل روانہ ہو جائیں گے لیکن وہاں ایک حادثہ میں فرزان شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ محبوب خان فرزان کو زخمی حالت میں اسپتال چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے لیکن وہ فون کر کے نیلم کو اس کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ فرزان ہوش آنے پر ڈاکٹر فریال سے حسب عادت عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے تو ڈاکٹر فریال کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے جاتی ہے۔ اذان اور ماہم میں بے تکلفی پیدا ہوتی ہے تو اذان اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے لیکن ماہم انکار کر دیتی ہے۔ جس پر اذان سخت ناراض ہو جاتا ہے۔ ماہم اسے دوبارہ کال کرتی ہے تو وہ ماہم سے کہتا ہے کہ اس نے اس کے انکار پر دل برداشتہ ہو کر دیوار میں ٹکریں ماری ہیں جس کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا ہے اور پیشانی پر زخم آیا ہے۔ ماہم پسیج جاتی ہے اور اگلے ہی دن اذان کی مزاج پرسی کے لیے آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

چودھویں قسط

دریا مچل رہا ہے اگر انتقام کو
میں بھی لکھوں گا ریت پہ اب اپنے نام کو
کہتے ہیں اس سے بچ کے گزرتی ہیں آندھیاں
جس قبر پہ چراغ نہ جلتا ہو شام کو
تنقید کر کے میرے ہنر کی اڑان پر
تسلیم کر رہا تھا وہ میرے مقام کو

اذان کی تیوریوں پر آڑی ترچھی کئی لکیریں نمودار ہو گئیں لیکن صرف چند لمحوں کے لیے کیوں فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''بہت جلد بلی تھیلے سے باہر آ گئی میں تو سمجھا تھا کہ بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے لیکن یہاں تو ......''

اذان کے لہجے میں بلا کی تپش تھی۔

دوسری جانب ایک جھنجھناتا ہوا قہقہہ بلند ہوا اور اذان نے بے اختیار موبائل کان سے دور ہٹا لیا چند لمحوں بعد جب اس نے دوبارہ موبائل کو کان کے قریب کیا تو فاروق ملک کی آواز سنائی دی۔

''پاپڑ تو تمہیں اب بھی بیلنے پڑیں گے مسٹر اذان فیضی کیونکہ فاروق ملک اتنا ترنوالا نہیں ہے کہ کوئی بھی ہاتھ بڑھائے اور اٹھا کر نگل لے...... اور بلی کو ایک نہ ایک دن تو تھیلے سے باہر آنا ہی تھا آخر کب تک بے چاری بھوکی پیاسی تھیلے میں بند رہ سکتی ہے۔ تھوڑی ہوا آنے دو یار۔''

''ہوا تو تمہاری ویسے ہی خشک ہو رہی ہے فاروق ملک بس عزت بچا رہے ہو لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ایک نہ ایک دن تو اونٹ کو پہاڑ کے نیچے آنا ہی پڑتا ہے اور وہ دن زیادہ دور نہیں بہتر یہی ہو گا کہ مجھ سے پنگا لینے کی کوشش مت کرو۔''

اذان زہریلی آواز میں غرایا۔

ایک مرتبہ پھر فاروق ملک کی طویل ہنسی سنائی دی پھر وہ ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے بولا۔

''کیسی بچکانہ باتیں کرتے ہیں آپ بھی ...... بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے شاید آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا کہ فاروق ملک کو اس ملک کی ساری ایجنسیاں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرنے کے باوجود آج تک تلاش نہیں کر سکیں۔ کوئی میری بھنک تک نہیں پا سکا اور آپ مجھے پنگا لینے سے منع فرما رہے ہیں۔''

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

فاروق ملک کا جملہ مکمل ہوا تو اذان ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

''شاید تم نے بھی میرے الفاظ پر توجہ نہیں دی میں تمہیں واضح لفظوں میں بتا چکا ہوں کہ میں اگر تمہارے پیچھے لگ گیا تو زمین تمہارے لیے مختصر ہو جائے گی، کسی بھی کونے کھدرے کسی بھی بل میں چھپ جاؤ گے میں ہاتھ ڈال کر، گھسیٹ کر تمہیں باہر نکال لوں گا۔''

چند لمحوں کے لیے لائن پر خاموشی چھا گئی پھر فاروق ملک کی تاؤ دلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اذان صاحب! آپ کیا سمجھتے ہیں یہ آپ کے لیے آسان ہو گا، بہت سے ادارے ٹکریں مار کر تھک گئے انہیں دانتوں پسینہ آ گیا اور آپ ......'' دوسری جانب ایک جنونی ہنسی کی آواز سنائی دی پھر فاروق ملک سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا۔

''میں بہت محتاط آدمی ہوں مسٹر اذان! یہاں تک کہ جس ٹیلی فون لائن پر میں آپ سے بات کر رہا ہوں میرے اس نمبر پر ایسا سسٹم انسٹیٹیوٹ ہے کہ کوئی میری کال تک ٹریس نہیں کر سکتا۔

میں نے کمپیوٹر سائنسز میں ماسٹر کیا ہے ہارڈ ویئر سافٹ ویئر میرے لیے کھیل ہیں، میرے نمبر پر میرا اپنا تیار کیا ہوا سافٹ ویئر استعمال ہو رہا ہے جس کی وجہ سے اگر کوئی میری لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش بھی کرے گا تو اسے یہی پتا چلے گا کہ کالر اس وقت سعودی عرب میں بیٹھا ہے۔

ایسی صورت حال میں کوئی میرا سراغ لگانے کا دعوا کرے تو مجھے ہنسی نہیں آئے تو اور کیا ہو؟''

اس کے ساتھ ہی فاروق ملک ایک بار پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ اذان نے خاموشی سے اس کی طویل گفتگو کو سنا اور پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔ ''مسٹر فاروق ملک اللہ نے ہر فرعون کے لیے اسی زمین پر ایک موسیٰ ضرور اتارا ہوتا ہے برائی کا انجام ہمیشہ بہت برا ہوتا ہے جو لوگ شیطان کے پیروکار بن جاتے ہیں وہ اللہ کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اللہ ان کی رسی دراز ضرور کرتا ہے لیکن جب وہ رسی کھینچتا ہے تو اکڑی ہوئی گردن والے لوگ منہ کے بل گر کر زمین چاٹتے نظر آتے ہیں۔

تم اپنے آپ کو ناقابل تسخیر حصار میں مقید سمجھ رہے ہو لیکن میں تمہارے مضبوط حصار کو تنکوں کی طرح بکھیر کر رکھ دوں گا تم کیا سمجھتے ہو کہ تم پراسرار قوتوں کے مالک ہو؟ کوئی مافوق الفطرت طاقت رکھتے ہو؟ اگر تم نے کمپیوٹر سائنسز میں ماسٹر کیا ہے تو تم بات بھی کسی جاہل شخص سے نہیں کر رہے ہو۔

تم تو یہ کہہ رہے ہو کہ جس نمبر سے تم بات کر رہے ہو اسے کوئی ٹریس نہیں کر سکتا، تمہاری لوکیشن نہیں جان سکتا، بڑا فخر ہے تمہیں اپنے بنائے ہوئے سافٹ ویئر پر...... لیکن اگر میں تمہاری یہ سم ہی نکلوا لوں تو کیسا رہے گا؟''

اذان کی بات مکمل ہوئی تو دوسری جانب ایک گھن گرج سے بھرپور قہقہہ بلند ہوا پھر فاروق ملک کی تمسخرانہ آواز سنائی دی۔

''اچھا جی ...... آپ تو بڑی پہنچی ہوئی چیز ہو پھر ...... میرے بھائی یہ آپ کے بس کا کام نہیں ہے ایسا ممکن ہی نہیں۔''

اذان نے نچلا ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کی آواز سنی پھر وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے چیلنج مت کرنا لیکن تم بار بار یہی غلطی کر رہے ہو، ٹھیک ہے اگر تمہیں یہ ناممکن لگتا ہے تو مجھے بھی ناممکن کو ممکن بنانے میں مزا آتا ہے، تم اپنا کوئی دوسرا کانٹیکٹ نمبر دو مجھے میں تمہیں صبح تمہارے اسی نمبر سے کال بیک کروں گا جس نمبر پر تمہیں بہت مان ہے جس پر تم نے اسپیشل سافٹ ویئر لگایا ہوا ہے۔

ایک ہلکی سی ہنسی کے بعد فاروق ملک کی آواز سنائی دی۔

''ضرور مسٹر اذان میں صبح آپ کی کال کا انتظار کروں گا آپ نمبر نوٹ کیجیے۔''

پھر نمبر نوٹ کروانے کے بعد فاروق ملک نے

سلسلہ منقطع کر دیا اور اداؤں پر خیال انداز میں موبائل فون کو گھورنے لگا۔

پھولوں کی کیاریوں کے درمیان کھڑے ہو کر اس نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں بھری اور پھر سرخ اینٹوں سے بنی روش پر آہستہ آہستہ چہل قدمی کے انداز میں وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

سورج کی شعاعیں روش کے دونوں کناروں پر موجود پھولوں کے دھلے ہوئے رخساروں کو چوم رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لان کی جانب بڑھا سامنے ہی کین کی کرسیوں پر کوئی اور بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر ایک لمحے کے لیے غور سے دیکھا وہ فریال تھی جو کسی سنگی مجسمے کی مانند ساکت و جامد بیٹھی گھر کے مین گیٹ کی جانب متوجہ تھی وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن فریال کی محویت میں کوئی کمی نہ آئی اب اسے تھوڑی سی حیرت ہوئی اس نے فریال کی نظروں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں تو سامنے سے ایک خوب صورت تراش کے سوٹ میں ملبوس بلیک کلر کا بریف کیس اٹھائے فرزان دکھائی دیا۔ جو تیزی سے بڑھتا ہوا کار پورچ کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے لپک کر دروازہ کھولا چوکیدار نے بھاگ کر گیٹ کھول دیا۔ جیسے ہی فرزان عقبی نشست پر براجمان ہوا ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور پھر لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد گاڑی مین گیٹ سے باہر نکل گئی اور چوکیدار نے گیٹ دوبارہ بند کر دیا۔

اس کی نظریں واپس پلٹیں ارر دوبارہ فریال کے چہرے پر آ رکیں لیکن فریال کی کیفیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی خالی خالی نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اب وہ آگے بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر فریال کے سامنے بیٹھتے ہوئے ہلکا سا کھنکار کر اس نے جیسے فریال کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور فریال چونک کر سیدھی ہو گئی اور پھر قدرے گھبرائے ہوئے سے انداز میں بولی۔ ارے بھائی آپ! آپ آج آفس نہیں جائیں گے؟"

اور یاور زمان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہی شفقت بھری مسکراہٹ جو فریال سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ اس کے چہرے پر سجی رہتی تھی۔ پھر اس نے اپنی کلائی فریال کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت کی مدد سے کلائی پر بندھی خوب صورت واچ کے ڈائل پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ذرا وقت دیکھو! میرے خیال میں میرے آفس جانے میں تقریباً چالیس منٹ باقی ہیں اور تمہیں بھی تو ہاسپٹل جانا ہو گا تم بھی تیار نہیں ہو ئیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

فریال نے ایک نظر یاور زمان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر نظریں چرا کر قدرے ہکلاتے ہوئے بولی۔

"وہ بھائی بس ۔۔۔ لان کی طرف نکلی تھی تو تازہ ہوا اچھی لگی۔ اس لیے کچھ دیر یہاں بیٹھ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر نکلوں گی۔ آپ ناشتا ڈائننگ ٹیبل پر کریں گے لگوا دوں۔"

"ہماری بہن کو تازہ ہوا اچھی لگتی ہے تو ہم بھی تازہ ہوا میں ہی ناشتا کرلیں گے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا ٹھہریں میں ملازمہ سے کہہ کر یہیں ناشتا لگواتی ہوں۔" فریال نے جلدی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہی ملازمہ نے ناشتا وہیں لگا دیا۔

"فرزان آج شاید کچھ جلدی چلا گیا؟" یاور زمان نے خوشبودار چائے پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کہا "نہیں بھائی وہ روزانہ ہی جلدی جاتے ہیں۔"

"بہت محنت کر رہا ہے فرزان۔" اس نے ناشتے کی ایک بڑی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ جس میں تازہ بیک کیے ہوئے رول تھے۔

"جی ۔۔۔ میں دیکھ رہی ہوں۔" فریال نے ایک رول اپنی پلیٹ میں ڈال لیا اور یاور زمان کی طرف متوجہ رہی۔

"فرزان کی یہ بات لائق تحسین ہے کہ اس نے ٹال مٹول سے کام نہیں لیا اور دو ٹوک اپنی خواہش کا

اظہار کیا۔ میں نے اسے جو آفر کی اس نے اپنی پسند سے اس آفر کو قبول کر لیا۔ اب وہ بزنس میں تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔"

"تو کیا آپ نے اتنی بڑی رقم صرف اس وجہ سے اسے دے دی کہ وہ دو ٹوک انداز میں بات کرتا ہے ٹال مٹول سے کام نہیں لیتا، لگتا ہے آپ بھی اس کی باتوں سے متاثر ہو گئے ہیں۔" فریال نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" وہ اپنی مخصوص مشفق مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ایسی بات نہیں ہے میں کوئی کام بغیر سوچے سمجھے نہیں کرتا تم جانتی ہو کہ میں صرف باتوں اور رویوں سے متاثر نہیں ہوتا رہی بات رقم کی تو پیسہ میرے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میرے لیے میری بہن کی خوشیاں زیادہ اہم ہیں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ تم بتاؤ، تم خوش تو ہو نا؟ اب تو فرزان یہاں ہے اور اپنے قدم جمانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔" فریال نے یاور زمان کو تشکرانہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"تھینکس بھائی! مجھے آپ پر فخر ہے ۔۔۔" فریال نے کچھ اور کہنا چاہا مگر یاور زمان کرسی دھکیل کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے اتنا چاہنے والا میرا بھائی ملا اللہ تعالیٰ دنیا کی ہر بہن کو ایسا اچھا بھائی دے۔"

فریال نے خلوص دل سے کہا یاور زمان نے کھڑے ہو کر اس کی بات سنی اور بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"اوکے پھر ۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ تم بھی تیاری کرو جانے کی۔" کہہ کر یاور زمان مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ فریال اسے جاتا دیکھتی رہی پھر اٹھ کر وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج اس کا موڈ نہیں ہو رہا تھا ہاسپٹل جانے کا۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ جائے یا نہ جائے۔ کچھ دیر وہ بے مقصد خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر کچھ سوچتی ہوئی غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کمرے کے ماحول سے نکل کر برآمدے میں آ کے اسے کچھ سکون کا احساس ہوا۔

باہر کا موسم قدرے خوشگوار تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا کچھ دیر پہلے نظر آنے والی سورج کی شعاعیں غائب ہو چکی تھیں اور آسمان کا رنگ کاسنی ہو رہا تھا۔

"یہاں کتنا سکون ہے۔" فریال نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لان میں لگے درخت کی شاخوں پر رنگ برنگے پھولوں کے گچھے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

یہ موسم بھی کیا ہیں۔ بارش کی ایک بوچھاڑ خزاں کو بہار میں بدل دیتی ہے۔ جب درخت اپنا سبز لبادہ اوڑھ کر فضا کا رنگ بدل دیتے ہیں پتے شاخوں کو اپنے وجود سے سرسبز کر دیتے ہیں۔ شگوفے کھلتے ہیں تو چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر جاتے ہیں۔

فریال نے مسحور ہو کر سوچا اور طمانیت سے آنکھیں بند کر لیں وہ اس مسحور کن ماحول کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

شاید بارش کے آثار تھے لگتا تھا یہ بادل کسی بھی وقت برس جائیں گے یہ نظارہ بے حد دلکش تھا۔ وہ کچھ دیر اس میں کھوئی رہی پھر کچھ دیر بعد وہ پلٹی اور کمرے کی طرف اس کے بڑھتے قدم ایک دم رک گئے۔ اس نے حیرانی سے گیٹ سے اندر داخل ہوتے فرزان کو دیکھا اور وہ اپنے دھیان میں تھا اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں موبائل تھا۔ وہ موبائل پر کسی کا نمبر ملاتا قدم آگے بڑھا رہا تھا۔

فریال غور سے اسے دیکھنے لگی کیونکہ وہ اسی طرف بڑھ رہا تھا فریال خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ فرزان نے نمبر ملا کر جیسے ہی موبائل کان سے لگایا سامنے کھڑی فریال کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"ارے آپ ہاسپٹل نہیں گئیں آج ۔۔۔" اس نے نمبر ڈس کنکٹ کر کے فریال سے سوال کیا۔ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے فریال نے جواب دیا۔

"آپ تو ابھی گئے تھے پھر دوبارہ آ گئے خیریت۔"

"ہاں میں ایک فائل بھول گیا تھا وہی لینے آیا ہوں

آپ ہاسپٹل نہیں جارہیں۔"
"میری کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔"
"کیوں خیریت کیا ہوا۔" فرزان نے سرسری انداز میں پوچھا فریال خاموش رہی کیا جواب دیتی کہ کیا ہوا ہے۔ اس کی خاموشی پر فرزان نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ اس کی نگاہیں فریال پر ہی تھیں۔ اس نے چند لمحے فریال کے جواب کے انتظار میں سگریٹ کے گہرے کش لیے پھر خود ہی بولا۔
"ویسے میں ذاتی طور پر یہ پسند نہیں کرتا کہ خواتین اپنی نسوانیت کو فراموش کرکے مردوں جیسا کردار اپنالیں جیسے مرد اپنی مردانگی کے بغیر بودا اور کمزور معلوم ہوتا ہے اسی طرح خواتین کو بھی اپنی نسوانیت کا خیال رکھتے ہوئے گھر کی چار دیواری میں سکون سے رہنا چاہیے باقی آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔"
اس نے کہہ کر دوبارہ سیل سے نمبر ملایا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
فریال کچھ الجھی ہوئی سی اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کا دراز قد دور سے کسی ہیولے کی مانند معلوم ہورہا تھا۔ فریال کے ذہن میں بہت سے مکالمات اور بہت سارے الفاظ گڈمڈ ہورہے تھے جس کا کوئی نتیجہ نکالنا اس کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔
"کیا فرزان کو پسند نہیں تھا اس کا باہر جانا۔ مردوں کے درمیان نوکری کرنا کیا یہ محبت تھی؟ تو کیا وہ بھی میرے بارے میں سوچتا ہے" اس نے طمانیت سے سوچا۔

☆ ☆ ☆

اذان چت لیٹا چھت کی جانب گھور رہا تھا اور اس کا ذہن مسلسل جیسے کوئی گتھی سلجھانے میں مصروف تھا اس وقت اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے جو لمحہ لمحہ تبدیل ہوتے دکھائی دے رہے تھے کبھی اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوجاتیں تو کبھی اس کے چہرے کے عضلات تن جاتے۔ خاصی دیر تک وہ اسی کیفیت میں بیڈ پر لیٹا رہا پھر شاید کسی نتیجے پر پہنچ گیا کیونکہ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور پھر اپنے موبائل نیٹ ورک کی ہیلپ لائن ملا کر موبائل کان سے لگالیا چند لمحوں تک خودکار ریکارڈنگ سننے کے بعد جیسے ہی رابطہ قائم ہوا وہ تیزی سے بولا۔
"دیکھیے میری ایک سم تھی جو مجھ سے کہیں مس پلیس ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بلاک کردیا جائے تاکہ کوئی اس سم کا غلط استعمال نہ کرسکے۔"
"جی بالکل اس کے لیے آپ کو کچھ معلومات فراہم کرنا پڑیں گی۔ پلیز اپنا آئی ڈی کارڈ نمبر بتایئے۔"
دوسری جانب سے آپریٹر کی شائستہ آواز سنائی دی تو اذان نے اپنا آئی ڈی کارڈ نمبر دوہرادیا۔
"اپنا پورا نام اور والد صاحب کا نام بتایئے گا۔"
آپریٹر کے دریافت کرنے پر اذان نے اپنا اور والد کا نام کنفرم کیا تو دوسری جانب سے ایڈریس کنفرم کیا گیا اذان نے اپنا ایڈریس دوہرایا تو دوسری جانب سے آپریٹر کی مہذب آواز سنائی دی۔
"بہت شکریہ اذان فیضی صاحب معلومات فراہم کرنے کے لیے آپ کا نمبر آدھے گھنٹے کے اندر بلاک ہوجائے گا۔" اور اذان نے سلسلہ منقطع کردیا۔
اذان نے موبائل دوبارہ تکیے کے نیچے رکھا اور پھر دونوں ہاتھ گردن کی پشت پر جماتے ہوئے بیڈ پر
——— لیٹ گیا اب اس کے چہرے پر طمانیت کے تاثرات تھے وہ اپنی کارروائی مکمل کرچکا تھا فاروق ملک کا نمبر وہ آج دن میں ہی اپنے نام کرواچکا تھا اور اب وہ کامیابی کے ساتھ اس نمبر کو بلاک بھی کرواچکا تھا۔
اسے فاروق ملک کی گفتگو یاد آرہی تھی کہ اس نے اپنے نمبر پر ایسا سسٹم ایکٹیویٹ کر رکھا تھا کہ اس کے نمبر کو بلاک کروانا تو دور کی بات کوئی اس کی کال تک ٹریس نہیں کرسکتا تھا اور اذان کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ نمودار ہوتی چلی گئی۔
وہ کامیابی کے ساتھ اس کی سم بلاک کرواچکا تھا اور اب اپنے پلان کے مطابق وہ صبح سم نکلوا کر فاروق ملک کے دوسرے نمبر پر کال بھی کرنے والا تھا جو یقیناً

فاروق ملک کے لیے ایک بڑی بات تھی وہ صبح اس پر طاری ہونے والی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے لطف لینے لگا۔
تقریباً" آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد اس نے دوبارہ موبائل اٹھایا اور اس پر فاروق ملک کا وہی نمبر ڈائل کرنے لگا جو آدھا گھنٹہ پہلے اس نے بلاک کروایا تھا۔ خودکار آواز سنائی دی۔
"آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں" اور اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ اس نے موبائل رکھا اور کروٹ لے کے لیٹ گیا وہ فاروق ملک کو شکست دینے میں کامیاب ہوچکا تھا اور یہ سوچ کر ہی اسے مزا آرہا تھا۔
وہ اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو یاد کرکے زیر لب مسکرائے جارہا تھا۔ کیسی خوداعتمادی اور کیسا غرور تھا اس کے لہجے میں جیسے ملک کا مطلق العنان حکمران وہی ہو اور اذان نے کتنی آسانی سے اسے چت کردیا تھا۔
اپنی اس کامیابی پر وہ زیادہ خوشی محسوس کررہا تھا۔ کافی دیر تک وہ فاروق ملک کے متعلق سوچتا رہا پھر سر جھٹکتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن پھر اچانک ہی غیر اختیاری سے انداز میں موبائل اٹھا کر اس نے دوبارہ نمبر ڈائل کردیا اگلا لمحہ اس کے لیے شدید حیرت کا باعث ثابت ہوا کیونکہ فاروق ملک کے نمبر پر بیل جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
اس نے جلدی سے ریڈ بٹن پش کرکے کال ڈسکنیکٹ کی اور حیرت سے سوچنے لگا کہ ابھی تو اس نے نمبر بند کروایا ہے اس کی تصدیق بھی وہ کرچکا تھا تو پھر اب اس نمبر پر بیل کیوں جارہی ہے اس نے پریشانی سے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا۔ ایک بج کر چالیس منٹ ہورہے تھے رات کے اس پہر کوئی فرنچائز تو کھل نہیں سکتی کہ تصور کیا جاسکتا کہ فاروق ملک نے ڈپلی کیٹ سم نکلوالی ہوگی لیکن فاروق ملک نے ناممکن نظر آنے والی اس بات کو ممکن بنالیا تھا۔ پہلی مرتبہ اذان کو احساس ہوا کہ بندے کو سیریس لینا چاہیے۔
کچھ دیر پریشانی سے انگلیاں چٹخانے کے بعد اس نے دوبارہ موبائل اٹھالیا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر ہیلپ لائن کا نمبر ڈائل کررہا تھا۔
رابطہ قائم ہونے پر وہ غصیلے انداز میں بولا۔
"کیسی سروس ہے آپ لوگوں کی۔ میری ایک سم گم ہوجاتی ہے میں کال کرکے اور مکمل ویری فکیشن کے بعد اپنی سم بند کرواتا ہوں اور سم بند ہونے کے پندرہ منٹ بعد ہی دوبارہ ایکٹیویٹ ہوجاتی ہے۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔"
"ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا براہ مہربانی جو نمبر بلاک کروایا ہے وہ نمبر کنفرم کردیجیے۔" اذان نے نمبر دوہرایا تو آپریٹر نے نام اور والد کے ساتھ ساتھ ایڈریس اور آئی ڈی کارڈ نمبر دوبارہ سے دریافت کیا۔
اذان کے جواب دینے پر آپریٹر کی معذرت خواہانہ آواز سنائی دی۔
"ہم ایک بار پھر معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو زحمت اٹھانی پڑی نمبر بند ہوجائے گا۔ آپ آدھے گھنٹے بعد چیک کرلیں۔" اذان نے غصے سے کال ڈس کنیکٹ کی اور موبائل ایک جانب اچھال دیا۔
اس نے بیڈ سے اتر کر چپل پہنی اور پھر دائیں سے بائیں چلتے ہوئے اس کے قدم نرم و دبیز قالین کا سینہ کچلنے لگے۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور بار بار اس کی نظریں دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ آدھا گھنٹہ اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں کمرے کے چکر کاٹتے ہوئے گزارا جوں ہی اس کے اندازے کے مطابق آدھے گھنٹے کا وقت گزر گیا اس نے موبائل اٹھا کر فاروق ملک کا نمبر ڈائل کیا۔ سنائی دی جانے والی آواز حسب توقع تھی۔
"آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔"
موبائل دوبارہ بیڈ پر اچھالنے کے بعد وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پندرہ سے بیس منٹ وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا پھر ایک بار پھر اس نے فاروق

ملک کا نمبر ڈائل کیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی نمبر ایکٹو تھا اور بیل دوبارہ جارہی تھی۔

اذان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اب اسے خدشہ پیدا ہو چلا تھا کہ شاید وہ اپنے الفاظ کی لاج نہ رکھ پائے اور صبح سم نکلوانے میں اسے کامیابی نہ ہو۔ اور یہ احساس اذان کی انا پر ضرب لگا رہا تھا۔ اب وہ خاصا پریشان ہو چکا تھا لیکن پریشانی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات بھی تھے اس نے دوبارہ ہیلپ لائن ملائی اور رابطہ قائم ہوتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"انتہائی تھرڈ کلاس کمپنی ہے آپ لوگوں کی مذاق بنایا ہوا ہے آپ نے..... آپ لوگوں کے کچھ رول..... کچھ اصول ہیں یا نہیں؟"

"سوری سر..... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے۔" آپریٹر کی مہذبانہ آواز سن کر اذان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"دیکھیے میں ایک ڈیلی نیوز پیپر کا ڈسٹرکٹ رپورٹر ہوں ایک باعزت شہری ہوں اور میں آپ لوگوں کی کمپنی کے خلاف کمپین چلاؤں گا اور قانونی چارہ جوئی کروں گا غضب خدا کا۔ میری ایک سم ہے جو مجھ سے گم ہو گئی ہے ڈیڑھ سے دو گھنٹے کے دوران میں نے وہ سم دو مرتبہ بند کروائی۔ لیکن ٹھیک پندرہ منٹ بعد سم دوبارہ ایکٹو ہو جاتی ہے۔ آخر یہ تماشا کیا ہے۔ میں اس سم کا مالک ہوں مجھ سے تمام کوائف کی تصدیق ہو جانے کے بعد سم بلاک کی جاتی ہے تو آخر سم دوبارہ ایکٹو کیسے ہو جاتی ہے؟؟"

"میں معذرت خواہ ہوں سر آپ پلیز میرے ساتھ لائن پر رہیے گا میں آپ کے نمبر کی تفصیلات چیک کرتا ہوں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آپریٹر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"انتظار فرمانے کے لیے شکریہ۔ زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن سر افسوس کی بات یہ ہے کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا..... سوائے اس کے کہ میں نمبر دوبارہ سے بلاک کر دوں۔" آپریٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ اور اذان کا پارہ سات آسمان کو چھونے لگا۔

"کیا بے ہودگی ہے یار..... کیا ساری رات یہی کرتا رہوں میں بار بار نمبر بند کرواتا رہوں اور وہ بار بار کھلواتا رہے آخر یہ ہو کیسے رہا ہے۔ کچھ میرے علم میں اضافہ فرمائیں گے آپ؟"

"میں معذرت خواہ ہوں سر آپ ہمیں کال کرتے ہیں۔ میں اذان فیضی بات کر رہا ہوں والد کا نام آئی ڈی کارڈ نمبر اور ایڈریس ویری فیکیشن کے بعد آپ کی درخواست پر ادھر سے نمبر بلاک کر دیا جاتا ہے چند لمحوں کے بعد ہمیں دوبارہ کال موصول ہوتی ہے کہ میں اذان بات کر رہا ہوں۔ آئی ڈی کارڈ ولدیت اور ایڈریس کی ویری فیکیشن بھی فراہم کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ میرا نمبر بلاک ہو گیا ہے براہ مہربانی میرا نمبر ایکٹو کر دیا جائے۔ ہمیں تمام تر کوائف درست بتائے جاتے ہیں تو ہم نمبر ایکٹو کرنے پر مجبور ہیں لہٰذا نمبر دوبارہ ایکٹو کر دیا جاتا ہے۔" آپریٹر ——— ——— کی بات سن کر اذان نے جھلا کر کہا۔

"یار عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ اذان تو میں ہوں..... کوئی دوسرا اذان کہاں سے آ گیا؟"

آپریٹر کی نرم آواز سنائی دی۔

"جی آپ بالکل درست فرما رہے ہیں لیکن ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اذان آپ ہیں یا نمبر ایکٹو کروانے والا۔"

اذان نے جھلا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند لمحے وہ بیٹھا پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا۔ لیکن اس معاملے کا حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے سارے کوائف فاروق ملک تک کیسے پہنچے۔

وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ اس کا شناختی کارڈ نمبر ایڈریس اور دیگر کوائف آخر کس طرح سے ٹریس کر لیے گئے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تین بج رہے تھے۔ باقی ماندہ رات اس نے اسی پریشانی کے عالم میں جاگتے ہوئے گزاری۔ کبھی وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا اور کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ اس کے سم نکلوانے کا معاملہ اسے کٹھنائی میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ عزت کا آ گیا تھا اور اب اسے ہر صورت اپنا کہا پورا کر کے دکھانا تھا۔

جوں ہی دیوار گیر گھڑی پر آٹھ بجے کا وقت نظر آیا وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ منہ پر پانی کے چھپکے مارنے کے بعد وہ بائیک اٹھا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ مطلوبہ کمپنی کی فرنچائز کے سامنے کھڑا تھا آفس کھلنے کا وقت نو بجے کا تھا۔ لیکن وہ آدھا گھنٹہ قبل ہی وہاں آن پہنچا تھا جیسے تیسے اس نے آدھا گھنٹہ انتظار کیا اس کے سامنے ہی گیٹ کھولا گیا اور پھر گلاس ڈور کو اوپن کرتے ہوئے چپراسی نے صفائی کی۔

چند ہی لمحوں کے بعد ایک بائیک آ کر رکی اور اس کی نظر آصف کے چہرے پر پڑی۔ وہ پھرتی سے آگے بڑھا اور آصف سے سلام دعا کرنے کے بعد اس کے ساتھ ہی فرنچائز میں داخل ہو گیا۔

جوں ہی آصف نے سسٹم آن کر کے سیٹ سنبھالی وہ اس کے سر پہ سوار کھڑا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر میں اس نے میدان مار لیا ڈپلی کیٹ سم ایشو کروانے کے بعد وہ فرنچائز سے باہر نکلا اور پھر اس کی بائیک گھر کی جانب واپس اڑی جا رہی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سم موبائل میں ڈال کر آن کی اور اپنی آنر شپ کی تصدیق کے لیے اس نے ایک بلینک میسج سینڈ کیا۔ چند لمحوں کے بعد جوابی میسج موصول ہوا۔ تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا اس کا منتظر تھا۔

جوابی میسج میں موصول ہونے والی تفصیل کے مطابق سم اذان فیضی کے نہیں بلکہ ذکاالدین کے نام تھی۔

اذان ... غیر اختیاری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر اپنی اس بدحواسی کو محسوس کرتے ہوئے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پھر بیٹھ گیا اسے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ صبح تین بجے تک یہ نمبر اس کے نام تھا اور وہ ساری رات میں تین سے چار مرتبہ سم بلاک بھی کروا چکا تھا۔

نو بجے پورے ملک میں فرنچائز کھلنے کا وقت تھا اور اب نو بج کر دس منٹ ہوئے تھے اور ان ہی دس منٹ کے دوران اگر وہ ڈپلیکیٹ سم نکلوانے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا تو دوسری جانب ان ہی دس منٹ کے دوران سم کی آنر شپ ایک مرتبہ پھر تبدیل ہو چکی تھی۔

"بندہ خطرناک ہے بھئی۔" اذان خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو گئی۔ اذان بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد اس کی موٹر سائیکل ایک بار پھر فرنچائز کی جانب اڑی چلی جا رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ آصف کے سامنے کھڑا تھا۔

"ملک صاحب! جس وقت میں نے یہ سم نکلوائی یہ کس کے نام پر تھی۔"

اس نے دریافت کیا۔

آصف نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر گویا ہوا۔

"ظاہر ہے کہ آپ کے نام پر تھی۔ جبھی تو آپ سم نکلوا کر لے گئے اگر کسی اور کے نام ہوتی تو ڈپلیکیٹ سم آپ کو ایکٹو نہیں کی جا سکتی تھی۔"

"لیکن اب یہ سم کسی ذکاالدین کے نام پر ہے۔ اور میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔" اذان کے لہجے میں احتجاج شامل تھا۔

اور اب چونکنے کی باری آصف کی تھی۔

"اوہ یہ کیسے ممکن ہے۔" آصف نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

اور اس کے ساتھ ہی اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کرنے لگیں اور نظریں چند لمحوں تک کمپیوٹر اسکرین پر جمی رہیں۔ پھر وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ پندرہ منٹ پہلے سم

کی آنرشپ تبدیل کی گئی ہے اور ایسا خان پور کی اس فرنچائز سے کیا گیا ہے اگر آپ چاہیں تو فرنچائز کا کوڈ اور ایڈریس آپ کو مہیا کر سکتا ہوں۔"

"جی ضرور ـــ میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔" آصف کی بات سننے کے بعد اذان نے جواب دیا۔

اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد کاغذ کی ایک چٹ اذان کی جیب میں منتقل ہو چکی تھی جس پر اسی موبائل کمپنی کی ایک اور فرنچائز کا کوڈ اور ایڈریس درج تھا جو خان پور میں واقع تھی۔

آصف سے ہاتھ ملانے کے بعد اذان واپس مڑا لیکن دروازے پر پہنچتے ہی اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لہرایا اور وہ پلٹ کر ایک بار پھر کاؤنٹر پر آگیا۔

"یار آصف! کیا مجھے مطلوبہ فرنچائز کے منیجر کا نام اور نمبر مل سکتا ہے؟"

"بالکل مل سکتا ہے یار اذان صاحب! آپ کے لیے تو کرنا ہی پڑے گا۔"

اذان کی بات سن کر آصف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر وہ کمپیوٹر پر مصروف ہو گیا۔

کچھ ساعت انتظار کے بعد اذان کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک اور چٹ نظر آرہی تھی جس پر آصف کی ہینڈ رائٹنگ میں ـــــ فرنچائز منیجر فرحان قریشی اور اس کے نیچے اس کا موبائل نمبر لکھا ہوا صاف نظر آرہا تھا

اذان نے آصف کا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرنچائز سے باہر نکل آیا۔

اب اس کا رخ اپنی دکان کی جانب تھا۔ دکان پر پہنچنے کے بعد اس نے تالے کھول کر شٹر اٹھایا اور پھر کاؤنٹر کے پیچھے سے گھومتے ہوئے اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا۔

سیلنگ فین اور ایگزاسٹ کے بٹن پش کرنے کے بعد چند لمحوں تک وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ریلیکس ہونے کی کوشش کرتا رہا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور جیب سے دونوں پرچیاں نکال کر ان پر نظر دوڑانے لگا۔ پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے فرحان قریشی کا نمبر ڈائل کیا اور موبائل کان سے لگا کر انتظار کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"السلام علیکم" کے جواب میں اذان گویا ہوا۔

"وعلیکم السلام ـــ فرحان قریشی صاحب بات کر رہے ہیں۔"

"جی بول رہا ہوں۔" دوسری جانب سے جواب سنائی دیا۔

"فرحان صاحب! میں اذان فیضی بات کر رہا ہوں اور میں ایک مشہور ڈیلی نیوز پیپر کا ڈسٹرکٹ رپورٹر ہوں۔"

"جی جی فرمائیے اذان صاحب۔" اذان کی بات ختم ہونے پر دوسری جانب سے استفسار کیا گیا تو اذان دوبارہ گویا ہوا۔

"مسٹر فرحان! مسئلہ یہ ہے کہ میرا ایک نمبر جس کا خالی سم ٹیگ میرے پاس موجود ہے۔ نمبر میرے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اب سے چند منٹ پہلے آپ کی فرنچائز سے اس کی آنرشپ تبدیل کی گئی ہے۔ جب سم میرے نام پر ہے تو اس کی ملکیت کو تبدیل کرنا قانوناً جرم ہے اسی طرح تو کوئی بھی شخص کسی کا بھی نمبر ہتھیا سکتا ہے میں خان پور کے ڈسٹرکٹ پولیس افسر سے بات کرنے والا تھا۔ لیکن سوچا کہ پہلے ایک مرتبہ آپ سے بات کر لوں۔ کیا آپ مجھے اس بات کی وضاحت دیں گے کہ ایسا کیوں ہوا کون سے ثبوت کے تحت اور کس بنا پر میرا نمبر کسی اور کے نام پر کیا گیا۔"

"سوری اذان صاحب! اگر ایسا ہوا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں لیکن میرے علم میں یہ بات نہیں ہے۔ آپ ایک منٹ ہولڈ کریں میں لڑکوں سے پوچھتا ہوں کہ ایسا کس نے کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔" چند لمحوں تک کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ شاید فرحان قریشی موبائل وہیں رکھ کر لڑکوں سے پوچھنے گیا تھا۔

کچھ دیر بعد فرحان قریشی کی آواز سنائی دی۔

"اذان صاحب میں تصدیق کر چکا ہوں۔ اولڈ سم کی جگہ پر ڈپلی کیٹ سم ایشو کی گئی ہے۔ جس بندے نے سم نکلوائی ہے پرانی سم اس کے پاس تھی۔ جسے دیکھ کر نئی سم جاری کر دی گئی ہے۔"

"بہت ہی فضول بات کر رہے ہیں آپ تو فرحان قریشی صاحب!"

فرنچائز منیجر کا جواب سننے کے بعد اذان جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میری ایک سم گم ہو جاتی ہے اور گزشتہ رات کے دوران ہی میں چار مرتبہ اس سم کو بلاک کرواتا ہوں لیکن چاروں مرتبہ سم دوبارہ ایکٹو ہو جاتی ہے اور صبح ہوتے ہی نا صرف وہ سم دوبارہ ایشو کر دی جاتی ہے بلکہ اس کی ملکیت بھی تبدیل کر دی جاتی ہے۔ کس قسم کی کمپنی ہے آپ لوگوں کی ـــ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کسی کی سم گر جائے اور اس کا مالک بھلے ہی اسے بند کروا دے وہ جس کسی کو ملے وہ اٹھا کر فرنچائز پہنچ جائے اور اسے دیکھ کر آپ اسے نئی سم ایشو کر دیں' بڑے افسوس کی بات ہے۔ میرا سم بند کروانے کا تو مقصد ہی فوت ہو گیا۔ جس بندے کو یہ سم ملی تھی۔ میری اس سے بات ہوئی تھی میں نے اس سے کہا یہ نمبر میرا ہے آپ اسے ایکٹو نہ رکھیں۔ لیکن اس نے تو عجیب و غریب باتیں کیں اس نے کہا کہ میں ایک دہشت گرد ہوں ـــ میں نے بہت سے قتل کیے ہیں ـــ بہت سے بم بلاسٹ کیے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اب سم کو بھول جاؤ وہ کوئی خطرناک مجرم ہے اور آپ کی فرنچائز سے اسے سم ایشو کی گئی ہے۔ یعنی آپ بھی اس کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔

میں ابھی ڈی پی او سے بات کرتا ہوں اور اگر ضرورت پڑی تو آئی جی سے بھی رابطہ کروں گا۔ اس بندے کو تو میں پکڑ ہی لوں گا۔ لیکن آپ کی فرنچائز پر بھی میں نے تالا نہیں پڑوایا تو میرا نام اذان فیضی نہیں۔" اذان نے غصے کی شدت سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا چند لمحوں تک لائن پر خاموشی چھا گئی۔

"دیکھیے اذان صاحب! آپ اس قدر جذباتی نہ ہوں۔ مسئلہ تو سم کا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں ابھی دوبارہ سے نمبر بند کروا دیتا ہوں۔ آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن آپ دوبارہ سم ایشو کروا لیں اور ـــ"

"کیوں کرواؤں دوبارہ سم ایشو؟ ڈپلیکیٹ سم تو میں نے آج صبح ہی کروائی ہے لیکن پندرہ منٹ بعد ہی دوسری جگہ سے نا صرف ڈپلیکیٹ سم جاری کر دی جاتی ہے بلکہ آنرشپ بھی تبدیل کر دی جاتی ہے۔ آپ مجھے صرف اس بات کا جواب دیں کہ ایسا کیوں ہوا۔" اذان نے تمتماتی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھیے اذان صاحب! ہمارے یہاں سے آنرشپ ضرور تبدیل کی گئی ہے لیکن ڈپلیکیٹ سم جاری نہیں کی گئی اور وہ آدمی جس نے آنرشپ تبدیل کروائی ہے وہ ابھی تک فرنچائز ہی میں موجود ہے۔"

اس کی بات سن کر اذان کی پیشانی پہ شکنوں کا جال نمودار ہو گیا۔

"اوہ ـــ تو وہ موصوف یہیں موجود ہیں۔ کیا آنرشپ تبدیل کرنے کے لیے آپ نے اس سے آئی ڈی کارڈ کی کاپی طلب کی ہے۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس شخص کا نام فاروق ملک ہے اور آپ کے یہاں سے آنرشپ ذکاء الدین کے نام پر کی گئی ہے۔"

"اذان صاحب بچوں نے غلطی ضرور کر دی ہے کہ خالی سم ٹیگ دیکھے بغیر آنرشپ تبدیل کر دی۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ آئی ڈی کارڈ کی کاپی نہ لی گئی ہو کیونکہ کاپی لیے بغیر فرنچائز میں کوئی بھی کارروائی نہیں کی جاتی۔ وہ آدمی یہیں موجود ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس سے آپ کی بات کروا سکتا ہوں۔"

"جی ضرور کروائیں ـــ آخر میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کون سورما ہے جو اس دھڑلے سے کسی اور کی ملکیت پر قبضہ کر رہا ہے۔" فرنچائز منیجر کی طویل گفتگو کے بعد اذان نے مختصر جواب دیا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد اس کی سماعتوں سے ٹکرانے والی آواز اس کے لیے نئی نہ تھی۔ گزشتہ رات ہی تو اس نے اس سے بات کی تھی۔

"کیسے مزاج ہیں مسٹر فاروق ملک!"
"جی دعائیں ہیں آپ کی۔"
اذان کے چبھتے ہوئے طنزیہ سوال کے جواب میں فاروق ملک کی پرسکون آواز سنائی دی۔
"ہاں بھئی فاروق ملک سب سے پہلے تو یہ نوٹ کرلو کہ ابھی رات ہی تم نے مجھے چیلنج کیا تھا۔ بڑے بڑے بلند وبانگ دعوے کررہے تھے تم کہ تمہیں اس ملک کی ایجنسیاں بھی ڈھونڈ نہیں سکتیں۔ تمہارا یہ بھی کہنا تھا کہ میں تمہاری سم نہیں نکلوا سکتا..... اب غور سے سنو، یہ وہی سم ہے جس سے میں بات کررہا ہوں اور جس کے متعلق تمہارا دعوا تھا کہ اسے اور کوئی نہیں نکال سکتا..... دوسری بات یہ کہ رات تم آغا خان ہاسپٹل کراچی میں تھے۔ لیکن آج میں تمہیں خان پور میں ٹریس کرچکا ہوں۔ کون سی شاہراہ پر کون سے چوک پر کس موبائل کمپنی کی فرنچائز میں تم بیٹھے ہو اس کی مکمل تفصیل کاغذ پر لکھی میری نظروں کے سامنے ہے یہ بھی واضح کردوں کہ میں نے تمہارے دیے ہوئے دوسرے نمبر پر کال نہیں کی۔ بلکہ جس جگہ تم موجود ہو وہاں کے سب سے ذمہ دار شخص کے موبائل پر میں اور تم ہم کلام ہیں۔
تمہارے کہنے کے مطابق عمریں گزر گئیں اور ایجنسیاں تمہیں نہیں ڈھونڈ سکیں۔ اب سوچو کہ صرف ایک رات گزری ہے اور میں تمہیں ڈھونڈ چکا ہوں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے چیلنج مت کرنا۔ لیکن تم نے یہ غلطی کی اور اس کے نتیجے میں تم ٹریس ہوچکے ہو۔ میں اگر چاہوں تو جس فرنچائز میں تم موجود ہو۔ یہ ہی لوگ تمہیں پکڑ کر باندھ لیں گے اور پھر تمہیں یہاں سے پولیس ہی لے کے جائے گی اپنی کیفیت پر غور کرو۔ میری اجازت کے بغیر تم اس فرنچائز سے قدم بھی باہر نہیں نکال سکتے..... اپنی شکست کو تسلیم کرو اور یہ بھی تسلیم کرو کہ اذان فیضی تم جیسے دودھ پیتے بچوں کا باپ ہے۔"
اذان خاموش ہوا تو فون لائن پر سکوت چھایا رہا۔ چند لمحوں تک دوسری جانب سے کوئی آواز سنائی نہ دی تو اذان مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔
"بولو بیٹا فاروق ملک! تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا.....؟"
پھر دوسری جانب سے فاروق ملک کی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔
"اے میرے باپ! مان لی شکست میں نے۔ پہلے مسئلہ سم کا ہے نا! لے لے بھائی۔ میں تمہارے حق میں دستبردار ہوتا ہوں اور ان سے کہہ دیتا ہوں کہ یہ سم اسی کی ہے میری نہیں خوش..... بس اب میری جان چھوڑو۔"
فاروق ملک کا یہ انداز اور یہ لہجہ سن کر اذان کے روم روم میں ٹھنڈک اتر گئی۔ جواباً" بلند ہونے والا اس کا قہقہہ بہت ہی جان دار تھا۔ پھر جب وہ بولا تو اب تک ہونے والی تمام تر گفتگو میں پہلی مرتبہ اس کے لہجے میں شگفتگی ہی شگفتگی تھی۔
"چل بیٹا چھوڑ دی تیری جان! تو بھی کیا یاد کرے گا۔ ایشو سم کا نہیں تھا۔ تمہارے بڑبولے پن کا تھا۔ تمہارے بلند وبانگ دعووں کا تھا۔ تم نے شکست تسلیم کرلی اور بہادر دشمن گرے ہوئے شخص پر وار نہیں کرتے۔ اور ہاں ایک آخری بات اور مجھے تمہارے شکست مان لینے پر اتنی خوشی محسوس نہیں ہوئی جتنی خوشی مجھے اس رشتے پر ہوئی ہے جو ابھی تازہ تازہ تم نے مجھ سے جوڑا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ تم ساری زندگی یہ بات یاد رکھو گے کہ اذان فیضی ہر معاملے میں تمہارا باپ ہے۔ گڈ بائے۔"
جملہ مکمل کرنے کے بعد اذان نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد موبائل کاؤنٹر پر ڈالا اور پھر اسی مخصوص ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آگے پیچھے جھولنے لگا۔
اب اس کے چہرے پہ سکون ہی سکون تھا۔ طمانیت ہی طمانیت تھی۔

☼ ☼ ☼

کمرے کی فضا میں ایک خوشگوار سی مہک رچی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے اس کمرے میں اس وقت صرف ایک ہی زینہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جانب دیوار کی جانب لگا صوفہ سیٹ۔ اس کے سامنے رکھی خوب صورت سی گلاس ٹیبل، ریشمی پردے، دبیز قالین، ایک آفس ٹیبل جس کے اوپر مختلف فائلیں کیبنٹ پر سجی ہوئی تھیں۔ ٹیبل کے ایک جانب ایل سی ڈی کمپیوٹر اسکرین رکھی ہوئی نظر آرہی تھی اور ٹیبل کے عقب میں رکھی ہوئی اکلوتی کرسی پر وہ براجمان تھی۔ اس کے لمبے سنہری بال کرسی کی عقبی طرف جھول رہے تھے۔
اس کے گلابی چہرے پر جو تاثرات نظر آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازا بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی نیم وا آنکھیں جو پچھلے کئی لمحوں سے ایک ہی جانب مرکوز تھیں۔ وہ کسی خاص چیز کو احاطے میں لیے ہوئے نہیں تھیں۔ لیکن وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔
خاصی دیر تک وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔ پھر اچانک اس کے انداز میں ایک نمایاں تبدیلی نمودار ہوئی اور وہ چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اب اس کی نظریں حقیقتاً" کسی چیز کا احاطہ کیے ہوئے تھیں اور وہ ایک خوب صورت چہرہ تھا۔ اس کے چونکنے کا سبب دروازہ کھلنے کی آہٹ بنی تھی اور تبھی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
دبلی پتلی، سروقد، خوب صورت لڑکی موٹی موٹی آنکھیں گھنیری پلکیں پتلی صراحی دار گردن اور کمر کے نیچے تک لہراتے ہوئے لمبے بال اس کا ثبوت تھے کہ آنے والی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ نیلم کے چہرے پہ قدرے حیرت کے تاثرات تھے۔ کیونکہ کمرے میں داخل ہونے والی لڑکی اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ لیکن چند ہی لمحات میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اس بات کا اندازا بخوبی لگا چکی تھی کہ نیلم اگر حسن وخوب صورتی کا مرقع ہے تو آنے والی لڑکی خوب صورتی میں اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ لڑکی قریب پہنچی نیلم استقبالیہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
"تشریف رکھیے۔" اور پھر ٹیبل کے پیچھے سے گھوم کر خود بھی باہر نکل آئی۔ لڑکی صوفے پر بیٹھی تو وہ خود بھی اس کے قریب جاکے صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔ پھر استفسارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"جی فرمائیے۔"
لڑکی نے بغور اس کا جائزہ لیا اور پھر پُراعتماد لہجے میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔
"میرا نام ماہم نظامی ہے اور اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ نیلم ہیں؟"
"جی بالکل میں نیلم ہوں۔ کہیے مس ماہم میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟"
نیلم اسی بااعتماد لہجے میں دوبارہ گویا ہوئی۔
"مس نیلم میں کامرس کالج میں پڑھتی ہوں اور بی کام کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"
"گڈ..... یہ تو اچھی بات ہے..... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر فرمائیے میرے پاس کیسے آنا ہوا۔"
"مس نیلم، میں زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اور بہت کچھ کرنے کے لیے عملی زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ بھی حاصل ہو تو سونے پہ سہاگہ ہوتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد یقیناً" مجھے سروس بھی کرنا ہے۔"
"بہت اچھی سوچ ہے آپ کی..... تجربہ ضرور حاصل کرنا چاہیے۔" ماہم کی بات سن کر نیلم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی سوالیہ نگاہیں مستقل ماہم کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ کیونکہ ماہم کی تمہید باندھنے کے باوجود ابھی تک وہ اس کی اپنے پاس آمد کا مقصد نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر بکھری چند شکنیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ اس سلسلے میں قدرے الجھن کا شکار ہے۔
ماہم نے ایک لمحے کے لیے نیلم کی بات سنی اور پھر سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولی۔
"اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں

مس نیلم۔۔۔ میں آپ کی این جی او میں والنٹیری کام کرنا چاہ رہی ہوں اور یہاں کیا ہوا کام یقیناً" میرے لیے آئندہ زندگی میں کار آمد ثابت ہوگا۔"

"موسٹ ویلکم مس ماہم نظامی۔۔۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ یقیناً" آپ ہماری این جی او میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گی۔" ٹھیک اسی وقت کمرے میں ایک مسحور کن موسیقی کی آواز گونجنے لگی۔ ماہم نے چونک کر اپنے پرس کی جانب دیکھا اور پھر زپ کھول کر موبائل باہر نکال لیا۔

موسیقی کی آواز یقیناً" اسی میں سے بلند ہو رہی تھی اور اس کی مدھر تانیں۔ نیلم کو اس کے باذوق ہونے کی اطلاع فراہم کر رہی تھیں۔

اس نے کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اذان میں اس وقت کسی جگہ آئی ہوئی ہوں اور ایک خاتون سے کچھ ضروری گفتگو کر رہی ہوں۔ میں کچھ دیر بعد آپ کو کال کروں؟" پھر چند لمحے دوسری جانب سنائی دی جانے والی آواز سننے کے بعد اس نے کال ڈس کنیکٹ کر کے موبائل دوبارہ پرس میں رکھا اور زپ بند کرتے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اذان فیضی صاحب کی کال تھی۔ میں ان سے شاعری کی اصلاح لیتی ہوں۔" نیلم نے آنکھیں گھماتے ہوئے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھی اطلاع ہے میرے لیے۔۔۔ تو گویا آپ شاعرہ بھی ہیں۔"

"جی بس ایسے ہی تھوڑا بہت لکھ لیتی ہوں۔ یہ تو اذان فیضی صاحب کی مہربانی ہے کہ وہ میرے بے ربط الفاظ کو سیدھا کر کے اسے شاعری کہلانے کے قابل کر دیتے ہیں۔"

نیلم نے بغور ماہم کی آنکھوں میں جھانکا، پھر دریافت کیا۔

"یہ اذان فیضی شاید فیضان فیضی صاحب کے صاحب زادے ہیں۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ بالکل۔" ماہم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ نیلم چند لمحے خاموش رہی، پھر گویا ہوئی۔

"ان کے ایک اور بھائی بھی تو ہیں۔ شاید میرے خیال میں ان کا نام فرزان فیضی ہے۔"

"جی بالکل۔۔۔ آپ نے درست سمجھا۔"

نیلم اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر اپنی ٹیبل کے عقب میں بیٹھتے ہوئے ایک بٹن پش کیا تو دروازے پر بیل کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد چپڑاسی نمودار ہوا تو نیلم نے ماہم کی جانب دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"کولڈ ڈرنک لیں گی یا چائے۔"

ماہم نے ہاتھ میں دبے ٹشو کی مدد سے پیشانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں کولڈ ڈرنک ہی ٹھیک رہے گی۔"

چپڑاسی گردن خم کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ نیلم دوبارہ صوفے پر آ کر بیٹھی۔

چند لمحوں بعد ہی چپڑاسی نے کولڈ ڈرنک لا کر سرو کر دی۔ نیلم نے کولڈ ڈرنک اٹھائی اور اس کے دو، تین سپ لینے کے بعد گویا ہوئی۔

"خاصا نام ہے علاقے میں فیضی صاحب کے گھرانے کا۔ میں اذان صاحب کو تو نہیں جانتی۔ البتہ فرزان فیضی صاحب سے میری ملاقات ہے۔"

ماہم نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور حیرت سے نیلم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں جو استخارہ کرلیا کرے' کبھی شرمندہ نہ ہوگا اور نہ نقصان اٹھائے گا اور استخارہ نیک بختی کی علامت ہے۔

اس کے چاروں اطراف آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور وہ درمیان میں کھڑی ازحد پریشان اور گھبرائی ہوئی بری طرح ہانپ رہی تھی۔

اسے سانس لینے میں بڑی دقت اور دشواری ہو رہی تھی۔ تیزی سے کم ہوتی آکسیجن اور اکھڑتی سانسوں نے لمحوں میں اسے باور کروادیا تھا کہ بہت جلد وہ زندگی جیسی خوب صورت اور انمول نعمت سے ہاتھ دھونے والی ہے۔

وہ مرنا نہیں چاہتی تھی مگر اردگرد بڑھتی گھٹن اس کی سانس کو تیزی سے بند کررہی تھی۔ کھانستے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ لیے۔ کھینچ کھینچ کر سانس لینے کی کوشش بھی اس کی سانسوں کو بحال نہیں کرپارہی تھی۔

"میں' میں مرنا نہیں چاہتی اللہ پاک' پلیز میری مدد کیجیے" وہ لڑکھڑائی اسے لگا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی ہو۔ پھر وہ بری طرح زمین پر آگری' اس کے دوپٹے کو تیزی سے آگ نے پکڑا تھا۔

"اللہ۔۔۔ رحم۔۔۔" وہ چیخی۔ اور اسی پل اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس نے اردگرد دیکھا' وہ اپنے کمرے میں ہی موجود تھی۔ یعنی ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے خواب دیکھا تھا۔ اف۔۔۔ اس نے خوف سے جھرجھری سی لی۔ اسے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے گلاس پانی کا بھرا اور پھر ایک ہی سانس میں پی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جیسے ہی اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے اس نے تشکر بھرا پرسکون سانس ہوا میں خارج کیا اور پھر وضو کرنے کی نیت سے واش روم میں گھس گئی۔ تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ جائے نماز پر ہی بیٹھی مختلف دعائیں پڑھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اس کے پورے جسم میں سوراخ تھے ان گنت چھوٹے چھوٹے بڑے سوراخ جن سے رستے ہوئے خون نے اسے اس قدر نڈھال اور مضمحل کردیا تھا کہ وہ کروٹ تک بدلنے سے قاصر بے زار تھی۔ درد و تسلسل کے اس خوفناک اور اذیت بھرے کھیل سے تو وہ کب کی تھک چکی تھی۔

مگر اس کے باوجود بھی اسے اس کھیل کا حصہ دار بننا تھا دل مانے یا نہ مانے۔ اس کے پورے جسم پر براؤن کلر کا قیمتی کمبل تھا مگر اس کے باوجود وہ جانتی تھی کہ ہر سوراخ سے کیڑے نکل نکل کر آزادانہ حالت میں اس کے پورے جسم پر رینگ رہے ہوں گے۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں موند لیں' بند پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی کنپٹیوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

"جب انسان الجھ جائے تو اسے اپنے اللہ سے مشورہ کرلینا چاہیے" ایک غمگسار ہمدرد آواز اپنے قریب سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"مجھے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری آنکھیں ہیں میں دیکھ سکتی ہوں' میرا دماغ ہے میں اپنے لیے اچھا سوچ سکتی ہوں۔ اللہ نے مجھے پیدا کردیا ہے اتنا ہی کافی ہے اپنا اچھا برا سوچنا میرا فرض ہے۔" دوسری نخوت بھری آواز نے چیرتے ہوئے اس آواز کے تاثر کو غائب کیا تھا۔ وہ بے دردی سے ہونٹ کچلنے لگی۔ اس کے ہونٹ کے کونے سے خون رسنے لگا۔ یکلخت اس کے جسم میں سرسراہٹ بڑھنے لگی۔

اس نے کمبل ایک سائیڈ پر پھینکتے دونوں ہاتھوں کے بڑھے ہوئے لمبے ناخنوں سے اپنے جسم کو کھرچنا شروع کردیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے جسم کو نوچ ڈالتی کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور پھر سرعت سے اس کی طرف بڑھا۔

"یہ۔۔۔ کیا کررہی ہو؟" اس نے تیزی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑا تھا۔

"پاگل ہوگئی ہو کیا۔۔۔ اپنے جسم پر نشان کیوں ڈال رہی ہو؟"

"میرے۔۔۔ جسم کے کیڑے مجھے تنگ کررہے ہیں۔ مجھے خارش کرنی ہے' چھوڑو مجھے خارش کرنے دو۔" وہ اک وحشت بھرے انداز میں اس سے اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔

"تمہارے ڈرامے پھر سے شروع ہوگئے۔" وہ کرخت لہجے میں بولا۔

"تم۔۔۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہے' میرا۔۔۔ جسم" بھیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھتے اس نے اس کی آہنی گرفت سے ہاتھ نکالنے کی کمزور سی کوشش کی۔

"میری بلوری گڑیا۔۔۔ کچھ تو اپنے اس خوب صورت جسم پر رحم کھاؤ۔" پھر وہ اس کے پورے وجود کو گہری نظروں سے گھورتے خباثت سے ہنسا۔

"بہت شوق ہے نا تمہیں خود کو نوچنے کا' تو یہ عمل تم خود کیوں کرتی ہو۔۔۔ میں ہوں نا" پھر وہ اس کے جبڑوں کو سختی سے بھینچتے غرایا۔۔۔

"تیار ہو جاؤ ابھی تھوڑی تک سیم آرہا ہے آج تمہیں اس کے ساتھ جانا ہے۔"

"نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں جاؤں گی میں کسی کے بھی ساتھ' رحم کرو مجھ پر' جلاد انسان مت کرو میرے ساتھ اس طرح' اللہ غارت کرے تمہیں' ڈرو اس ذات کے قہر سے" وہ حلق کے بل چیخی تھی جب وہ مسکرایا۔

"اوکے ڈارلنگ نہیں جانا تو نہ جاؤ۔ میں زبردستی نہیں کرتا مگر پھر۔۔۔" نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبا کر اس نے بات ادھوری چھوڑتے اس کی طرف دیکھا۔ اور آخر ایسا کیا تھا ان نظروں میں کہ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر سسک پڑی۔

☼ ☼ ☼

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ اسٹور جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ وہ اس کی تیاری میں اس کی مدد کررہی تھی۔ جیکٹ پہننے میں اس کی مدد کرنے کے بعد اس نے براؤن کلر کا رومال اس کی طرف بڑھایا تو رومال سمیت ہی اس نے اس کا ہاتھ تھامتے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"آج ناشتا کرنے میں گھر آجاؤں گا۔"

"کیوں۔۔۔"

"فیصل کی جاب جو لگ گئی ہے۔"

"کیا واقعی۔۔۔!!" اسے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔" اسے بانہوں میں بھرتے وہ دلکشی سے مسکرایا۔ توجہ کا خاص اندازا سے کان کی لوؤں تک سرخ کر گیا۔

"پھر آپ ناشتا کرکے جائیے۔" اس کے گریبان کے بٹنوں سے کھیلتے وہ جھکی جھکی پلکوں سے بولی۔

"نہیں یار پھر میں لیٹ ہو جاؤں گا۔" وہ اس کے خوبصورت چہرے پر محبت بھری نظر ڈالتے گویا ہوا۔

"تو پھر میں جاؤں۔" اس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے اس نے اس کا چہرہ ذرا اٹھایا تو اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

"جی۔۔۔" وہ مدھم سی آواز میں بولی۔ اس کی قربت اسی طرح اس کی بولتی بند کردیا کرتی تھی' نادان دل اتنی محبت پر نازاں ہوتا۔

"ناشتا تیار کرکے مجھے فون کردینا میں آجاؤں گا۔" شرم حیا کے اس پیکر کو اس نے فخر سے دیکھا تھا۔

"جی۔۔۔" اس بار اس کی جی پر وہ ہنس دیا تھا۔

"اور اب پلیز ایک بار اوپر دیکھ لو تاکہ میں جاسکوں۔" محبت بھری معصوم التجا پر اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائیں۔۔۔ اور اس کی اس ادا پر وہ نثار ہی تو ہوگیا تھا۔ پھر اس کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کرتے سرشاری سے بولا۔

"اللہ حافظ۔" مرضی سے اس نے اسے خود سے علیحدہ کیا تھا۔

"اللہ حافظ۔۔۔" اس کی چوڑی پشت کو دیکھتے اس نے مختلف دعائیں پڑھتے پھونک ماری تھی۔ پھر اس کے نکلتے ہی کچن کی طرف آگئی اماں جی۔۔۔ نماز ادا کرنے کے بعد حسب معمول باہر تخت پر بیٹھی تسبیح کررہی تھیں۔

"السلام علیکم اماں جی۔" وہ ان کے آگے جھکی۔

انہوں نے دھیمے سے مسکراتے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی یہ عادت انہیں بہت پسند تھی کہ کہ صبح صبح اپنے کمرے سے نکلتے ہی وہ سب سے پہلے انہیں سلام کرتی پھر انہیں ناشتا کرواتی پھر اس کے بعد اپنا اور عظیم کا ناشتا بناتی۔ نجانے کس نیکی کے ثمر کے طور پر انہیں اتنی اچھی بہو ملی تھی وہ تو اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔

☼ ☼ ☼

زونیرا اور نوشین دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ زونی نرم طبیعت کی حساس لڑکی تھی جبکہ نوشی اس کے برعکس تیز مزاج کی تھی۔ زونی نے اگر باپ کا مزاج پایا تھا تو نوشی نے ماں کا۔ زونی کی مذہب سے انتہائی نزدیکی جہاں نوشی کو ایک آنکھ نہ بھاتی وہیں مما کو بھی پسند نہ تھی۔ بہت بار روکنے ٹوکنے کے باوجود بھی زونی نے جب ان کی نہ مانی تو دونوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہاں کبھی کبھی اس کا حلیہ مما کو ضرور برہم کردیتا تھا۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد تو مما کی تنقید مزید بڑھ گئی تھی وہ اکثر اوقات اس کی انسلٹ کرنے سے بھی دریغ نہ کرتیں اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس سے زیادہ نوشی کے قریب ہوتی گئیں۔

اپنی حق تلفی پر زونی کا دل تو ضرور دکھتا تھا مگر اس کا اس نے کبھی مما سے اظہار نہ کیا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اللہ سے اس کی پکی دوستی ہوگئی۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات اللہ سے شیئر کرنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر باہر سے پرسکون ہوتی گئی۔ اب اسے مما کی باتیں بری نہیں لگتی تھیں۔ ویسے بھی عبادت کے پرسکون لمحوں کے بعد مما کی کڑوی کسیلی باتیں کوئی اتنی بری بھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ درگزر کرنا سیکھ گئی تھی اور درگزر کرنے میں ہی اس کی ذات کا سکون پنہاں تھا۔

☼ ☼ ☼

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ اماں جی کو بتا کر اسٹور پر آگیا۔ شروع سے ہی اس کی عادت تھی کہ وہ قرآن پاک کی تلاوت اسٹور میں آنے کے بعد ہی کرتا پھر اماں جی فیصل کے ہاتھ اس کا ناشتا بھیج دیتیں تو وہ یہیں پر ہی ناشتا کرتا۔ اسے یہ اسٹور بہت عزیز تھا یہ ابا کی آخری نشانی تھی۔ پرائیویٹ تعلیم کے ساتھ اس نے اس اسٹور کا کام بھی احسن طریقے سے سنبھالا تھا۔ اس کے ابا نے اسے ساری عمر رزق حلال ہی کھلایا تھا اور وہ خود رزق حلال اور اللہ کی ذات پر یقین رکھنے والا سادہ سی طبیعت کا سادہ سا لڑکا تھا۔ شکل و صورت اس پاک ذات نے کافی اچھی دی تھی مگر اس کے باوجود وہ مغرور نہ تھا۔

کچھ دنوں سے دل کے بدلتے انداز نے اسے کافی پریشان کر چھوڑا تھا۔ یکدم ہی دل کو کوئی بہت اچھا اور اپنا لگنے لگا تھا۔ پہلے پہل تو وہ بہت ڈسٹرب رہا مگر پھر آہستہ آہستہ دل کے آگے سرنگوں کرنا ہی پڑا۔ لیکن پھر دل کے لاکھ مجبور کرنے کے باوجود بھی اپنی شرمیلی، محتاط طبیعت کی وجہ سے اس نے خود پر ایک حد مقرر کرلی اور آج تک وہ اس حد سے تجاوز نہیں کرسکا تھا، یہ بھی سچ تھا کہ جس دن اس دشمن جان کی ایک جھلک نظر آجاتی وہ سارا دن اس کا سرشار سا گزرتا اس کے حسین مکھڑے پر ٹھہرا چند پلوں کا ارتکاز بھی اسے سارا دن مسرور رکھتا۔

اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وائٹ کلر کی بڑی سی گاڑی جیسے ہی اس کے اسٹور کے قریب سے گزری اس کا دھیان بٹنے میں لمحہ لگا۔ بلیک چادر کے ہالے میں سجے اس کے پرنور صاف شفاف بے داغ چہرے نے چند لمحوں کے لیے اسے ہر چیز سے غافل کردیا حتیٰ کہ خود سے بھی۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اس وقفے نے اسے اپنی قید میں اس طرح جکڑا کہ وہ ارد گرد سے بے نیاز ہوگیا۔

گاڑی جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوئی وہ لمحوں میں حواسوں میں لوٹا تھا۔ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ارد گرد دیکھا اور پھر فیصل کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر سٹ پٹا سا گیا۔ لمحوں میں مسکراہٹ سمٹی

تھی۔

"کیا ہوا شہزادے مسکراہٹ کیوں روک لی۔" ناشتے کا ٹفن اس کی طرف بڑھاتے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا جبکہ اس کے ہاتھ سے ٹفن لیتے وہ بے تاثر سے انداز میں بولا۔

"تم نے ناشتا کرلیا؟"

"نہیں تم جانتے ہو کہ ہم اکٹھے ہی ناشتا کرتے ہیں۔" وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"اسے اتنا چاہتے ہو تو کہتے کیوں نہیں۔" وہ دونوں ناشتا شروع کرنے لگے جب وہ ایک بار پھر سے بولا۔

"کسے؟" اس کا انداز اب بھی بے تاثر سا تھا۔ اس کے یوں انجان بننے پر اس نے گھور کر دیکھا۔

"ہم کزن ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست بھی ہیں عظیم، پھر یہ پردہ داری کیوں" اس سے شکوہ کیا۔

"کسی بھی شریف لڑکی کی ذات کو دو نامحرم مردوں کا آپس میں ڈسکس کرنا مناسب نہیں سمجھتا، چاہے اچھے انداز اور اچھے الفاظ میں ہی کیوں نا ہو" وہ سنجیدہ سا گویا ہوا تھا۔ فیصل کیونکہ اسے بچپن سے جانتا تھا اس لیے اس کی احتیاط پسندی سے بخوبی واقف تھا سو آہستہ سے سر اثبات میں ہلا گیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ مگر میں تم سے ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ دوست اور ایک بھائی ہونے کی حیثیت سے تم کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم ان کے گھر ایک بار اپنا پرپوزل ضرور بھیجنا۔۔۔"

"مجھے اور اس کے طبقاتی فرق کے باوجود بھی۔۔۔" وہ تھوڑا تلخ ہوا تھا۔ تلخی صرف اس بات پر تھی کہ اسے اپر کلاس کی لڑکی سے ہی کیوں محبت ہوئی جبکہ فیصل کہہ رہا تھا۔

"ہاں کلاس ڈیفرنس کے باوجود بھی کیونکہ تقدیریں اللہ پاک کے اختیار میں ہیں اور تمہاری قسمت میں کیا ہے تم نہیں جانتے اس لیے تمہیں ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔"

"ہوں۔۔۔" اس نے فقط ہنکارا بھرا تھا۔ جس سے وہ کچھ اخذ نہ کرسکا۔ پھر فیصل نے مزید کوئی بات نہ کی اور دونوں خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

زونی کے لیے صارم کا پرپوزل کیا آیا کہ مما کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ صارم ان کی کزن کا اکلوتا بیٹا تھا جو بیرون ملک رہتی تھی۔ انہوں نے مسرت بھرے احساس میں گھرتے اس سے بات کی تھی مگر پھر اس کے جواب نے انہیں اچھا خاصا تاؤ دلا دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی زونی۔" ابرو اچکاتے انہوں نے اسے بے ساختہ گھورا۔

"میں استخارے کے بغیر آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتی مما اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"تمہیں نہیں لگتا کہ یہ کچھ دقیانوسیت میں آجاتا ہے۔"

"اللہ سے مشورہ مانگنا کب سے دقیانوسیت میں آنے لگا مما۔ یہ میری زندگی کا بہت اہم فیصلہ ہے اور میں اس میں اللہ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں، آپ کو کیا پرابلم نظر آرہی ہے اس میں۔"

"اور اگر تمہیں کسی قسم کا کوئی اشارہ نہ ملا تو۔"

"تو میں پھر کروں گی۔"

"اور اگر پھر نہ ملا تو۔"

"تو میں پھر کرلوں گی۔"

"اور اگر پھر نہ ملا تو۔"

"میرا یقین ہے مما کہ ضرور ملے گا۔ جس نے مجھے پیدا فرمایا جو مجھے ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے اس سے میں اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے پر مشورہ کروں اور وہ مجھے جواب نہ دے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" اس بار اس کا لہجہ کافی مضبوط تھا۔

"اور اگر جواب منفی آیا تو۔" نجانے کس خدشے کے تحت انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

"تو میں صارم سے شادی نہیں کروں گی۔"

"یہ کیا بکواس کررہی ہو۔" وہ غصے سے چیخیں۔

"یہ بکواس نہیں ہے مما یہ میرا یقین ہے اور اللہ کی ذات پر یقین کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔ بات مضبوطی

اور استقامت کی ہے۔" اس کا اطمینان بھرا لہجہ ان کے اندر آگ لگا گیا۔

"زونی تمہاری شادی ہوگی تو صرف صارم سے ہوگی چھوڑو اس استخارے کے چکروں کو۔" وہ برہم سی گویا ہوئیں۔

"میں استخارے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی آپ اسے میری ضد سمجھ لیں۔" اس کا انداز پختہ اور دو ٹوک تھا جب وہ استہزائیہ ہنسی اور پھر طنز سے گویا ہوئیں۔

"ایک اسٹور کیپر کا بھی تمہارے لیے پرپوزل آیا ہے ایسا کرنا لگے ہاتھوں اس کے لیے بھی اپنے اللہ سے مشورہ کرلینا۔"

"جی بہتر۔" ان کی تمسخرانہ نظروں کو نظر انداز کرتے وہ آہستہ سے سر اثبات میں ہلا گئی۔ جبکہ اس کے نارمل انداز نے ان کے اندر تک چنگاریاں بھردی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا بکواس کررہی ہو تم۔" وہ یکلخت غصے سے بھڑکیں۔ انہیں جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ گزرا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مما، آپ اس اسٹور کیپر کو ہاں کہہ دیجیے۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔" انہیں اپنا غصہ کنٹرول کرنا بہت مشکل لگا، یکلخت وہ بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئیں دماغ میں چاروں اطراف سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

"پاگل ہوگئی ہو، اس کی اور اپنی کلاس کا فرق دیکھو کیا وہ تم جیسی حسین و جمیل لڑکی کے قابل ہے۔" ان کے اندر رہ رہ کر اشتعال کے بھنور اٹھ رہے تھے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس پر ہاتھ ہی اٹھا دیتیں جبکہ وہ مطمئن سی کہہ رہی تھی۔

"اللہ بہتر جانتا ہے کون کس قابل ہے۔"

"پاگل لڑکی۔۔۔ دل سے نہیں دماغ سے سوچو۔"

"جب اللہ سے مشورہ کرلیا جائے تو پھر کیا سوچنا۔" اس کا سکون، ان کے اندر کے سکون کو غارت کر گیا۔ وہ اس کے روبرو آتے پھنکاری تھیں۔

"بات بات پہ کیا اللہ اللہ کی رٹ لگائے بیٹھی ہو، اور ویسے بھی یہ فرض نہیں ہے۔" ان کے پارے کا گراف آسمان کو چھونے لگا۔ وہ ہر صورت اسے اس طرح کے عمل سے روکنا چاہ رہی تھیں۔

"واجب تو ہے نا۔۔۔ اور بات ساری عقیدے کی ہے۔ انسان بذات خود کچھ بھی نہیں ہے، اس کی پہچان اس کا مذہب، اس کا ایمان، اور عقیدہ ہے۔ انہیں چیزوں سے بندھ کر تو اللہ کے لیے ہمارے محسوسات ابھرتے ہیں۔ بات یقین کی ہے، اس کی ذات پر یقین کی، ہم جیسا سوچتے ہیں اللہ کو ویسا پاتے ہیں، ہمارا یقین جتنا پختہ ہوگا اللہ کی رحمت اتنی ہی وسیع نظر آنے لگے گی۔ آپ کا ایمان یقین یہ ہے کہ اللہ ہے، اور وہ کسی عمل کے لیے باز پرس کرنے کے لیے زمین پر نہیں آئے گا سو جیسا چاہو عمل کرو، روز محشر دیکھا جائے گا۔ جبکہ آپ کے برعکس میرا ایمان، میرا یقین یہ ہے کہ میرے اٹھتے ہر قدم کے ساتھ اللہ موجود ہے، میرے دل کے دھڑکنے اور آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ اللہ موجود ہے۔ مجھے خوف آتا ہے، اس کی ناراضی سے، ہر برے عمل سے، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اگر وہ چاہے گا تو مجھے نیست نابود کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگائے گا۔" اس کی آنکھیں تیزی سے بھیگی تھیں۔ انہوں نے سر جھٹک کر گھور کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے ذرا متاثر نظر نہیں آرہی تھیں۔

"ہمارے نبیؐ جب کسی بات پر الجھ جایا کرتے تھے تو وہ استخارے کے ذریعے اللہ سے مشورہ کرلیا کرتے تھے۔" مما کے بے تاثر چہرے نے اسے ازحد دکھ پہنچایا تھا۔

"وہ نبیؐ تھے، انہیں نبوت ملی تھی، عام انسان نہیں تھے وہ، سمجھو پاگل لڑکی اس بات کو، کیوں اپنے اچھے مستقبل کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے پر تلی ہو۔"

"بجا فرمایا آپ نے، مگر آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ہم ان کی امت ہیں، اور ہر امت کو اس کے نبی کی

پیروی کرنے کا حکم اللہ پاک نے ہی تو دیا ہے۔" اس کے بہتے آنسوؤں نے اس کے دونوں گالوں کو تیزی سے بھگو دیا۔

"تم، تم پاگل ہوچکی ہو۔" مٹھیاں بھینچتے جھنجلاتے ہوئے انہوں نے خود کو کسی بھی قسم کے انتہائی قدم سے روکا، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ جاکر دو تھپڑ لگائیں جو ان کی بات نہیں سمجھ رہی تھی، اور جس کے پاس اپنی ہر بات کی واضح دلیل موجود تھی۔

"تو پھر یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" یکلخت انہوں نے اپنے اعصابوں کو ڈھیلا چھوڑا۔ وہ اب اس سے مزید بحث نہیں چاہتی تھیں اور ویسے بھی زونی کے لہجے و انداز میں انہیں کسی قسم کی ہلکی سی لچک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ جیسے جیسے اس پر زور ڈالیں گی وہ ویسے ویسے بضد ہوگی اور اس کا ارادہ اور زیادہ مضبوط ہوگا۔

"جی یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"او کے ابویوش میں صارم کے ساتھ نوشین کی شادی کردوں گی، اتنا اچھا لڑکا کھونا بے وقوفی ہے۔"

"لیکن مما وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"کوئی چھوٹی نہیں اٹھارہ سال کی ہونے والی ہے، اور ویسے بھی جب تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر تمہیں بھی میرے کسی فیصلے میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اور ہاں۔" پھر وہ جاتے جاتے پلٹیں "نوشی کو ورغلانے کی کوشش بھی مت کرنا۔" شدید غصے میں اسے تنبیہہ کرتی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"نوشی تم ایک بار استخارہ کرلو۔ یہ تمہاری زندگی کا بہت اہم فیصلہ ہے، اور ویسے بھی ہم نہیں جانتے کہ وہ لوگ کیسے ہیں، ہمارا کہاں ان کے ساتھ کبھی ملنا ملانا رہا ہے۔"

"پلیز زونی۔۔۔ صارم سے شادی پر میں بہت خوش ہوں، ہینڈسم ہے اسمارٹ ہے، گڈ لکنگ ہے، ایجوکیٹڈ ہے اور سب سے بڑی بات اس کے پاس امریکہ کی نیشنیلٹی ہے ایک لڑکی کو اس سے زیادہ کیا چاہیے، اس استخارہ کے چکر میں خود تو تم عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہی ہو اوپر سے چاہتی ہو دوسرے بھی تمہاری بے وقوفی میں تمہارا ساتھ دیں، مجھ سے تم اس بات کی امید ہرگز مت رکھنا، آج کل کون کرتا ہے استخارہ۔" جب وہ مما کا پرتو تھی تو پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اس کی رائے مما سے مختلف ہوتی۔

"مگر نوشی۔۔۔" "پلیز زونی کلوز دس ٹاپک رائیٹ ناؤ۔ تم ایک ہی کافی ہو اس پر یقین کرتے کسی غریب اسٹور کیپر سے شادی کرنے جیسا احمقانہ فیصلہ کرنے والی۔" دو ٹوک الفاظ میں کہتے اس نے اپنی طرف سے بات ختم کردی تھی مگر اس خواب کے بعد وہ کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہوپارہی تھی۔

"چلو نہ کرو۔۔۔ مگر دو رکعت نفل ادا کرکے تم اللہ سے بہتری کی دعا تو کرسکتی ہونا۔"

"سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہے پھر کس بہتری کی بات کررہی ہو۔ میری آنکھیں ہیں میں خود دیکھ سکتی ہوں، دماغ ہے میں اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہوں۔ اللہ نے مجھے پیدا کردیا ہے نا اتنا ہی کافی ہے۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی، جتنا وہ بحث سے بچ رہی تھی اتنی ہی بے وجہ کی بحث میں زونی اسے الجھانے کی کوشش کررہی تھی۔

"نوشی اگر تم اللہ سے اپنے لیے بہتری کی دعا کروگی تو اس میں کیا برا ہے۔" اپنے اندر کے ڈر کو وہ اس سے واضح طور پر شیئر نہ کرسکی لیکن پھر بھی چاہتی تھی کہ اگر یہ رشتہ اس کے حق میں ٹھیک نہیں ہے تو نہ ہو۔

"میرے بہتری کی دعا کرنے سے اگر صارم جیسے مکمل مرد سے مجھے دستبردار ہونا پڑ سکتا ہے تو سوری مجھے اپنی بہتری نہیں بلکہ صارم کا ساتھ چاہیے۔"

"نو۔۔۔شی تم جانتی بھی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" وہ متحیر سی گویا ہوئی۔ اسے یقین کرنے میں خاصی دشواری ہوئی کہ یہ نوشی کہہ رہی ہے۔

"بہت اچھی طرح۔" ۔۔۔ بگڑے موڈ سے کہتے وہ

یکلخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن نوشی۔"

"اُف زونی اُف پرابلم کیا ہے تمہارے ساتھ' پچھلے بیس منٹوں میں تم مسلسل مجھے ٹینشن دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں تمہاری باتوں سے اتفاق نہیں کرتی' تمہاری اپنی سوچ ہے اور میری اپنی سوچ' ضروری نہیں کہ جیسا تم چاہو ویسا ہی ہو' اور مجھے لگتا ہے کہ تم اس ٹاپک کو مزید کھینچنے کے چکر میں ہو اور میں مزید کچھ سننا یا کہنا نہیں چاہتی اس لیے میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔" بگڑے انداز میں کہتے وہ تن فن کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی جبکہ وہ دھندلائی آنکھوں سے کتنی دیر اس کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

☼ ☼

دونوں کی شادی ایک ہی دن ہوئی تھی نوشی شادی کے بعد امریکہ سدھار گئی جبکہ وہ عظیم کے چھوٹے سے گھر میں آ گئی۔ گزرتا ہر دن اس کے اندر آسودگی بھرتا گیا۔ اس کی ساس اس سے بہت محبت کرتی تھیں جبکہ عظیم تو اس کا اتنا خیال رکھتا جیسے وہ کوئی نازک آبگینہ ہو۔ جس کے ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹنے کا خطرہ ہو۔ اپنے اس چھوٹے سے گھر کو اس نے اپنی مرضی سے سجایا اور سنوارا تھا۔ کبھی کبھار اس کی نوشی سے فون پر بات ہو جاتی اور وہ جب چاہتی مما کی طرف چلی جاتی اس معاملے میں اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی مما جو شروع میں عظیم سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں اب دن بہ دن نکھرتے اس کے وجود کو دیکھ کر ان کا بے جا غصہ بھی ختم ہو تا گیا۔

عظیم اس کی سوچ سے بھی زیادہ اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ شادی کے ایک سال بعد ریحان اور پھر فیضان کی پیدائش نے جہاں عظیم کو اس کا مزید دیوانہ کر دیا وہیں اسے بھی بے حد مصروف کر دیا۔ شادی کے چار سال بعد نوشی نے اپنے گھر بیٹی پیدا ہونے کی خبر سنائی وہ بہت خوش تھی' سن کر وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ وہ اتنی مصروف ہوتی گئی کہ نوشی سے رابطہ بھی نہ ہونے کے برابر ہو کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

یہ بیس سال بعد کی بات تھی جب مما کے گھر ان دونوں بہنوں کی ملاقات ہوئی۔ ایک دوسرے کے گلے لگے وہ کتنی دیر روتی رہیں۔

"تم۔۔۔ تمہیں کیا ہوا ہے نوشی؟ کتنی کمزور ہو گئی ہو۔" اس کے کمزور لاغر وجود کو دیکھتے اس نے تشویش سے پوچھا۔ وہ اس سے کئی سال بڑی نظر آ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ دل کی پرابلم میں مبتلا ہو گئی ہوں نا شاید اس لیے تمہیں اتنی کمزور نظر آ رہی ہوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔!!"

"کچھ نہیں چھوڑو تم تم یہ بتاؤ ماشاء اللہ تم تو اور بھی پیاری ہو گئی ہو راز کیا ہے ڈیئر۔" وہ مسکرائی۔۔۔ زونی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ کتنی عجیب لگی تھی اسے اس کی مسکراہٹ۔

"کیا بات ہے نوشی اور کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو' مما کی ڈیتھ پر بھی تم نہیں آئی تھیں۔" وہ پریشان سی گویا ہوئی۔

"میں آنا چاہتی تھی مگر ان دنوں مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا ایک ماہ ہاسپٹل ایڈمٹ رہی۔"

"واٹ۔۔۔؟ اور تم نے مجھے خبر کرنا ضروری خیال نہ کیا۔" اسے حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔

"کیا فائدہ ہوتا تمہیں بتانے کا۔ تم ایسے ہی پریشان ہوتی رہتیں۔" وہ افسردہ سی مسکرائی۔ دکھ بھری زخمی مسکراہٹ زونی کے اندر تک کھب گئی۔

"کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہے' میری بہن' لیکن اگر تم بتانا نہیں چاہتیں تو ایک یہ الگ بات ہے۔" اس نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔

اسی پل رشنا اندر داخل ہوئی۔

"کب سے آپ دونوں بیٹھی ہوئی ہیں' کھانے پینے کا کوئی خیال نہیں ہے آپ کو' میں نے کھانا لگا دیا ہے پلیز آپ دونوں آ جائیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا جب اس نے رشنا کا ہاتھ تھام کر اسے قریب ہی بٹھا لیا۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ بہت خوبصورت ہے تمہاری بیٹی نوشی۔" اس نے اسے ساتھ لگائے محبت سے کہا تو رشنا بے اختیار جھینپ سی گئی۔ جبکہ نوشی دھیرے سے مسکرا دی۔ خالہ بھانجی کی محبت دیکھتے اس کے اندر آسودہ سا احساس ابھرا۔

"اپنی خالہ پر جو گئی ہے۔"

"نہیں یہ تم پر گئی ہے۔"

"میں اب کہاں خوبصورت رہی ہوں' ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی ہوں۔" وہ یاسیت سے بولی۔ پھر رشنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم سب کو اکٹھا کرو کھانے کے لیے ہم بھی بس آ رہے ہیں۔"

"جی مما۔۔۔" وہ تابعداری سے جواب دیتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نوشی۔۔۔" "ہوں۔"

"ایک بات پوچھوں۔"

"ہاں پوچھو۔"

"کیا تم رشنا کو میرے ریحان کی دلہن بناؤ گی۔"

اس نے بہت مان سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے تھے۔ جبکہ اس کی پلکیں لمحوں میں بھیگی تھیں۔

"کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے۔"

"نہیں۔۔۔ مگر"

"مگر کیا۔۔۔" وہ حیران ہوئی۔

"مگر میں اس حوالے سے ایک بار استخارہ ضرور کرنا چاہوں گی۔"

"کیا۔۔۔!!؟" اس کے جواب پر اسے ازحد حیرت ہوئی۔ اور پھر جیسے وہ منجمد سی ہو کر رہ گئی۔ کیا کچھ نہ تھا اس کی آنکھوں میں' دکھ' درد' اذیت' کرب' یقیناً اس کی ماں جائی اس سے اپنا کوئی بہت بڑا دکھ چھپا رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ پوچھا اور آہستہ سے اسے گلے لگاتے بولی۔

"ہاں ضرور مجھے خوشی ہے نوشی کہ تم اس حوالے سے اللہ سے مشورہ کرنا چاہتی ہو۔ میں دیکھوں کہ رشنا سب کو بلا لائی ہے کیا' تم بھی آ جاؤ جلدی سے۔" وہ پریشان ضرور ہوئی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ اس کی بہن ازخود اس سے اپنا درد شیئر کرے۔ اس کے جانے کے بعد اس نے آہستہ سے اپنا سر بیڈ کراؤن سے لگا دیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے تیزی سے بھیگے تھے۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں زونی۔۔۔ اپنے اوپر بیتی کس کس اذیت سے پردہ اٹھاؤں میں' میں کس طرح تمہیں بتاؤں کہ مما نے مجھے کسی انسان نہیں بلکہ کسی دلال کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اور جس نے میری خوبصورتی اور جوانی کی کئی بار بولی لگائی۔ میرا استحصال ہوتا رہا اور میں چپ رہی' صرف اور صرف اپنی بیٹی کی خاطر۔ اپنی بیٹی کو عزت کی زندگی دینے کی خاطر۔ اس نے میرا پاکستان آنا بند کر دیا تو میں نے پھر کبھی پاکستان کا نام نہ لیا۔ وہ مجھے روز اک نئی موت سے روشناس کرواتا رہا اور میں خاموش رہی۔ میں نفسیاتی الجھنوں میں الجھنے لگی' مجھے دورے پڑنے لگے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میرے خوبصورت وجود پر ان گنت سوراخ ہو گئے ہوں جن میں کیڑے ہوں۔ میں تمہیں اپنی پامالی کی داستان کس طرح سناؤں' میں اپنے لٹ جانے اور لٹتے رہنے کو کس طرح تمہارے سامنے بیان کروں' میں یہ نہیں کر سکتی زونی یہ نہیں کر سکتی۔ میں نے رو رو کر اللہ سے معافی مانگی اور اس نے میری سن لی۔ اس نے اس بھیڑیے کو موت کی نیند سلا دیا مجھے چھٹکارا مل گیا۔ میں' میں آزاد ہو گئی۔ اور پھر پہلی فرصت میں ہی اپنے پیارے ملک لوٹ آئی۔ میں نے اپنے فیصلے کو اللہ کے فیصلے پر ترجیح دینا چاہی اور آج میرا وجود مجھے کسی غلاظت سے کم نہیں لگتا۔ میں' میں تمہیں کس منہ سے بتاؤں کہ میں نوشین نہیں بلکہ نوش ہوں ایک کال گرل اور نوشین سے نوش تک کے سفر کی روداد بہت اذیت ناک ہے زونی۔۔۔ کوئی سسک سسک کر مرا ہے اور کوئی سسک سسک کر جیا ہے۔ میں اپنا درد تم سے شیئر ضرور کرتی۔۔۔ مگر اب نہیں' اپنی رشنا کے لیے تو آج تک میں یہ زہر پیتی آئی ہوں' اور اس کے وقار' اس کی خودداری' عزت' نسوانیت کے لیے مجھے چھپانا ہی ہے۔ تم سے' میں' میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کبھی نہیں بتاؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

عافیت کی دس چیزیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عافیت دس باتوں میں ہے۔ پانچ تو دنیا کے لیے مخصوص ہیں اور پانچ آخرت کے لیے وقف ہیں۔ دنیوی عافیت یہ ہے۔ (1) علم' (2) عبادت' (3) رزق حلال' (4) مصیبت پر صبر کرنا' (5) نعمت پر شکر کرنا۔ آخرت کی عافیت یہ ہے۔ (1) ملک الموت کی شفقت و رحمت' (2) منکر نکیر نہ ڈرائیں' (3) بڑی دہشت سے امن ملے' (4) برائیاں مٹادی جائیں اور نیکیاں قبول ہوں' (5) پل صراط پر چمک دار بجلی کی طرح گزر ہو اور جنت میں سلامتی سے داخلہ ہو۔

حمیرہ' کراچی

بالوں سے خوشبو آئے

☆ خوشیاں بھی ساون کے بادلوں کی طرح ہوتی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اور کہاں برس جائیں؟

☆ جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں' منزلیں ان سے دور ہو جایا کرتی ہیں۔

☆ ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اسی طرح ہر ساتھ رہنے والا شخص آپ کا اپنا نہیں ہوتا۔

☆ ہمارے اکثر بولوں پر تقدیر کا لکھا مسکرا رہا ہوتا ہے۔

☆ انسان مایوسی کی انتہا پر پہنچتا ہے تو پھر معجزوں کو آواز دیتا ہے۔

☆ جو تمہیں خوشی کے موقع پر یاد آئے سمجھ لو کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور جو تمہیں غم کی شدت میں یاد آئے تو سمجھ لو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔

☆ دوست کی کوئی بات بری لگے تو خاموش ہو جانا۔ اگر وہ دوست ہے تو سمجھ جائے گا اور اگر نہ سمجھے تو تم سمجھ لینا کہ وہ تمہارا دوست نہیں۔

مریم جیلانی' لاہور

تخت اور تاج کی اہمیت

تیمور اور بجازت میں جنگ ہوئی۔ بجازت بے چارے کی ایک آنکھ تھی وہ جنگ میں شکست کھا گیا اور گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ تیمور نے دیکھ کر ہنس پڑا۔ تو درباریوں نے ڈرتے ڈرتے اس کی وجہ پوچھی تیمور نے کہا۔ "میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ خدا کی نظر میں یہ تخت و تاج اتنی معمولی چیز ہے کہ اس نے کانے سے چھین کر لنگڑے کے حوالے کر دی۔"

فوزیہ ثمر بٹ' گجرات

سیاستداں

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزت طریقہ سے مرنا ایک حادثہ نہیں' ہنر ہے' جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے اور اللہ توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاستدان فن آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں' جنہیں صحیح وقت پر مرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں خواہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو' ایک وقت ضرور آتا ہے' جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مرجائے یا اپنے سیاسی دشمنوں کو رشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرائے تو لوگ سال کے سال نہ سہی' ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھام سے اس کا عرس منایا کریں۔ البتہ دقت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زور بازو پر منحصر ہے اور سعدی رحمتہ اللہ کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنت جانا عقوبت دوزخ کے برابر ہے' پھر اس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے اقتباس)

انتخاب معصومہ' ٹنڈو الہ یار

احساس

شکر ہے
سکھ کی ساری دعائیں
قبول نہیں ہو جاتیں
ورنہ نہ تو کبھی ہم
اپنے آپ کو دیکھ سکیں
نہ سن سکیں
اور نہ کبھی چھو سکیں

(فرحت عباس شاہ)

سدرہ وزیر' خوشاب (چیل)

محتاجی

حضرت جنید بغدادی کے پاس ایک امیر شخص پانچ سو دینار لایا اور آپ کی خدمت میں پیش کیے۔

حضرت جنید بغدادی نے فرمایا۔ "ان دیناروں کے علاوہ تمہارے پاس اور بھی کچھ ہے؟"

اس نے کہا۔ "بہت کچھ ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "بہت کچھ" کے ہوتے ہوئے تجھے "اور کچھ" کی خواہش ہے؟"

اس نے کہا۔ "جی ہاں اگر مل جائے تو کیا کہنے۔"

اس پر حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "تو ان دیناروں کو تو ہی لے جا کیونکہ مجھ سے زیادہ تو ان کا خواہش مند ہے' کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں اور میں اس حالت میں بھی شاکر ہوں۔ تیرے پاس اتنا کچھ ہے اور تجھے اور کی حاجت ہے لہٰذا محتاج تم ہوئے نہ کہ میں۔"

شاہدہ' بورے والا

کرنیں

☆ وقت ہمارے پاس ایسے آتا ہے جیسے کوئی دوست بھیس بدل کر اور تحفے لے کر آتا ہے۔ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو چپ چاپ وہ اپنے تحفوں کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں اپنا ہر دن یہ سمجھ کر گزار دو کہ یہ تمہارا آخری دن ہے۔

☆ علم انسان کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کنول کے پھول کے لیے پانی۔

☆ پانی کی ایک بوند میں نمک' ملا دیا جائے تو وہ آنسو نہیں بن جاتا۔

☆ جو شخص نگاہ کی التجا کو نہ سمجھے اس کے سامنے زبان کو شرمندہ مت کرو۔

☆ اعتماد اس پرندے کی مانند ہے' جو صبح کاذب میں ہی روشنی کے احساس سے چہچہانے لگتا ہے۔

☆ دنیا ہمیشہ اپنی حالت پر قائم رہے گی لیکن اس قفس کے اسیر بدلتے رہیں گے۔ قانون قدرت ہمیشہ کسی جاندار کو قید نہیں رکھتا۔ اللہ کو گناہ گار توبہ کرنے والے کی آواز سے زیادہ محبوب اور کوئی آواز نہیں۔

نوشین اقبال نوشی' گاؤں بدر مرجان

انداز بیان اور

سیاستدان بھی ہمارے معاشرے کے وہ لوگ ہیں' جن سے ہماری ملاقات نہ چاہتے ہوئے بھی ہو جاتی ہے۔ وہ جو روسی افسانہ نگار چیخوف نے ایک افسانے میں اس ملازم کا ذکر کیا تھا کہ جو اپنے "باس" کے سخت بلکہ توہین آمیز رویے سے پریشان تھا۔ ہر رات سونے سے پہلے سوچتا کہ کل اگر "باس" نے بے عزت کیا تو میں گلدان اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں گا لیکن اگلی صبح جب "باس" پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی سے پیش آتا تو ملازم "جی جی جی" کر کے چپ ہو جاتا۔

ہم بھی ہر الیکشن کے رزلٹ کے بعد اور سیاستدان کی بے حسی دیکھتے ہوئے عہد کرتے ہیں کہ اب اگر یہ ووٹ مانگنے آئے گا تو ہم اسے کھری کھری سنائیں گے۔ اس کو اتنا بے عزت کریں گے کہ آئندہ اسے ووٹ مانگنے کی جرات نہ ہوگی مگر جب الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہوتا ہے اور سیاستدان دس بارہ چمچوں کے ساتھ بڑا رحم طلب منہ بنا کر "چوہدری صاحب، چوہدری صاحب" کہتے ہوئے آپ سے بغلگیر ہوتا ہے تو آپ نہ صرف اسے ووٹ دینے کا وعدہ کرلیتے ہیں بلکہ لمبی قطار میں دھوپ میں کھڑے ہو کر ووٹ بھی ڈالتے ہیں، کبھی کبھی شوق ہی شوق میں جیب بھی کٹوا لیتے ہیں۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔

حافظ مظہر محسن کی کتاب "ہلمٹ، لفافہ اور سیاسی آلودگی" سے اقتباس

عابدہ جیلانی۔۔۔ ٹنڈوالہ یار

مینارہ نور

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ اسلام نے اللہ تعالیٰ سے فرمایا۔ "اے اللہ! جنت میں تو میرا ساتھی کس کو بنائے گا۔" اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا۔

"فلاں قصاب کو جو فلاں دکان پر گوشت کاٹ رہا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قصاب کی دکان کو تلاش کر کے اس کے پاس پہنچے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر ایسی کیا خاص بات ہے، جو قصاب جنت میں میرا ساتھی بنے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ صبح سے شام تک گوشت کاٹتا رہا اور لوگوں میں فروخت کرتا رہا۔ آخر کار جب شام ہوئی تو اس نے گوشت کا ایک اچھا سا ٹکڑا لیا اور اسے تھیلی میں ڈال کر چل پڑا۔ آپ بھی ساتھ ہولیے۔ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگا تو آپ بھی اجازت لے کر گھر کے اندر چلے آئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ قصاب نے گوشت کے ٹکڑے کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنائیں اور ان کا سالن پکایا، پھر آٹا گوندھ کر روٹی بھی پکائی۔

کچھ فاصلے پر ایک چارپائی پر ایک بوڑھی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ قصاب نے اس بوڑھی عورت کو ہاتھ کے سہارے سے اٹھایا اور تکیے سے ٹیک لگوا کر بٹھایا۔ اب وہ ایک ایک نوالہ سالن میں ڈبو ڈبو کر اس بوڑھی عورت کو کھلا رہا تھا۔ تھوڑے سے وقفے سے اس نے پانی بھی پلایا۔ تھوڑی دیر بعد اس بوڑھی عورت نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مطلب تھا اب بس۔۔۔ تو قصاب نے اس کو لٹا دیا۔ اس وقت بوڑھی عورت نے زبان سے کچھ کہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میری ماں۔"

آپ نے پوچھا۔ "اس بوڑھی عورت نے تمہیں کھانا کھانے کے بعد کیا کہا؟"

اس شخص نے کہا۔ "یہ ہر روز مجھ کو اسی طرح کہتی ہے کہ اللہ تجھے جنت میں موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی بنائے۔ اب میں کس مقام پر اور موسیٰ علیہ السلام کس مقام پر۔"

قرۃ العین، سرگودھا

قابل دید

کراچی میں نئے آباد ہونے والے ایک صاحب نے یہاں کے ایک پرانے رہنے والے سے کہا۔ "سنا ہے اب کراچی میں کافی کافی عرصے بارش نہیں ہوتی"

"بارش۔۔۔؟" ان صاحب نے حیرت سے دہرایا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "ارے صاحب۔۔۔ کیا بتائیں۔۔۔ ہمارے علاقے میں تو کئی ایسے مینڈک موجود ہیں جن کی عمریں پانچ پانچ سال ہو گئی ہیں لیکن انہیں تیرنا نہیں آیا۔"

شہزادی، کراچی

بشریٰ محمود

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

ساحر لدھیانوی کی غزل

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر بات پہ رونا آیا

ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ان کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

کس لیے جیتے ہیں ہم کس لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے حالات پہ رونا آیا

کون روتا ہے اور کسی کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

سونیا ربانی، کی ڈائری میں تحریر

گلزار کی نظم

ہم آہنگی،

تم سے جب بات نہیں ہوتی کسی دن جانم
ایسے چپ چاپ گزرتا ہے یہ سنسان سا دن

ایک سیدھی سی بڑی لمبی سڑک پر جیسے
ساتھ چلتا ہوا روٹھا ہوا ساتھی کوئی
منہ پھلائے ہوئے ناراض سا، خاموش، اداس
اور جب ملتا ہوں، ہنس پڑتا ہے یہ روٹھا دن
گدگدا کر مجھے کہتا ہے، کہو کیسے ہو؟

ہما، کی ڈائری میں تحریر

بشیر بدر کی غزل

سوچا نہیں اچھا برا دیکھا سنا کچھ بھی نہیں
مانگا خدا سے رات دن تیرے سوا کچھ بھی نہیں

سوچا تجھے، دیکھا تجھے، چاہا تجھے، پوجا تجھے
میری خطا، میری وفا، تیری خطا کچھ بھی نہیں

جس پر ہماری آنکھ نے موتی بچھائے رات بھر
بھیجا وہی کاغذ اسے ہم نے لکھا کچھ بھی نہیں

اک شام کے سائے تلے بیٹھے رہے وہ دیر تک
آنکھوں سے کیں باتیں بہت منہ سے کہا کچھ بھی نہیں

احساس کی خوشبو کہاں، آواز کے جگنو کہاں
خاموش یادوں کے سوا گھر میں رہا کچھ بھی نہیں

دو چار دن کی بات ہے دل خاک میں مل جائے گا
جب آگ پر کاغذ رکھا باقی بچا کچھ بھی نہیں

ثمرین حبیب، کی ڈائری میں تحریر

اعتبار ساجد کی نظم

مت اس خواب کے پیچھے بھاگو،

بھولی لڑکی!
مت اس خواب کے پیچھے بھاگو
پتھر بن کے رہ جاؤ گی

تیز بہت ہے وقت کا دریا
تم بھی اس میں بہہ جاؤ گی
یہ نشتر جیسی رسوائی
بولو، کیسے سہہ پاؤ گی
کیا بچوں جیسی باتوں سے
تم سب کو بہلا سکتی ہو؟
کیا تم اپنے من کی منطق
دنیا کو سمجھا سکتی ہو
خوابوں جیسی باتیں کر کے
کیا تعبیریں پا سکتی ہو؟
جس گھر میں پروان چڑھیں تم
اس کو چھوڑ کر آ سکتی ہو؟
ایسی باتیں ناممکن ہیں
تم اپنی تنہائی میں
ہجر کے گیت ہی گا سکتی ہو

امبر گل، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

جیون،

جیون کھیل نہیں جاناں
آگ اور پانی، پھول اور شبنم، دھرتی اور اس نیل گگن کا
کوئی میل نہیں جاناں!
جیون خواب نہیں جاناں!
ہم کو بھی معلوم ہے لیکن اب اس غم کو سہہ جانے کی
دل میں تاب نہیں جاناں!
جیون روگ نہیں جاناں!
لیکن وہ جو مرہم بن کر ہر اک زخم سلا دیتے ہیں
اب وہ لوگ نہیں جاناں
جیون شام نہیں جاناں!
سورج سے مجبور ہو تم بھی، شاید سمت بدل لینے پر
یہ الزام نہیں جاناں!
جیون آگ نہیں جاناں
اپنی سُندرتا کی لو میں، اپنے آپ ہی جل جاتے ہیں
جن کے بھاگ نہیں جاناں!
جیون ڈھول نہیں جاناں!
تیز ہوا کی آہٹ سن کر، شاخ سے اپنی کٹ جائے
یہ ایسا پھول نہیں جاناں!

مقدس رباب، کی ڈائری میں تحریر
اعتبار ساجد کی غزل

وہ جو دعوے دار ہے شہر میں کہ سبھی کا نبض شناس ہوں
کبھی آ کے مجھ سے تو پوچھتا کہ میں کس کے غم میں اداس ہوں

یہ میری کتاب حیات ہے اسے دل کی آنکھ سے پڑھ ذرا
میں ورق ورق تیرے سامنے تیرے روبرو تیرے پاس ہوں

یہ تیری امید کو کیا ہوا کبھی تو نے غور نہیں کیا
کسی شام تو نے کہا تو تھا تیری ساتھی ہوں تیری آس ہوں

یہ جو شہر فن میں قیام ہے سو تیرے طفیل ہی نام ہے
میرے شعر کیوں نہ گداز ہوں کہ تیرے لبوں کی مٹھاس ہوں

یہ تیرے جدائی کا غم نہیں کہ یہ سلسلے تو ہیں روز کے
تیری ذات اس کا سبب نہیں کئی دن سے یونہی اداس ہوں

کسی اور آنکھ سے دیکھ کر، مجھے ایسے ویسے لقب نہ دے
تیرا اعتبار ہوں جان من نہ گمان ہوں نہ قیاس ہوں

شمع حسام، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

جسم تڑپا ہے خاک پر تنہا
روح کرتی رہی سفر تنہا

نیند والوں کو کیا خبر اس کی
کون جاگا ہے رات بھر تنہا

لوگ سوئے تھے بند کمروں میں
چاند بھٹکا ہے در بدر تنہا

ساتھ دیتا ہے کون منزل تک
ساتھ چلتی ہے رہگزر تنہا

شہر کا شہر بجھتا جاتا ہے
جا رہا تھا وہ اپنے گھر تنہا

اے غم زندگی کی رات کے چاند
ڈھونڈ مجھ کو نگر نگر تنہا

شگفتہ سلیمان

شہلا ———— کراچی
شہر وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

زبیدہ ریاض ———— کراچی
نظر آتے نہیں شعلے کسی کو
میں جلتے شہر کا اٹھتا دھواں ہوں

نازش ریحان ———— لندن
وہ آملا تو فاصلے گھٹتے چلے گئے
بچھڑے تو سارے راستے سنسان کر گیا
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ندا، فضہ ———— فیصل آباد
پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

نمرہ، اقرا ———— کراچی
اس قدر ہیں حادثوں کی یورشیں
شہر سارا پاگلوں کا ہو گیا

صائمہ جبیں ———— کے ڈی اے
مجال کس کی تھی آنکھیں ملا کے بات کرے
دلوں کے شہر پر اس کی حکومت ایسی تھی

صائمہ امتیاز ساہی ———— لاہور
سُر میں پھر بھی ڈھول میں تاشوں میں بٹ گئے
ہم جیسے لوگ کھیل تماشوں میں بٹ گئے
پھولوں سے چوٹ کھائی تو پتھر بنے
پتھر بنے تو سنگ تراشوں میں بٹ گئے

سائرہ ———— لاہور
وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

فوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات
وہ فاصلہ تھا دعا اور مستجابی میں
کہ دھوپ مانگنے جاتے تو ابر آ جاتا
وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

نادیہ ———— گجرات
ہم نے تمہارے بعد نہ رکھی کسی سے آس
اک تجربہ بہت تھا بڑا کام آ گیا

خدیجہ سلیم ———— کراچی
محبت کے سپنے دکھاتے بہت ہیں
وہ راتوں کو ہم کو جگاتے بہت ہیں
میں آنکھوں میں کاجل لگاؤں تو کیسے
ان آنکھوں کو لوگ رلاتے بہت ہیں

شائستہ نوشین ———— قصور
بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترک محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

مہذب ———— قصور
چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

عائشہ ———— گوجرہ
مانا کہ ہم ہیں اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ویران تم بھی ہو

آسیہ جاوید ———— علی پور چٹھہ
اس شہر غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی، کوئی ہنستا دکھائی دے

سدرہ عرفان ———— شریف آباد

اس کے جلتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مریم شہباز ———— کراچی

وہ پرندہ جسے پرواز کی فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا ہے تو دیوار پہ آ بیٹھا ہے

کرن، بینش ———— فیصل آباد

پھر اس کے جلتے ہی یہ دل سنسان ہو کے رہ گیا
اچھا بھلا اک شہر تھا، ویران ہو کے رہ گیا

شگفتہ ناہید ———— کراچی

ہم کو آپس میں محبت نہیں کرنے دیتے
اک یہی عیب ہے اس شہر کے داناؤں میں

فرزانہ رشید ———— ڈیفنس

پھرتے ہیں مثل موج ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

تحریم ———— گوجرہ

پھر بھی سپنے لکھ رہا ہوں دھوپ کی دیوار پر
مانتا ہوں رائیگاں، سب رائیگاں ہو جائے گا

نادیہ امین ———— دہاڑی

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پہ ہے مہرباں
دیوار کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

افشاں شاہد ———— حیدر آباد

ابھی کچھ اور کڑی دھوپ میں جلنا ہوگا
ربط اتنا نہ بڑھا سایۂ دیوار کے ساتھ

عظمیٰ ———— کراچی

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چپ ہے

بشریٰ انیس ———— کراچی

آ کے تیرے منتظر ہیں آج بھی دیوار و در
گونجتا ہے گھر میں سناٹا صداؤں کی طرح

رضوانہ فیصل ———— سرگودھا

جو شخص حلقۂ دیوار و در میں رہتا ہے
اسے بھی وہم ہے وہ اپنے گھر میں رہتا ہے

زیب یوسف ———— ڈالمیہ

خود سے بھی توڑ چکا ہوں میں تعلق اپنا
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں

زاہدہ علیم ———— کراچی

انا کی جنگ میں ہم جیت تو گئے محسن
پر اس کے بعد بہت دیر تک نڈھال رہے

توبیہ ———— پسرور

کتنے مجبور ہیں ہم اپنی انا کے ہاتھوں
کہ ریزہ ریزہ ہوئے اور بکھرتے بھی نہیں

روزینہ سلیم ———— کراچی

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اٹھ کے بند میری ہر کتاب کر دے گا

منیبہ ———— اوکاڑہ

اس کی خواہش ہے کہ آنگن میں اتارے سورج
بھول بیٹھا ہے کہ خود موم کا گھر رکھتا ہے

شمع مسکان ———— جام پور

اجڑی بستی کا حال دیکھ کر
یادیں بھی اڑان بھرنے لگیں

رخشی ———— اسلام آباد

کمال اس نے کیا اور میں نے حد کر دی
کہ خود بدل گیا اس کی نظر بدلنے تک

صدف عمران ———— کراچی

روٹھا تو شہر خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرا کے تازہ شرارت بھی کر گیا
محسن یہ دل کہ جس سے بچھڑتا نہ تھا کبھی
آج اس کو بھولنے کی جسارت بھی کر گیا

☼ ☼

آسانی

دو شکاری ایک بارہ سنگھے کو شکار کرنے کے بعد اسے دم سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔
ایک اور شکاری نے انہیں دیکھا تو مشورہ دیا۔
اگر تم اسے دم کی بجائے سینگوں سے پکڑ کر کھینچو تو بہت آسانی رہے گی، سینگ جھاڑیوں میں نہیں پھنسیں گے۔"
انہوں نے اس مشورے پر عمل کیا۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک شکاری بولا۔ "اس طرح تو واقعی بہت آسانی ہو گئی...... بہت کم طاقت لگانی پڑ رہی ہے۔"
دوسرا شکاری بولا۔ "وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب ہم اس طرف جا رہے ہیں جدھر سے آئے تھے۔"

رعنا سہیل، کراچی

قابل دید

ایک چیف کانسٹیبل ماہر حیوانیات بھی تھے۔ ایک دن ان کے گھر فون آیا جو ان کی بیوی نے ریسیو کیا۔ ایک صاحب نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ڈاکٹر صاحب کا گھر یہی ہے؟"
"جی ہاں! آپ کو جانوروں کے ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی مدد درکار ہے یا بطور پولیس آفیسر......؟" ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے پوچھا۔ "دونوں حیثیتوں سے......!" جواب ملا۔
"ہمارا کتا منہ نہیں کھول رہا ہے کیونکہ اس کے منہ میں ایک ڈاکو کی ٹانگ ہے۔"

فاطمہ عاصم...... چکوال

تفتیش

ایک بوکھلائے ہوئے شخص نے پولیس اسٹیشن فون کر کے ایس ایچ او کو بتایا کہ اندھیرے لان میں کسی حملہ آور نے اس کے ماتھے پر ڈنڈا رسید کیا ہے۔
ایس ایچ او نے فوراً" کانسٹیبل کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ کچھ دیر بعد کانسٹیبل ماتھے پر گومڑا لیے ہوئے واپس آیا اور ایس ایچ او سے کہنے لگا۔ "میں نے گتھی سلجھالی ہے سر!"
ایس ایچ او بولا۔ "شاباش! مگر تم نے یہ کام اتنی جلدی کیسے کر لیا؟"
کانسٹیبل کہنے لگا۔ "محض اتفاق سے...... ہوا یہ کہ اندھیرے میں میرا پاؤں بھی اسی پھاؤڑے پر پڑ گیا تھا۔"

نوشین سلیم...... بٹل ہزارہ

پسند کی شادی

ایک لڑکی نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے روتے ہوئے اپنی ماں کو بتایا کہ اس کا شوہر شراب کا عادی ہے۔
ماں بولی۔ "پھر تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "ممی مجھے پتا ہی کب تھا کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا جب وہ ایک رات پیے بغیر گھر واپس آئے۔"

فرزانہ آصف، بھکر

باعث اطمینان

بحری جہاز تباہ ہو گیا۔ ایک نوجوان مرد اور لڑکی تیر کر ایک ویران جزیرے پر جا پہنچے۔ چند گھنٹے بعد نوجوان نے لڑکی کے سامنے تجویز پیش کی۔ "ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔"

"لیکن یہاں کوئی نکاح خواں نہیں ہے۔ ہماری شادی غیر قانونی اور ناجائز ہو گی۔" لڑکی ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔" نوجوان بولا۔ "یہاں کون سا کوئی پولیس والا موجود ہے۔"

شبانہ ریاض، راولپنڈی

ازراہ کرم

ایک امریکی نے اپنی بیوی کی بے وفائی کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے ایک سراغ رساں سے رجوع کیا۔ سراغ رساں نے اس کی بیوی اور اس کے آشنا کی کچھ تصویریں کھینچ کر بطور ثبوت لا کر اسے دے دیں۔ امریکی نے دوسرے روز وہ تصویریں آشنا کے سامنے رکھتے ہوئے غصے سے غرا کر کہا۔ "یہ دیکھو.... اس تصویر میں تم میری بیوی کے گلے میں باہیں ڈالے بیٹھے ہو.... اس تصویر میں تم میری بیوی کے ساتھ بیٹھے پی رہے ہو.... اس میں تم میری بیوی کے ساتھ کسی ہوٹل کے کمرے میں ہو.... تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

آشنا نے تصویریں اٹھا کر دیکھیں، مطمئن انداز میں سر ہلایا پھر ایک تصویر الگ کرتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے.... یہ میں لے لوں گا، مجھے اس کے پندرہ پرنٹ نکلوا دو...."

ہما یونس.... نارتھ کراچی

احمق

اسکاٹ لینڈ کا ایک نوجوان لندن کی سیر کو گیا۔ واپسی پر اس کے دوستوں نے پوچھا۔ "سینڈی سناؤ لندن پسند آیا۔"

"ویسے تو اچھا شہر ہے۔" سینڈی نے جواب دیا۔ "لیکن وہاں کے لوگ بہت احمق ہیں۔"

"وہ کیسے؟" دوستوں نے پوچھا۔

"ایک رات کی بات ہے۔" سینڈی بولا۔ "دو بجے کی بات ہو گی، کسی شخص نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دینی شروع کی۔ وہ چلا رہا تھا اور سخت غصے میں تھا۔ دیکھو نا! کتنی مضحکہ خیز بات ہے، رات کے دو بجے دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" ایک دوست نے پوچھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا.... بس اپنا باجا بجاتا رہا۔"

نجمہ حفیظ، ملتان

صحیح طریقہ

ایک صاحب نے شادی کے خلاف ایک کتاب لکھی، اس میں انہوں نے ثابت کیا کہ یہ اس دور کی سب سے بڑی لعنت ہے، ان کے ایک دوست نے ان سے پوچھا۔ "اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

اس نے کہا۔ "کتاب خوب بکے گی اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہو گی، اس سے میں شادی کر لوں گا۔"

روبینہ ناز.... کراچی

سوا سیر

ایک صاحب کے کرایہ دار نے مہینوں سے کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ مالک مکان تمام حربے استعمال کر چکا تھا مگر کرایہ دار سے واجبات وصول کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اپنی دانست میں وہ ایک قابل قبول سمجھوتا لے کر کرایہ دار کے پاس پہنچا اور بولا۔

"اگر اتنی زیادہ رقم دینا تمہارے لیے مشکل ہو تو ایسا کرتے ہیں کہ میں کرائے کی کل رقم میں سے آدھی رقم بھول جاتا ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے!" کرایہ دار نے خوش دلی سے کہا۔ "آدھی رقم آپ بھول جائیں، باقی آدھی رقم میں بھول جاتا ہوں۔"

ثروت رحمن.... جھنگ صدر

حسن و صحت

ادارہ

نرم، ملائم و چمکدار بال

کیا آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے گیسو تادیر چمکدار اور طاقتور رہیں؟ مہکتے، نرم و ملائم اور چمکدار بال کس کی خواہش نہیں ہوتے! آپ کے بال آپ کے حسب منشا خوب صورت، چمکدار اور نرم و ملائم ہو سکتے ہیں اس کے لیے آپ کو متواتر شیمپو استعمال کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں چند ایسی گھریلو تراکیب بتا رہے ہیں جن کے لیے آپ کو بہت کچھ اپنے باورچی خانے میں سے ہی مل سکتا ہے۔ یہ نسخے آزمودہ ہیں لہٰذا اگر آپ ان پر درست طریقے پر عمل کریں گی تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نتیجہ آپ کے حسب منشا نہ نکلے!

یوکلپٹس

یوکلپٹس کی ایک بڑی شاخ کو اچھی طرح کوٹ کر باریک کر لیں اور دو کپ پانی میں ابال لیں، اس کے بعد ریفریجریٹر میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب جب آپ اپنے بال دھونے لگیں تو اسے آخر میں استعمال کریں، اس کی وجہ سے آپ کے بال مہک اٹھیں گے اور چمکدار ہو جائیں گے، اس کے ساتھ ساتھ آپ کے بال چکنے ہونے سے محفوظ رہیں گے۔

لیموں

ایک کپ پانی میں آدھے لیموں کا عرق ڈال دیں، اب اپنے روکھے بالوں میں لگائیں، تین منٹ تک لگا رہنے دیں اس کے بعد دھو ڈالیں، اسے آپ ہر طرح کے بالوں میں استعمال کر سکتی ہیں۔

کھیرا

ایک کھیرے کو اچھی طرح پیس لیں، یہاں تک کہ یہ پیسٹ کی صورت اختیار کر لے۔ تیمپو کرنے کے بعد اپنے بالوں میں اچھی طرح لگائیں اور دس منٹ تک کے لیے چھوڑ دیں، اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں، یہ آپ کے سر میں موجود خلیوں کو فعال کر دے گا جس کی وجہ سے آپ کے بال جلدی چکنے نہیں ہوں گے۔

پتے

ایک چائے کا چمچہ میتھی، ایک چمچہ چائے کی پتی، آدھے لیموں کا عرق اور ایک کپ پانی لے کر اس کا آمیزہ بنا لیں۔ اسے دس منٹ تک ابالیں اور چھان لیں، اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر لیں۔ اپنے روکھے اور بے جان بالوں میں اسے لگائیں، خاص طور پر شیمپو کرنے کے بعد لگانے سے آپ کے بال چمکدار اور نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

دھنیا

یہ بالوں کی خشکی کے لیے بہترین ہے۔ چار چمچے دھنیا دو کپ پانی میں ڈال کر اچھی طرح ابالیں، اس کے بعد چھان کر ٹھنڈا کر لیں۔ شیمپو لگانے کے بعد ایک کپ بالوں میں ڈال دیں۔ اس بات کا اچھی طرح اندازہ کر لیں کہ یہ آمیزہ آپ کے سر میں اچھی طرح لگ گیا ہے۔ اسے مساج کر کے جذب کریں۔ دھنیا آپ کے بالوں سے خشکی کا خاتمہ کر دے گا۔

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

ایرانی کوفتہ

ضروری اشیاء:

قیمہ دھو کر خشک کر لیں — 1 کلو
نمک — حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر — 1/2 چائے کا چمچہ
سفید مرچ پاؤڈر — 1/2 چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ — 1 چائے کا چمچہ
انڈا سفیدی الگ کر لیں — 1 عدد
بادام چوپ کر لیں — 2 کھانے کے چمچے
پستہ چوپ کر لیں — 2 کھانے کے چمچے
کشمش چوپ کر لیں — 2 کھانے کے چمچے
کاٹیج چیز چوپ کر لیں — 2 کھانے کے چمچے
چیڈر چیز چوپ کر لیں — 2 کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا — 2 کھانے کے چمچے
تیل — 1/4 کپ
پیاز براؤن کر لیں — 2 عدد
لہسن چوپ کی ہوئی — 1 چائے کا چمچہ
دہی — 1 کپ
نمک — حسب ذائقہ
ہری مرچ چوپ کی ہوئی — 1 چائے کا چمچہ

ترکیب:

قیمے میں نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، سفید مرچ پاؤڈر، لہسن پیسٹ، انڈا، بادام، پستہ، کشمش، کاٹیج چیز، چیڈر چیز اور ہری مرچ شامل کر کے نم ہاتھوں سے کوفتے بنا کر ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں اس میں چوپ کیا ہوا لہسن ڈال کر چمچہ چلائیں اس کے بعد اس میں دہی، براؤن کی ہوئی پیاز اور نمک ڈال کر مسالا بھوننے تک فرائی کریں۔ 1/2 کپ پانی ڈالیں اور تیار کیے ہوئے کوفتے ڈال کر ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر 30-25 منٹ تک پکائیں۔ مزے دار ایرانی کوفتہ تیار ہیں۔ سرونگ ڈش میں نکالیں، بادام، لیموں اور شملہ مرچ سے گارنش کر کے سرو کریں۔

انڈے کے پکوڑے

ضروری اشیاء:

انڈے (ابال لیں) — 2 عدد
بیسن — 3 کھانے کے چمچے
کھانے کا سوڈا — 1 چٹکی
تیل (تلنے کے لیے) — حسب ضرورت
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) — 1 کھانے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
ثابت زیرہ — 1/2 چائے کا چمچہ

ترکیب:

ابلے ہوئے انڈوں کے چھلکے اتار لیں اور ہر انڈے کے چار ٹکڑے کاٹ لیں۔ بیسن میں زیرہ، کھانے کا سوڈا اور نمک ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور تھوڑا

پانی ملا کر آمیزہ تیار کریں۔ چوپ کیا ہوا ہرا دھنیا ڈالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر لیں۔ ہر انڈے کے ٹکڑے کو بیسن میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کر لیں اور جب سنہرے ہو جائیں تو نکال کر اخبار پر پھیلا لیں تاکہ اضافی تیل نکل جائے۔ مزے دار انڈے کے پکوڑے تیار ہیں سرونگ پلیٹ میں نکالیں۔ املی اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

اسٹرابیری پارفے

ضروری اشیاء:

اسٹرابیری (چوپ کر لیں) — 1 کپ
کریم — 1 کپ
چینی (پیس لیں) — 4 کھانے کے چمچے
گولڈن سیرپ — 2 کھانے کے چمچے
انڈا (سفیدی الگ کر لیں) — 1 عدد
اسٹرابیری جیلی — 1 عدد

ترکیب:

جیلی کو تیار کر کے ٹھنڈا کر لیں۔ ایک پیالے میں انڈے کی سفیدی ڈال کر اسے بیٹر سے خوب گاڑھا ہونے تک پھینٹیں اس میں تیار کی ہوئی اسٹرابیری جیلی چینی، گولڈن سیرپ اور کریم شامل کر دیں۔ آخر میں چوپ کی ہوئی اسٹرابیری ڈال کر مکس کریں۔ فریج میں رکھ کر خوب ٹھنڈا کریں۔ سرونگ گلاس میں نکالیں مزے دار اسٹرابیری پارفے تیار ہے۔ اسٹرابیری سے گارنش کر کے سرو کریں۔

اسٹرابیری پلین کیک

ضروری اشیاء:

دودھ — 1/2 لیٹر
میدہ — 250 گرام
انڈے — 3 عدد
شکر — 2 کھانے کے چمچے
نمک — حسب ذائقہ
مکھن — 4 کھانے کے چمچے

فلنگ کے لیے:

دودھ — 1/2 لیٹر
انڈے (سفیدی اور زردی الگ کر لیں) — 4 عدد
شکر — 125 گرام
سوجی — 5 کھانے کے چمچے
اسٹرابیری (سلائس کاٹ لیں) — 7-6 عدد
اسٹرابیری جیم — 2 کھانے کے چمچے

ترکیب:

میدے اور نمک کو چھان کر ایک پیالے میں ڈالیں اس میں شکر اور انڈے ڈال کر بیٹر سے خوب پھینٹیں اس کے بعد اس میں دودھ ڈالتے ہوئے مسلسل پھینٹتے رہیں آمیزے کے گاڑھی کریم کی طرح ہو جانے کے بعد پھینٹنا بند کر دیں۔

فلنگ کے لیے:

ایک سوس پین میں دودھ گرم کریں اس میں انڈے کی زردی پھینٹ کر ڈالیں۔ شکر اور سوجی ڈال کر چمچہ چلائیں آمیزہ جب گاڑھا ہونے لگے تو اس میں اسٹرابیری جیم ڈال کر چمچہ چلائیں اس کے بعد سوس پین کو چولہے سے ہٹا کر اس میں سلائس کی ہوئی اسٹرابیری شامل کریں۔ ایک نان اسٹک توے پر تھوڑا سا مکھن ڈال کر گرم کریں اور اس کے اوپر میدے اور دودھ کا تیار کیا ہوا آمیزہ ڈال کر روٹی کی طرح پھیلا دیں اور دونوں سائڈوں سے گولڈن ہونے کے بعد اس کو توے سے ہٹا لیں اسی طرح میدے کے سارے آمیزے کی روٹیاں بنا لیں۔ تیار کی ہوئی فلنگ کو اس میں رکھ کر رول بنا لیں۔ مزے دار اسٹرابیری پین کیک تیار ہیں اسٹرابیری جیم اور سلائس کی ہوئی اسٹرابیریز سے گارنش کر کے سرو کریں۔

☆ ☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شاہدہ اعجاز..... حیدر آباد

س بھیا ذوقی! کیا وجہ ہے کہ شرم سے پانی پانی ہو جانے کے باوجود انسان کے کپڑے گیلے نہیں ہوتے ہیں؟

ج چونکہ پانی خود شرمندہ ہوتا ہے اس لیے کپڑے گیلے نہیں کرتا آخر اس کی بھی تو کوئی عزت ہوتی ہے۔

یاسمین روحی..... راولپنڈی

س
میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے کیوں؟

ج پورے ملک میں سردی بڑھ گئی ہے اس لیے۔

س سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے؟ کبھی تو بھیا ان لفظوں پر غور کرلیا کریں؟

ج بہت کیا بہت کیا پر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

شہلا تمکین..... ڈیرہ اسماعیل خان

س اگر ہمارے نام نہ ہوتے تو ہم ایک دوسرے کو کیسے بلاتے؟

ج اے بھائی' اے بہن' اے ابا' اے اماں وغیرہ وغیرہ۔

فاطمہ مرتضیٰ ابڑو..... ٹنڈو جام

س نین بھیا! ہم نے سنا ہے کہ آپ کئی بھوتوں کے مالک ہیں۔ ایک عدد بھوت کی ضرورت ہے معقول معاوضہ بھی ملے گا۔ جلد از جلد ایک بھوت روانہ کر دیں؟

ج میں مصروف ہوں اس لیے نہ بھیج سکتا ہوں' نہ ہی آسکتا ہوں۔

تابندہ صدیقی..... اسلام آباد

س ۔
راس آتی نہیں تنہائی بھی
اور ہر شخص سے بے زار بھی ہیں
بتاؤ کیا کروں؟

ج بس ہماری طرح خوش رہو۔

زیبا عرفان' بیلا عرفان..... کراچی

س پاگل انسانوں میں سب سے بڑی خوبی کیا ہوتی ہے؟

ج جو کہتا ہے سچ کہتا ہے' سچ کے سوا کچھ نہیں کہتا۔

الماس اوپل..... گوجرانوالہ

س ذوالقرنین! تمہارے اس نام کے اتنے بخیے ادھڑ چکے ہیں کہ مزید' بخیے ادھیڑنا ناممکن ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اب تو کوئی نیا نام رکھ لو؟

ج تجویز کر کے بھیج دو۔

عذرا قریشی..... دریا خان

س جیب خالی ہو تو آپ کو کیا خیال آتا ہے؟

ج پتلون مانگے کی ہے۔

س آپ کی زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ؟

ج آپ بھی انتظار کریں میری طرح۔

امتیاز کوثر..... گوجرہ

س سنا ہے آپ روتے بہت ہیں؟

ج جی نہیں غلط سنا ہے۔ بس سوتے بہت ہیں۔

س افواہ کب اور کیسے خوب صورت لگتی ہے؟

ج جب شادی شدہ مرد کو پتا چلے کہ اس سے کوئی شادی کرنا چاہتا ہے۔

س کیا آپ نے کبھی رشوت لی ہے؟

ج یہ کیا ہوتی ہے۔

نازیہ حسین..... راولپنڈی

س نصیحت کس وقت ناگوار گزرتی ہے؟

ج جب والد صاحب یہ نصیحت کریں کہ بیوی کی کم سنا کرو۔

نسیم اعوان..... وادی سون کفری

س ذوالقرنین جی! رخصتی کے وقت دلہن کی سہیلیاں اسے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کرتی ہیں' دولہا کے دوست اس وقت کیا کرتے ہیں؟

ج کھانا کھاتے ہوئے انہیں کچھ کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔

عظمیٰ خان سحر..... لاہور

س ہینڈز اپ' ذوالقرنین رک جاؤ۔ آج تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ تم میری تحریریں ہضم کیوں کر جاتے ہو؟

ج پہلے یہ کھلونا گھر میں رکھ کر آؤ۔

بشریٰ بٹ..... گوجرانوالہ

س ۔ اس دفعہ آپ کے لیے پھندنے والی ٹوپی جس کی آپ نے ترکیب بتائی ہے۔ بنوا کر بھجوائیں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اگلی دفعہ اس ٹوپی کے ساتھ اپنی تصویر دیں' دیں گے نا؟

ج ۔ مجھے پھندنے والی ٹوپی کا شدت سے انتظار ہے۔ کیونکہ اسے پہننے کے امیدوار بھی اب بہت ہیں۔

حمیرا طارق..... بہاولپور

س ۔ کیا آپ نے اتنی بڑی بڑی مونچھیں بچوں کے جھولا جھولنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں؟

ج ۔ تم اگر اپنے بچوں کو اسی طرح خوش کرنا چاہتی ہو تو مونچھیں حاضر ہیں۔

ثمینہ یاسمین جعفری..... کبیر والا

س ۔ نین بھائی! ساری زندگی آپ پہاڑ کھودتے رہیں اور آخر میں مریل سا چوہا نکل آئے تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے؟

ج ۔ کچھ نہیں' اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ کچھ نکلا تو سہی شیریں نہ سہی پر عزت تو بنی رہی۔

کشور سلطانہ..... سیالکوٹ

س بھیا جی' سارے سوالوں کے جواب آپ خود ہی دیتے ہیں یا کوئی سیکرٹری وغیرہ ہے؟ اگر نہیں تو ہمیں حکم دیں۔

ج سیکرٹری کے لیے حکم تو دے دیں مگر پھر والد صاحب کا خوف۔

☆ ☆

ثمو افتخار۔۔۔ڈھوک کشمیریاں

جون کا کرن اچھا تھا اور ہنستی مسکراتی ماڈل اچھی لگی۔ سب سے پہلے بے چینی سے "دردل" تک پہنچے مگر ناول پڑھنے کے بعد سارا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ یہ کیا نبیلہ جی آپ نے زری کو دل آور سے جدا کر دیا اس سے پتا چلتا ہے کہ خاموش محبت ہار جاتی ہے۔ پلیز پلیز کسی بھی طریقے سے دل آور سے ملا دیں۔ ہم صرف ان دونوں کریکٹرز کی وجہ سے اسٹوری پڑھتی ہیں اور آپ نے اس کہانی میں علیزے کو دل آور سے ملا کر سارا مزا خراب کر دیا۔ پلیز زری کو نبیل سے نہیں ملانا۔

اس کے بعد بات کرتے ہیں فوزیہ جی کے ناول کی' بات ہی الگ ہے اس کہانی میں خرم نے ثمل سے منگنی توڑ کر اچھا نہیں کیا پہلے ہی آپ نے خرم کی وجہ سے عظمت خلیل کی نظروں میں ثمل کو مشکوک کیا۔ مگر پھر بھی ہمیں امید ہے آپ ان کو ملا دیں گی۔ اب بات کرتے ہیں مکمل ناول کی' میرے ہمنوا کو خبر کرو' بہت زبردست ناول لکھا ہے فاخرہ گل نے ہمیں بہت اچھا لگا۔ باقی افسانے اور ناولٹ بھی تقریباً" سب ہی اچھے لگے۔ مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ اشعار کا انتخاب بہت اچھا لگا۔

عائشہ خان۔۔۔ٹنڈو محمد خان

تمام کرن اسٹاف اور مدیرہ آپی..... کیسے ہیں آپ سب لوگ شکریہ کہ آپ سب ہمارے لیے ان تھک محنت سے ہر مہینے ایک خوب صورت پرچہ ترتیب دیتے ہیں.....

ٹائٹل اچھا لگا..... معصوم سی ماڈل پیاری لگ رہی ہے ..... سب سے پہلے حمد و نعت پڑھیں..... نامے میرے نام میں اپنا خط شامل دیکھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ سب سے اچھا خط شمع مسکان جام پور کا لگا۔

آواز کی دنیا سے فرحت علی اچھی لگیں' صنم جنگ کا انٹرویو بہت پسند آیا تھا میری فیورٹ ہے صنم جنگ اس کے علاوہ اس دفعہ کے انٹرویو بھی اچھے لگے۔ رسالہ لیٹ ملنے کی وجہ سے تفصیلی تبصرہ ممکن نہیں۔

افسانوں میں امایہ خان کا۔۔۔ ہی پڑھا ہے صرف..... بہت خوب صورت تحریر ہے امایہ خان کی..... اس طرح کی تحریریں..... اس معاشرے میں بہت مددگار ثابت ہوں گی ..... ویلڈن امایہ خان آنیہ کا فیصلہ پسند آیا۔

اس دفعہ کئی قاری بہنوں نے دوستی کی پیشکش کی ہے۔ ہاہاہا میں بھی یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ مجھ سے بھی کوئی قاری بہن دوستی کرے گی؟ ویسے میں نامے میرے نام میں تمام بہنوں کے خط بہت غور سے پڑھتی ہوں..... دست کوزہ گر کی بڑی زبردست قسط رہی۔

اب بات ہو جائے عنیقہ محمد بیگ کا مکمل ناول "خواب جلی آنکھیں" .....

بہت پیاری تحریر ہے۔۔۔ مگر میں کچھ جگہ پر غلطیاں پوائنٹ آوٹ کروں گی جیسے کہ کرن کی اماں کا بات بے بات 100 اور پانچ سو 500 کے نوٹ دینا..... اتنی مہنگائی کے دور میں ایسا کب ہوتا ہے۔ جب کہ کوئی کمانے والا بھی نہ ہو اس سے کہانی میں ہلکا پن آگیا اور جیسے کہ سعد نے کرن کی آنکھوں کی رپورٹ لندن بھی بھیج دی' اتنی جلدی! اور ارسلان نے 60 ہزار کی انگوٹھی بیشا کو گفٹ دی..... جب کہ ارسلان خود اتنا مالی طور پر مستحکم نہیں کہانی حقیقت سے قریب ہونی چاہیے ویسے کہانی اچھی لگی..... ارسلان بڑا خود غرض نکلا' وہ کرن جیسی مخلص لڑکی کے لائق ہی نہیں تھا۔ عنیقہ محمد بیگ کے افسانے ہمیشہ مجھے پسند آتے ہیں۔ امید کرتی ہوں عنیقہ کو میری تنقید سے دکھ نہیں ہو گا۔۔۔ ان شاء اللہ۔

"دردل پڑھا" بہت اچھی قسط تھی دل چاہ رہا تھا پڑھتی جاؤں مگر وہی باقی آئندہ خیر اگلے ماہ ۔۔۔۔ پڑھیں گے۔

انٹرویوز تینوں اچھے لگے۔

"بلا عنوان" عائشہ نصیر مجھے پہلے ہی ہلکا سا شک ہوا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ دیوار از میر اپنی بھابی انیقہ کو شادی سے پہلے پسند کرتا ہے اور اس کی شادی بڑے بھائی سے ہو گئی اور میرا شک درست نکلا ویسے اینڈ تھوڑا ٹھیک نہیں لگا کچھ نامکمل سا لگا کرن کتاب ابھی پڑھی نہیں۔ لہ۔۔۔۔ اچھی ہی ہو گی۔

فوزیہ ثمر کو پڑھ کر حیرت ہوئی لو جی ہم تو ہانیہ عمران کو 15 16 سال کی بچی سمجھتے تھے۔ بھئی ہمیشہ مستقل سلسلوں میں نام پڑھتی ہوں تو میں یہ سمجھی۔۔۔ خیر ہنسی تو بہت آئی خود پر۔ صدف ریحان گیلانی کا ماں جی پڑھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھے میری امی یاد آگئیں ان کے انتقال کو 6 ماہ ہو گئے مگر اب بھی وہ روح فرسا منظر آنکھوں میں گھومتا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ امی کا دم نکلتے وقت میں اور میری خالہ ان کے سرہانے تھے۔ اور کلمہ اور سورۃ یاسین پڑھ رہے تھے۔ مجھے تو ثمرین حبیب اور صدف ریحان کی طرح لفظ لکھنے بھی نہیں آتے کہ میں اپنا دکھ بیان کروں۔ صائمہ امتیاز ساہی کو پڑھا باتیں اچھی لگیں۔

اور یہ کہ حنا یاسمین اور نفیسہ۔ سعید کی امی کا سن کر بہت دکھ ہوا اللہ صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

تمام ریڈر اینڈ رائٹر بہنوں کو سلام پیار۔

طاہرہ شوکت۔۔۔۔ رحیم یار خان

اس دفعہ کرن حسب معمول 15 کو ملا سب سے پہلے سرورق دیکھا جو کہ کچھ خاص نہیں تھا حمد اور نعت کے بعد سیدھی "دست کوزہ گر" پر پہنچی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ اس میں خرم نے اچھا نہیں کیا اسے ثمل کو اپنے دل کا حال بتانا چاہیے تھا۔ پھر "دردل" پڑھا جو کہ معمول کے مطابق تھا باقی ابھی نہیں پڑھا میرے فرسٹ ایئر کے پیپر ہو رہے ہیں باقی بعد میں پڑھوں گی۔ میرا اور کرن کا بہت پرانا رشتہ ہے۔ میں کسی بھی رسالے میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے خوش آمدید کہیں گے اور مایوس نہیں کریں گے اور اگر موقع ملا تو پھر لکھوں گی ان شاء اللہ۔

نفیسہ سعید اور حنا یاسمین کی والدہ کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) اور کرن کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے اور کرن اپنی کرنیں یونہی بکھیرتا رہے۔ (آمین)

نشا نورین۔۔۔ بوہالہ جھنڈا سنگھ

15 کو تازہ شمارہ ملا جیسے ہی تو جلدی سے خط لکھنے بیٹھ گئے کیونکہ جون میں کوئی بھی تحریر میری پڑھنے کو نہ ملی جس کا مطلب آپ کو میرا خط لیٹ ملا ہو گا۔ کوئی بھی تحریر نہیں پڑھی ابھی ثمر نادیہ امین کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

"وہ ایک پری ہے" ریحانہ امجد کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے مگر یار اس کی رفتار تیز کریں افسانے اپنی جگہ اچھے ہی ہوں گے۔

"دردل" ناول اپنی جگہ اے ون ہے مگر آپی اب اس کا اینڈ جلدی کر دیں آپی اک دو فرمائشیں ہیں پلیز قبول کریں ایک یہ ہے "آواز دے کہاں ہے" سلسلہ دوبارہ شروع کریں باقی دوسرے سلسلے چاہے ختم کر دیں۔

دوسری فرمائش پلیز پلیز آپی خطوں کے جواب بھی دیا کریں کیوں کہ آپ کے دو الفاظ پیار سے لکھنے سے ہمارا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ جاتے جاتے ریحانہ آفتاب مریم عزیز فرحت اشفاق پلیز ہمارے لیے مکمل ناول لے کر آئیں۔ ایک انجم نواب ہوا کرتی تھیں کسی زمانے میں بہت پیارا لکھا کرتی تھیں اگر آپ پڑھ رہی ہیں تو کیا خیال ہے پھر لے آئیں کوئی ناول۔

میرا خط لازمی شامل کریں ورنہ (ورنہ کیا کچھ بھی نہیں)

آفرین اصغر..... شجاع آباد

امید ہے کہ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے تو صدف سلیمان صاحبہ کی بات کا جواب دوں گی کیونکہ مصروفیت کی بنا پر مئی کے اور جون کے شمارے میں شرکت نہ کر سکی اس لیے صدف جی آپ کی بات کا میرے پاس بس اتنا جواب ہے کہ میں دل آور شاہ کے کردار کو نا پسند نہیں کرتی لیکن پسند کرنے کی بھی مجھے کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی اور جہاں تک علیزے کا تعلق ہے تو آپ نے کہا تھا کہ وہ اس پہ ظلم کر کے بے چینی کا شکار ہے تو جناب اب کیا فائدہ اس بے چینی کا۔ علیزے کی عزت' اس کا مقام تو واپس نہیں آسکتا۔ اس کی فیملی اور پیرنٹس جن کرائسس کا شکار ہیں وہ سب حالات دل آور شاہ کی بدولت ہی ہیں اور اس سب کے باوجود بھی وہ مزید انتقام کے

موڈ میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی کے ساتھ اتنا ظلم بھی کافی ہوتا ہے۔ اور اب بھی یہ شادی بتول شاہ کی وجہ سے طے ہوئی ہے ویسے ہمیں بتول شاہ کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ جون کے مہینے کا ٹائٹل اچھا تھا۔ ڈریس اور میک اپ تو متاثر کن تھا مگر ماڈل بذات خود کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں شگرے جناب "دست کوزہ گر" میں بھی مسٹر care's who کو بھی کسی کی care کا خیال آیا۔ مگر نجانے یہ بات نمل کو کب سمجھ آئے گی۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" کی پہلی قسط کچھ خاص متاثر نہ کر سکی سو میں نے ابھی تک دوسری قسط پڑھنے کی زحمت نہیں کی "حنا یاسمین" نے بہت اچھے پوائنٹس آؤٹ کیے اپنے افسانے میں "تخت اور تختہ" میں رفاقت جاوید نے اچھی کوشش کی مگر مجھے کہیں کہیں مکالمات اور الفاظ کی کمی لگی اور کہیں یہ زیادتی۔ ویسے آج کل واقعی اچھی ماؤں اور اچھی بیویوں کی بہت کمی ہے۔

اور جناب کرن کا دستر خوان دیکھ کر تو دل اش اش کر اٹھا کیونکہ ہمارے کام کی کوئی چیز بھی اس میں نہ تھی

ہمارے گھر میں تو سبزیاں شاذونادر ہی پکتی ہیں تو جی رائتہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نامے میرے نام میں سب بہنوں کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آخر میں سب سے درخواست پلیز مجھے بھی اپنی دعاؤں میں شامل رکھا کریں۔

فوزیہ ثمر بٹ عطیبہ عمران۔۔۔ گجرات

جون کا شمارہ 17 کی شام کو ملا۔ کیونکہ اب تو اک عادت ہی بنالی ہے کرن نے لیٹ ہونے کی۔ اسی لیے اب ہم بھی کچھ کچھ (سیانے) ہو گئے۔ 16 تا 17 تک کرن کا انتظار شروع کرتے ہیں۔ دو دن سے ہمارے یہاں موسم بہت ہی ٹھنڈا ٹھنڈا اور سہانا ہو رہا ہے۔

شاید موسم سہانے کا کمال تھا۔ سرورق بھی بہت زبردست لگا۔ بے اختیار منہ سے واہ نکلا۔ ماڈل کی غرور سے تنی گردن ذہانت سے چمکتی آنکھیں اور ڈریس کلر کامبی نیشن سب کچھ زبردست تھا۔

حسب عادت سکون اور دلچسپی سے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ پڑھیں آپ یقین کیجیے گا جو سرور، جو سکون مجھے نعت شریف سن کر اور پڑھ کر آتا ہے میں

لفظوں میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتی انٹرویو میں عدیل حسین سے ملاقات اچھی رہی۔ مجھے حسین نام سے عقیدت کی حد تک پیار ہے۔ "میری بھی سنیے" فائزہ حسن سپرہٹ اداکارہ ہیں۔ بڑی کمال کی اداکاری کی ہے ڈرامہ نیلو فر میں انہوں نے "مقابل ہے آئینہ" صائمہ امتیاز کی باتوں سے لگا کافی کانفیڈینٹ لڑکی ہے اپنوں کے لیے ہر حد سے گزرنے والی۔

"ماں جی" صدف جی کے ابتدائی پیرا گراف نے تو رلا ہی دیا۔ ماں کی شان لفظوں میں کہاں بیان ہو سکتی۔ کرن ہی کی پیاری رائٹر کا ایک پیارا جملہ۔

ماں وہ تختی ہے جس پہ اولاد کچھ بھی لکھ سکتی ہے۔ مگر ماں صرف اور صرف محبت ہی لکھتی ہے۔ اللہ پاک میری ماں سمیت سب کی ماؤں کو صحت مند زندگی عطا فرمائے (آمین)

اس بار سب سے پہلے مکمل ناول "سودا" پڑھا۔ اف کتنی دردناک تحریر تھی۔ سمیرا حمید کے اس ناول کو میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ ہر سطر ورطہ حیرت میں ڈال رہی تھی ہر کردار بے بسی بے کسی کی عبرت ناک مثال ۔۔۔ کہیں نوری اور جاوید پہ بے تحاشا غصہ آتا تھا اور کہیں پہ رشید عرف چاند کی عجیب خواہش پہ آتا تھا۔ کیسے کیسے لوگوں سے متعارف کروایا ہے رائٹر نے کہانی کہاں دو نفس کے ماروں سے شروع ہوئی اور کتنوں کی زندگیاں لپیٹ میں آتی گئیں۔ نوری اور جاوید وہ سپنولیے تھے جو خود ہی اپنے بچوں کو کھا جاتے ہیں۔ یقین کیجیے اس تحریر کی جادوگری نے جکڑے رکھا۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں امین کے لیے کچھ کر سکتی۔ نوری اور جاوید کی کیسی محبت تھی خود کو رسوا بھی کیا اور دوزخ بھی خریدی سچ کہا ہے رائٹر نے اس کہانی کا اختتام ہو نہیں سکتا۔ جب تک انسان نفس کا غلام ہے شیطان کا غلام ہے۔

دوسرا ناول "درد عشق" بھی سپرہٹ تھا۔ مجھے نادیہ جی آپ کا انداز تحریر اچھا لگتا ہے۔ اس بار آپ نے مرد اور عورت دونوں کو مظلوم دکھایا ہے۔ ویسے مجھے سکندر کا رونا اچھا لگا تھا۔ جب وہ عجوہ کی منتیں کر رہا تھا۔ ایک کو تڑپا رہا اور دوسری کے لیے خود ترستا رہا۔ اچھا ہے نامرد بنا سکندر کا بہت بہت شکریہ نادیہ جی اچھی تحریر لکھنے کا اور آئندہ بھی پلیز جلدی جلدی حاضری لگوایا کریں نا۔ فاخرہ گل کا

"میرے ہمنوا" اس بار تحریر اچھی رہی ندرت کے ساتھ اچھا نہیں کیا میران نے۔ شاہ زین پر ۔۔۔ بڑا ترس آیا۔ یہ آزمائش صرف اچھے لوگوں کا مقدر ہی کیوں ہوتی ہے تیسری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ توبہ ندرت کی بھابھی کتنی چاپلوس کتنی ہے اور اس کے بہن بھائی بھی ندرت کو چھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ گھر والے اگر آزادی دیتے ہیں تو اعتبار کا اختیار بھی دیا کریں نا۔ ناولٹ میں "تخت اور تختہ" اچھی رہی جس میں کردار کمال اچھا تھا۔ کمال کا ہر بات پہ بڑے کھلا مسکراہٹ بکھیرتا رہا۔ حمنہ نے بھی کچھ کم نہیں کیا کمال کے ساتھ۔ سچ کہتے ہیں حرام کی کمائی اپنا اثر تو ضرور چھوڑتی ہے نا۔۔۔۔ ہر عمل کا اک رد عمل ہوتا ہے اور حمنہ کے عمل کا رد عمل اس کے بیٹے کی نشے سے موت، اس کے گھر کی بے برکتی تھی۔ سبق آموز تحریر تھی جو حاصل کرنا چاہے تو۔

افسانے اس بار سب ہی اچھے تھے۔ "بدلتی ہوائیں" ان لڑکیوں کے ایک نصیحت تھی جو سسرال میں گھریلو ماحول خراب کر دیتی ہیں۔ دیورانی جٹھانی کی جملوں کی بمباری مزے دار تھی۔ انسان کو ظرف کا پیالہ چھلکنے نہیں دینا چاہیے۔ ورنہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کی خوشیوں کو پھیکا کر دیتی ہیں۔

"بلا عنوان" عائشہ کی تحریر۔ کافی پرانا موضوع تھا۔ مستقل سلسلے اس بار اچھے تھے اور صفحات بھی زیادہ تھے۔ شاعری اپنی ہی اچھی لگی ارم کمال کا میچنگ ویری فنی تھا۔ کرن کا دستر خوان بوندی رائتہ کی سمجھ نہیں آئی۔ بوندی کس شے کا نام ہے۔ حسن و صحت جی جناب گھریلو ٹوٹکے یہ کافی روز آزمائی ہوتی رہتی ہے جب شازی سسرال سے آتی ہے تو بیوٹی پارلر کھل جاتا ہے۔

اس بار کرن کتاب اچھی تھی موسم کے رنگ میری امی جی کو سرورق ماڈل کا ڈریس بہت اچھا لگا تھا کہتی ہیں تم بھی ایسا لے لینا کیا آپ کرن کتاب میں کچھ ایسا نہیں بتا سکتے کہ پرانی گھریلو چیزوں سے گھر کو ڈیکوریٹ کرنا ۔۔۔ اور اب نامے میرے نام جی جناب وہ ویسے تو میں سرسری سا پہلے دیکھ چکی ہوں۔ پہلی بار خود کا لکھا اچھا لگا ویسے یہ سارا کمال تو مدیرہ کو جاتا ہے۔ جو اتنی جی داری سے میرے خط کو پڑھتی ہیں۔

امبر گل یار میرے پاس تو ریحانہ جی کا نمبر ہی نہیں تو کال کیسے کروں گی تمہیں۔

خوش رہیں اور ہمیں بھی خوش رہنے کی دعائیں دیں اجازت۔

شمع مسکان۔۔۔ جام پور

شمع مسکان کی طرف سے سب کو آمد رمضان مبارک ہو۔

15 جون سورج آسمان پہ چھائی جگہ جگہ سیاہ بدلیوں کے درمیان آنکھ مچولی کھیلتا کچھ خاص بھلا معلوم نہ ہوا۔ چار سو چلتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی طبیعت پر چھائی اضطراب کی کثافت کو کم نہ کر سکے۔ مگر جونہی ایک بجے کے قریب کرن نے اپنی جھلک دکھائی تو پھر کہاں اضطراب، بے چینی سب اڑنچھو ہو گئیں۔ ٹائٹل گرل کچھ خاص متاثر نہ کر سکی سب سے پہلے حمد و نعت پڑھیں اور پھر فہرست پہ نظر کی۔ مدیرہ جی کا اداریہ پڑھا "نامے میرے نام" میں سب سے پہلے اپنا نام جگمگاتا دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

قسط وار ناولز میں سب سے پہلے "در دل" پڑھا پوری اسٹوری کے دوران ہم بھی دل آور شاہ کے غم میں برابر کے شریک رہے۔ قسط بہت اچھی تھی مگر دکھ بہت ہوا پڑھ کر۔

"دست کوزہ گر" میں خرم کی منگنی ختم کرنے کی وجہ نمل کی دوستیں تو سمجھ گئیں مگر نمل نہیں مگر شاید وہ سمجھ کر بھی نا سمجھ بن رہی ہے۔ ابھی مزید بے وقوفیاں جو کرنی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ فوزیہ جی انہیں دور تو نہیں کریں گی رومیلہ اور الیان کا کپل تو بہت اچھا ہے۔ اب انتظار میں ہیں کہ شگفتہ غفار انہیں اکٹھا کھڑے دیکھ کر وہ بھی اس پوزیشن میں جب رومیلہ کا ہاتھ الیان کے ہاتھ میں ہے تو کیا گل فشانی کریں گی۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" میں ندرت اور شاہ زین کے ساتھ بہت برا ہوا۔ کتنا مان بھروسہ اعتماد تھا ندرت کو خود سے وابستہ رشتوں پر جان نچھاور کرنے والے بہن بھائی، محبت کرنے والی بھابھی، بھابھی نے مکاری سے کیسی چال چلی کہ اس کے مان، اعتماد و اعتبار کی دھجیاں بکھرتی چلی گئیں۔ اخبار میں چھپی جھوٹی افواہ پر جب اپنوں نے یقین کر کے اس کی ذات کو خاک کے ذروں کی طرح بکھیر کر رکھ دیا مگر وہ اپنے والدین کے پر شفقت سائے میں خود کو کمپوز کرنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے والد کا سایہ بھی اس کے سر سے اٹھا لیا۔ ابھی تو وہ اسی دکھ پر ماتم کناں ہے نہیں

جانتی کہ ابھی ایک اور قیامت اس کی منتظر ہے۔ پلیز فاخرہ جی زین سے ندرت کو دور مت کریں۔ داد دیتی ہوں شاہ زین کے حوصلے کو۔۔۔ اسے اس کا صلہ ملنا چاہیے میران شاہ کے لیے تو کڑی سے کڑی سزا منتخب کرنا۔ مہا نور کی کہانی کچھ انوکھی نہیں۔ مگر پھر بھی افسوس ہوتا ہے ملکانی پروہ باپ نہیں ماں ہیں۔ وہ تو کم از کم اپنی بیٹی کی فیلنگز کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ فاخرہ اس ناول کو زیادہ طویل نہ کرنا۔ (پلیز)

اب بات کروں گی "درد عشق" کی تو نادیہ امین نے عام سی اسٹوری کو اپنے ساحرانہ الفاظ سے بہت خاص بنا دیا۔ بالکل میرے اردگرد لوگوں میں چلنے والی اسٹوری۔ بد فطرت ' بدکردار مرد سب عورتوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ضوبار یہ بے شک مبتلائے عشق تھی مگر اپنے لیے نہیں اپنی اولاد کے لیے ہی آواز بلند کرلیتی جس پر ایک محبت بھری نگاہ بھی اس نے نہ ڈالی۔ بجوہ کا کردار تو بہت پسند آیا۔ ایسے مردوں کے ساتھ ایسا ہی بننا چاہیے۔ آخری بجوہ نے اسے سدھار کر ہی دم لیا۔ پہلے اپنی اہمیت جتلائی پھر اپنا حق پھر بچوں کا حق دلایا اور آخر میں سکندر کو بھی مبتلائے عشق کرکے اپنی محبت اسے سونپ دی۔ بہت خوب صورت تحریر تھی یہ نادیہ امین کی۔

"سودا" سمیرا حمید نے نئے والدین سے متعارف کروایا۔ یہ والدین کی کون سی قسم ہے جو اپنے نفس کی تسکین دولت کی ہوس میں اپنے بچوں کا سودا کرتے چلے گئے۔ بہت بے چینی بھر دی اس اسٹوری نے ہمارے اندر بہت سبق آموز تحریر تھی۔ نوری کو تو اس کے کیے کی سزا ملی تھی۔ پچھتاوں کے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔ وہ بچوں کے لیے تڑپ رہی تھی۔ مگر جاوید کو سزا کیوں نہ دی۔ بے شک خدا اس کو خود سزا دے گا۔ مگر دنیا میں اسے ذلیل ہونا چاہیے تھا۔ اس نے تو دوسری شادی کرلی نوری کی کوئی پروا نہیں۔

ناولٹ "وہ اک پری ہے" کی یہ قسط بھی زبردست تھی۔ پتا نہیں یہ اذان شاہ اور فاروق ملک کا کیا چکر ہے۔ بیچ میں ماہم! آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔ "تخت اور تختہ" بھی رفاقت جاوید کی اچھی تحریر تھی۔ حنیفہ نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو کامیاب بھی ہو گئی۔ اولاد ماں باپ کا بہت اثر لیتی ہیں۔ جو بات گھر میں رہ کر حنیفہ نہ جان سکی وہ اس کے بچے اپنے بابا کی سرگرمی دیکھتے رہے۔ پھر جیسا دیکھا ویسا تو کرنا ہی تھا۔ کم عمری کچے ذہن نئے جذبے نئی امنگیں۔ جو والدین گھر پر توجہ نہ دیں بچوں کا خیال نہ رکھیں وہ بعد میں پچھتاتے ہیں جب اولاد ہاتھ سے نکل جائے۔ جیسے حنیفہ اور بعد میں علی۔ نوکروں کی نگہداشت میں پلنے والے بچے کیسی تربیت پائیں گے ایسی ہی جیسے حنیفہ کے بچوں نے پائی۔

افسانوں میں اس ماہ تقریباً" سارے ہی افسانے لاجواب تھے۔ "محبت اور خواب" بہت پیارا افسانہ تھا۔ یہی کہانی پڑھی تو بہت بار جا چکی ہے۔ مگر ہر رائٹر کے انداز میں الگ مزا ہوتا ہے "اے محبت" بھی اچھی تحریر تھی۔ وہی روایتی ساس کی کہانی۔ "بدلتی ہوائیں" ایک سبق آموز تحریر تھی۔ علم ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ میرا اس بات پر یقین کامل ہے جسے حنا یاسمین نے اور بھی اچھا کر دیا۔ حمنہ ایک کاہل اور کام چور عورت تھی۔ اس نے چالاکی سے سب کو اپنا گرویدہ کرلیا تعلیم کے جھانسے میں مگر کھرے اور کھوٹے کی پہچان تو ایک دن سب کو ہو ہی جاتی ہے۔ مہوش نے اپنی خدمت گزاری سے آخر سب کو جیت ہی لیا۔

انٹرویوز میں عدیل حسین سے ملاقات اچھی رہی۔ بہت محتاط جوابات دیے عدیل صاحب نے "میری بھی سنیے" بھئی فائزہ حسن کی پکار پر اس کی بھی سنی مگر کچھ خاص نہ لگیں تو آگے چل دیے۔

"مقابل ہے آئینہ" میں صائمہ امتیاز کے جوابات انٹرسٹنگ لگے مگر اف یو ڈونٹ مائینڈ آپ کے انٹرویو میں کہیں کہیں خود پسندی کی انتہا تھی۔ اشعار میں مجھے امبر گل 'کہکشاں' ہانیہ عمران کے اشعار بیسٹ لگے۔ فوزیہ جی ہانیہ عمران آپ کی دو سالہ بھتیجی ہے جان کر حیرت بھی ہوئی اور اچھا بھی بہت لگا۔ میری طرف سے ہانیہ کے گالوں پر چٹا چٹ ڈھیر سارا پیار کر دینا۔ ننھی پری کے لیے ڈھیر سارا پیار۔

"یادوں کے دریچوں سے" میں مجھے خالدہ بشیرہ اور سدرہ وزیر کا انتخاب اچھا لگا۔ "مسکراتی کرنیں" میں صبا جیلانی (ٹنڈو الہ یار) پڑھا۔ "نام میرے نام" میں امبر گل کا تبصرہ اچھا لگا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔

☼ ☼